

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

تسکین الحناں

مخزن کنز الایمان

اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خان رحمتہ اللہ علیہ ترجمہ کتابی بزرگ

تالیف: عید الرزاق بھٹراوی حطاروی
مدرس جامعہ ضیاء العلوم راولپنڈی

مکتبہ ضیاء

بہار بازار راولپنڈی

اِنْتِساب

سعدۃ المحققین استاذ العلماء استاذی المکرم حضرت
علامہ مولانا محمد اشرف صاحب سیالوی شیخ الحدیث سیال شریف
کے نام جنکی محنت و محبت اور روحانی توجہ کی وجہ سے ہی میں
نے تالیف کا یہ کام مکمل کیا، آپکی توجہ کے بغیر میرے لئے یہ
مرحلہ طے کرنا ناممکن تھا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکی اس مشفقانہ توجہ کو
میرے لیے رہنما بناتے رکھے اور آپکا سایہ تادیر قائم رکھے۔

نام کتاب _____ تسکین الجنان فی محاسن کثر الایمان
مصنف _____ مولانا عبدالرزاق چشتی بھترالوی
کتابت _____ محمد اسلم، محمد حیات ڈوگر، شاہ محمد چشتی، قصو
فون - ۳۱۳۴
صفحات _____
تعداد اول _____ ۱۱۰۰ (۹۸۴ء ۱۳۰۴ھ)
ناشر _____ مکتبہ ضیائیہ۔ راولپنڈی
ہریہ _____

پسِ خاطر

♦ استاذ العلماء حضرت علامہ غلام محی الدین شاہ صاحب

(مفت مدظلہ شیخ الحدیث جامعہ رضویہ راولپنڈی)

♦ مولانا حسین الدین شاہ صاحب نائب شیخ الحدیث جامعہ رضویہ راولپنڈی۔

♦ مولانا محمد یعقوب ہزاروی صدر مدرس جامعہ رضویہ راولپنڈی۔

♦ مولانا عبدالرشید صاحب قریشی مدرس جامعہ رضویہ راولپنڈی۔

♦ مولانا ابوالفضل اللہ روتہ صاحب سیالوی بجا بڑا ضلع سرگودھا۔

♦ مولانا گل احمد صاحب جامعہ نعمانیہ لاہور۔

♦ مولانا شاہ محمد چشتی سیالوی خوشنویس قصور۔

ان تمام حضرات کیلئے میرے دل میں انتہائی

احترام کے جذبات موجود ہیں کہ انہوں نے مجھے مشوروں سے نوازا۔

اظہارِ تشکر

مغزیم حافظ مولانا محمد اختر صاحب گجراتی ٹرانسکریپ

ادا کرتا ہوں جنہوں نے ادراق میں بکھرے ہوئے مضامین

کو جمع کرنے میں میری معاونت کی۔ اللہ تعالیٰ ان کے

علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔

مولانا غلام سرور صاحب امام مسجد بربکاتیہ لاہور۔

جنہوں نے طباعت میں امداد فرمائی ان کا بھی شکریہ گزار ہوں۔

اللہ تعالیٰ انکو جزا بخیر عطا فرمائے۔

استاذ العلماء حضرت علامہ مولانا محمد گل احمد عقیقی شیخ الحدیث دارالعلوم نعمانیہ لاہور

تقریظ

امام اہل سنت حضرت علامہ مفتی شاہ احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، اپنے بیگانے سمجھی آپ کے علمی کمال کے معترف ہیں، آپ کا ترجمہ قرآن آپ کے علم و فضل کا شاہد عدل اور روشن تہذیبی ہے گا ہے تفاسیر کے کئی صفحات پر پھیلے ہوئے مضامین کو آپ ایک جملہ میں نہیں بلکہ ایک لفظ میں سمجھ کر رکھ دیتے ہیں گویا کہ آپ کا ترجمہ قرآن دنیا اندر جباب یا سمندر کو گور سے میں بند کر دینے کا مصداق اتم ہے فاضل اجل حضرت علامہ مولانا محمد عبدالرزاق چشتی مدرس جامعہ رضویہ ضیاء العلوم سٹارٹ ٹاؤن نے آیات کثیرہ کے تراجم کے ساتھ ان تفسیری مضامین کو بھی بیان فرمادیا ہے جس سے تراجم کو چار چاند لگ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ فاضل کی عمر دیر نہ فرمائے اور انہیں دین متین کی مزید توفیق عنایت فرمائے اور لوگوں کو ان کی کادشوں سے بہرہ مند ہونے اور استفادہ کی توفیق بخشے۔ اللہم یردد فی دجاہ سید المرسلین

محمد گل احمد عقیقی

شیخ الحدیث دارالعلوم نعمانیہ لاہور

استاذ الفضل انانازی المکرم علامہ عبدالحکیم شرف قادری شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

تقریظ نگاہ اوسین

کچھ کتابیں بہترین راہنما اور بہترین ساتھی کی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ کتابیں ہلکا سا بھاری اور بربادی کا سامان ہوتی ہیں غرضیکہ کتاب کی اثر آفرینی سے انکار نہیں کیا جاسکتا، انسانی تاریخ میں آج تک کتنی کتابیں لکھی گئیں، کوئی محقق انکا شمار نہیں کر سکتا، لیکن یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ سب سے اعلیٰ سب سے زیادہ مکمل اور لافانی کتاب صرف اور صرف قرآن پاک ہے جو تخیل و تبدل سے محفوظ اور بی نفع انسان کے لئے پیام حیات ہے، پیام امن ہے، صراطِ مستقیم ہے اور انسانی زندگی کے ہر گوشے میں راہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

قرآن پاک کتاب ثواب بھی ہے اور کتاب انقلاب بھی، نبی اکرم، ہادی عظیم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قرآن پاک کی بنیاد پر جو انقلاب بھی بپا کیا، تاریخ اس کی نظیر پیش کر نہیں سکتی، وہ قوم جو ہر اعتبار سے پستی کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق تھی اسے محقر ترین عرصے میں عظمتوں کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا کہ اس وقت کی دوسرے بادشاہوں میں روم و ایران ان کے سامنے سرنگوں ہو گئیں، یہ وہ عظیم انقلاب ہے جس نے غیر مسلم دانشوروں کو محو حیرت کیا ہوا ہے اور وہ اس گہنی کو سلجھانے سے عاجز نظر آتے ہیں اسکے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی موجودہ حالت زار پر غور کریں تو سر باز نہ دے سکتے تھک جاتے ہیں، کہاں وہ شاندار عروج اور کہاں یہ افسوس ناک زوال؟ — وہ بظاہر ہے بقول شاعر

وہ معجزہ تھے زمانے میں مسلمان ہو کر

اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

آج کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہم قرآن و حدیث پڑھیں، سمجھیں اور ان پر عمل کریں، اصولی طور پر یہ ہونا تو یہ چاہیے کہ ہم علوم دینیہ اور عربی زبان میں اتنی مہارت حاصل کریں کہ قرآن و حدیث کا عربی زبان میں مطالعہ کر سکیں اور ان کے مطالبہ مفہم تک ساری حاصل کریں مگر اگر

جبکہ ہم علوم دینیہ سے کمزور ہیں اور عربی زبان سے بالکل ناواقف، ایسے حالات میں ہماری یہی خوش نصیبی ہے کہ ہم تراجم کے ذریعے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب مکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احکام و تعلیمات جاننے کی کوشش کریں۔

اردو زبان میں قرآن پاک کے بہت سے ترجمے کئے گئے ہیں اور بار بار میں دستیاب بھی ہیں لیکن ترجمہ کرنے کیلئے عربی لغت اور گرامر سے واقف ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ بارگاہ الوہیت اور دربار رسالت کا ادب و احترام، معصیت انبیاء کا لحاظ، ناسخ و منسوخ، شان نزول سے واقفیت، بظاہر اختلاف رکھنے والی آیات کے درمیان تطبیق، عقائد اہل سنت، تفسیر صحابہ و تابعین اور تفسیر سلف صالحین پر گہری نظر اور عبور ہونا بھی ضروری ہے، امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کو اللہ تعالیٰ نے تقریباً پچاس علوم و فنون میں بے مثال مہارت، وسیع مطالعہ اور حیرت انگیز حافظہ عطا فرمایا تھا انہوں نے قرآن پاک کا ترجمہ کر کے عاصمہ المسلمین پر بہت بڑا احسان فرمایا، بلاشبہ ان کا ترجمہ تمام خوبیوں کا حامل اور قرآن پاک کا بہترین ترجمہ ہے ان کے ترجمہ قرآن کی بے پناہ مقبولیت نے مخالفین کو سرسیمہ کر دیا ہے چنانچہ کئی کتابچے اور پمفلٹ اس ترجمہ کے خلاف دیکھنے میں آچکے ہیں، ایسے ہی ایک پمفلٹ کے شبہات کا ازالہ کرنے کے لیے فاضل نوجوان مولانا علامہ عبدالرزاق زبیر مجاہد نے پیش نظر کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں انہوں نے عالم اسلام کے مسلم مغربی کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ کا ترجمہ ہی صحیح ترجمہ ہے مولانا عبدالرزاق زبیر علامہ ضیاء العلوم جامعہ رضویہ، سبزی منڈی، راولپنڈی کے مدرس ہیں اور علمی ذوق سے سرشار ہیں، ان کی یہ پہلی تحریری کوشش ہے جو لائق تہنیت و تحسین ہے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ تصنیف و تالیف کے میدان میں انہیں مزید کام کرنے کی توفیق نصیب ہو اور ہمارے نوجوان علماء کو بھی قلم و قریطاس کی اہمیت کا شعور عطا ہو۔

محمد عبدالحکیم شرف قادری

جامعہ نظامیہ رضویہ، لاہور

ابتدائے سخن

جب کائنات عالم پر انخطاط کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ علم و دانش کے چراغ بجھے ہوئے تھے بلکہ عقل و خود کا نام و نشان ایک تنکے کی طرح ہوا کی زد میں آنے کی وجہ سے مٹ چکا تھا سو چنے سمجھنے کی قوتیں مفقود ہو چکی تھیں خلوص و ایمان داری کو چشمِ حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ عیاری و مکاری کی عزت افزائی ہوتی۔ ڈاکہ زنی، سود خواری کو طرہ امتیاز بنا لیا گیا تھا۔ بدکرداری، شراب نوشی کو رواج جاں سمجھا جاتا تھا۔ اپنوں، بیگانوں میں تمیز کی صلاحیتیں مفقود ہو چکی تھیں۔ زہر کو تریاق سمجھ کر بڑے شوق سے نوش کیا جاتا اور تریاق کو زہر سمجھ کر پائے حقارت سے ٹھکرا دیا جاتا۔ غرضیکہ سلامتی کی گشتیاں طوفان میں گھر چکی تھیں۔ بے رحم موجیں اقوام عالم خصوصاً اقوام عرب کے سفینوں کو دھکیل دھکیل کر گرداب کے حوالے کر رہی تھیں۔

ان طوفانوں سے بچہ آزمائی کرنے کی فکر سے بے نیاز، اپنے مستقبل کو درخشاں کرنے سے چشم پوشی، اپنی غلطیوں اور لغزشوں کا ازالہ کرنے کے بجائے شب و روز ان میں مصروف رہنے میں اتر آتا اور جو زلزلے ان کے اذہان و افکار کی دنیا کے فلک بوس ایوان کو پیوند خاک کر دے تھے ان کی غارتگریوں اور فتنہ سامانیوں سے بچنے کی کوئی تدبیر نہ کرتا ان کی رگ و جان میں سرایت کر چکا تھا۔ ایسے حالات میں جبکہ اخلاق اور شائستگی کا تصور کہیں خال خال نظر آتا، جانرونا جائزہ، حسن اخلاق و بد اخلاق میں اکثریت کو کوئی تمیز نہ تھی۔ شرم و حیا کا بھی جنازہ نکل چکا تھا۔ کعبہ شریف کا برہنہ طواف کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔

ایسے حالات میں یکایک ایک مہنتی کا ورود ہوتا ہے جو مشفق و مہربان، مہربانی، مہربانی اور ہمہ تن صفات حسینہ اور اخلاق حمیدہ سے متصف، جنہوں نے ایک عظیم مدبر و مفکر کی حیثیت سے ریگستانِ عرب کی بکھری ہوئی قوم کو اخوت و محبت، ایمان و ایقان کی وحدت کی سیلک میں پرو دیا۔ جنگ جو، جاہل، غیر متقدم، غیر مہذب، ناشائستہ سرکش اور ہمیشہ پس میں گرنے والوں کو ایک مذہب، ایک تہذیب، تمدن اور ایک ہی نظام و قانون کے تابع بنا دیا۔ اسلام کا پرچم اہل ایمان و سکون، محبت و پیار کا سبق دیا تاکہ اس سرزمین پر بسنے والے اپنی صلاحیتوں کو نیکی اور اصلاحی سرگرمیوں میں صرف کر سکیں تاکہ عداوت، حسد، منافرت، مجادلہ، مقابلہ کے شعلے ان کے خرمین عاقبت کو جلا کر خاکستر نہ کر دیں۔ ایک محبوب حقیقی کا تصور دیا۔ روزِ محشر کے محاسبہ کا خوف دلایا۔ اعمال کے محرکات و عوامل سے ان کو خوب آگاہ کیا۔ اپنے اخلاقِ نیک سے ان میں انقلاب برپا کیا۔ اپنی فصیح و بلیغ کلام، شیریں اور مسحور کن زبان سے ان کے دلوں کی حقیقت کو یکسر بدل دیا۔

آپ سرزمینِ عرب کے ایک مہذب خاندان کے فرد ہونے کے ناطے، بنو سعد کی فضاؤں میں پروردہ ہونے کی وجہ سے فصیح ترین زبان سے آراستہ و پیراستہ تھے تشبیہات و تمثیل، خطابت کا عجیب انداز اور ایسا اسلوب جس کی لطافتوں سے متاثر ہوتے بغیر اہل عرب بھی نہیں رہ سکتے تھے، انھیں بھی برملا کہتے ہوئے پایا گیا کہ ایک ہی مقام پر پرورش پانے کے باوجود آپ کی زبان لطافتوں سے مزین کیوں ان کا جواب ان الفاظ میں دیا جاتا ہے: ان اللہ عزوجل ادبہ

فا حسن ادبی و نشأت رفیعی بنی سعد بن بکر "بیشک میری لسانی فصاحت اللہ عزوجل کی عطا کردہ ہے۔ اسی نے میرے ذوقِ ادب کو خوب تر بنایا ہے۔ میری نشوونما بنو سعد کی فصیح و بلیغ فضاؤں میں ہوئی۔"

جو امح الکلم آپ کا عجیب خاص تھا یعنی مختصر ترین کلمات جو معانی کی بہت بڑی وسعتوں کے حامل ہیں۔ آپ کے اجزائے کلام جو گوہرِ نایاب جو اہرِ درخشندہ محض

گہرائی کی وجہ سے دلوں پر تاثیر کرنے کے لحاظ سے مثال نہیں رکھتے۔ آپ کی کلام جو نیم سحر کی طرح سہانی، آبِ جو کی طرح سرودت سے بہرہ، تیغِ برق کی طرح درخشاں بھتی ہی لیکن وحی کی کلامِ مبین نے حسنِ گفتار کو اور بھی منور کر دیا تھا۔ آپ کی زبان بے مثال سے حیرت انگیز کلام میں کرا قوامِ عرب متحیرہ گئیں۔ اس کی شدتِ تاثیر سے آپ کے دشمن بھی ڈرتے تھے کہ کہیں دل میں نہ اتر جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زورِ بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام عالمِ عرب کے شعراء، خطباء، ادبا کو ایک دفعہ نہیں بار بار چیلنج دیا کہ تمام مل کر اس جیسی ایک پھوٹی سی شورت بنا کر لاؤ۔ لیکن مقابلہ کی طاقت نہ رکھنے وجہ سے انھوں نے سنی آن سنی کر دی۔ آج وہی فصحاء و بلغاءِ مفاہیہ سے عاجز ہو کر سر جھکا کر نظر آتے ہیں جو ایک طرح مصرع پر طویل قصائد لکھا کرتے دوسروں کی بچوں میں اشعار کے انبار رکھا دیتے کسی کی مدح و توصیف میں فصاحت کے چمکدار موتیوں کو ایک سیلک میں جمع کرتے نظر آتے لیکن سیدِ دو عالم کے سامنے انگشتِ بدندان اور زبان پر مہرِ سکوت ہے۔

تیرے آگے لیے بے فصاحتے عرب کے بڑے بڑے کہے کہ مخف میں زباں نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

میدانِ فصاحت میں کوئی شہسوارِ سبقت نہیں حاصل کر سکتا۔ بلاغت کی بلند منازل کی چوٹیوں کو کوئی گوہرِ پیامبر نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اس ذاتِ باری تعالیٰ کا کلام ہے جس کی توصیف میں سعدی رحمۃ اللہ علیہ جیسے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں

برتر از خیال و قیاس و گمان و دہم

اسی وجہ سے معانی و بیان و بدیع کے جمیع ضوابط کا حامل ہے۔ استعارات، مجاز، مرسل، حذف و ایصال جیسی بیشمار صورتیں مذکور ہیں جن کا ایک ساتھ لحاظ کرنا اسی کو زیب دیتا ہے جو جمیع نقائص و عیوب سے پاک ہو۔ سہو و تسلیان۔ علم کی قلت و کثرت سے متصف ذوات کو ان کا مد نظر رکھنا ممکن نہیں۔ ان استعارات

تمائیل سے آہستہ کو کھولنے کے لیے اور انتہائی مختصر مضامین جو غیر محدود معانی و مطالب کو متضمن تھے ان کی وضاحت کے لیے اور اس کلام کے لطائف و معانی بیان کرنے کے لیے کہیں علامہ فخر الدین رازی جو تحقیق و تدقیق میں غوطہ زن ہو کر ہوا ہر نکالنے نظر آتے ہیں کہیں علامہ سید محمود آلوسی علم و عرفان کے موتیوں کو جمع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہیں قاضی ثناء اللہ معرفت کے باغات سے پھول چھینتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے ہی جلال الدین سیوطی اور جلال الدین محلی راہ حق سے بھٹکنے والوں کو انحصار و حقائق و لطائف سے آگاہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں علامہ ابوالبرکات نسفی معارف و حقائق کے بیان کے ساتھ ساتھ فقہی استنباط کرتے ہوئے ممتاز نظر آتے ہیں۔

ہر دور میں محققین کلام الہی کے اسرار و رموز کو اپنی اپنی علمی استعداد کے مطابق بیان کرنے میں کوشاں رہے مختلف زبانوں میں قرآن پاک کے معانی و مطالب کو بیان کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ اردو زبان میں کئی تراجم معرض وجود میں آئے لیکن جب ان تراجم کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو یقیناً ایک سہنی کا ترجمہ انفرادی حیثیت میں آپ کے سامنے جلوہ گر ہوگا۔

وہ سہنی مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی ہے جس کی فراست ایمانی نے ہندو مسلم اتحاد کی قبا حقائق کا سب سے پہلے اندازہ لگایا جس نے کسی کی پرواہ کئے بغیر گاندھی اور اس کے مکار چیلوں کے دام قریب کو قبل از وقت ناڑتے ہوئے مسلمانوں کو بانگ دہل لگا کر اے مجاہد مصطفیٰ، خبردار ہندو کے دام صید میں نہ پھنس جانا۔ وہ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر پھنسی نکل جائے گا۔ تمہیں نیست و نابود کر دے گا اور یا ہندو نہ طرز زندگی گنہگار نے پر مجبور کر دیگا۔ اس مرد درویش کو سیاسی بصیرت بالغ نظری کے ساتھ ساتھ ایمانی فراست اور علمی وسعت کا بھی ایک عظیم تر مقام حاصل تھا عقل و غرور کے ساتھ دین و ایمان سے بھی بہرہ ور تھا جس کا ذہن و ضمیر قلم و زبان سبھی محبت مصطفیٰ میں غرق تھے جس کے سوز ایمانی اور حریت دینی نے

جمود و خود کی چٹانوں کو ریزہ ریزہ کر دیا جو اسلام کی عظمت کا متمنی، اسلام سے دلی وابستگی اور اسلام کی سر بلندی کی کوشش میں اپنے آپ کو وقف کئے ہوئے تھا۔ وہ جس کے عقائد، اعمال، صوت، سیرت، رفتار، گفتار، نشست و برخاست، خورد و نوش سب میں محبت مصطفیٰ کی جھلک نظر آتی ہے علمی بصیرت کا یہ حال ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام علوم پر حاوی۔

آپ کے ترجمہ قرآن پاک کو دیکھ کر پتا تو دیا کہ کہا جاسکتا ہے کہ تجھ پر رحمت کائنات کی خاص نظر اور خالق کائنات کا تجھ پر کرم ہے۔ ترجمہ میں مفسرین کے اقوال کو نظر میں رکھنا۔ راجح مروج کا لحاظ کرنا، مجاز و استعارات کو ترجمہ میں سمجھنا مثلاً بہات کا ترجمہ اس طرح کرنا کہ ان کی حیثیت پر قرار ہے یقیناً یہ احسان مالک ملک ہے ممکن ہے کسی مسخ شدہ ذہن والے آدمی کے نزدیک یہ علمی کمالات کے مراتب کی بے بہا قدیں کوئی اہمیت نہ رکھتی ہوں لیکن خدا را ابھڑ کے ہوئے جذبات کی رُو میں بہتے ہوئے تحالف کے احساس کے زیر اثر کوئی فیصلہ نہ کریں بلکہ ان سے باندھ ہو کر عدل و انصاف سے غور کریں۔ بے شک آپ جذبہ عقیدت نظر محبت کو بالائے طاق رکھ دیں لیکن حقیقت کا دامن تو کسی کے کہنے اور ملتے سازی سے نہ چھوڑیں۔ آج کل زندگی محض سہنگامہ آرائی سے عبارت ہے غور و فکر کی رسم یکسر ختم ہو چکی ہے۔ اپنے حرفیوں پر الزام تراشی، بہتان بازی، غزلے و رُج بن چکی ہے سنگین الزام عائد کرنے میں ذرا بھر احتیاط نہیں کیا جاتا بلکہ دشنام طرازیں عروج پر ہیں۔ ان پیہم لغزشوں سے لرزہ بر اندام ہونے کی بجائے ان کو علم کا منہ لگے کمال سمجھا جاتا ہے۔ کاش اگر غور و فکر سے کام لیا جاتا اور اگر فقط تحقیق و تدقیق میں اختلاف کیا جاتا تو وہی اختلاف باعث رحمت بنتا لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ایسے اعتراضات سے قوم کو فکری انتشار کے گردابوں میں غلطاں و پچاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جو حقائق سے دور ہوں بلکہ ان اعتراضات کے انکشافات بطنیانی کے بے رحم پھیلے بن کر ان

کی بزم نشا ط کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

آئیے! چند ایسی مثالیں دیکھیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ ایسا سلوک کیا گیا ہے جیسے کوئی کینہ پرور شخص اپنے بدترین دشمن سے کرتا ہے لیکن اپنے گریبان میں جھانکنے کی کوشش نہیں کرتا۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ پر اعتراض اس طرح کیا جاتا ہے :- انا انزلنا الیک الكتاب بالحق

پ ۵ سورۃ نسا آیت نمبر ۱۰۵

اس آیت میں ”اے محبوب!“ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں لیکن افسوس یہ نہیں خیال کیا گیا کہ یہ الیک میں ”ک“ ضمیر کا مرجع بتایا گیا ہے کہ اس کا مرجع نبی کریم کی ذات پاک ہے۔ محترضین کے اپنے اکابر کے تراجم میں اس طرح کی زیادتیاں سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔

چند مثالیں بطور نمونہ مولینا محمود الحسن کے ترجمہ سے پیش کی جا رہی ہیں۔ وہ چند بھی صرف پارہ اول سے ملاحظہ ہوں :-

و علم ادم الاسماء کلھا ثم عرضہم علی الملائکۃ

”اور سکھا دیئے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا ان سب چیزوں کو فرشتوں کے“

یہاں لفظ ”اللہ“ اور ”سب چیزوں“ اور ”پھر سب چیزوں“ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

ان سبہم باسمائہم

”بتا دے ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام“

فرشتوں اور چیزوں ————— کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

فتاب علیہ ”پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر“

اللہ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

واشر بواخی قلوبہم العجل

”پلائی گئی اُن کے دلوں میں محبت اس بچھڑے کی“

محبت کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

بعما قدمت ایدہم

”بلسبب ان گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں ان کے ہاتھ“

گناہوں، اور بھیج چکے عربی لفظ کا ترجمہ نہیں کیونکہ ”قدمت“ کا لغوی معنی ”بھیج چکے“ نہیں۔

اَمْ تُشْرِكُونَ

”کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو؟“

مسلمان، کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔

طوالت کے پیش نظر چند مثالیں پرکتفا کیا جاتا ہے ورنہ دیگر تراجم سے اور اسی ترجمہ سے سینکڑوں مثالیں پیش کرنا کوئی مشکل نہیں۔ پھر لفظ محبوب پر ہی اعتراض کیوں؟ جبکہ حبیب پاک علیہ التحیۃ والثناء کو محبوب کہنا اور محبوب جانا خود ارشاد مصطفیٰ ہے : لایومن احدکم حتیٰ اکون احب الیہ

من والدیہ وولدہ والناس اجمعین ”کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک مجھے اپنے والد اور تمام لوگوں سے محبوب نہ سمجھے“

① مقامات حریری کی ابتدا میں مولینا محمد ادریس کاندھلوی کے نبی کریم کے اسمائے گرامی پر مشتمل اشعار اور ان کا ان پر حاشیہ مکتبۃ اشرافیہ لاہور کو بھیجی نکالنے کا سبب کہیں ایسا ہی اضطراب تو درپیش نہیں آیا؟ جب کہ ملک سر لاج دین کی طباعت میں مولانا کے اشعار اور ان پر حاشیہ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے استدلالات مذکور

ہیں جو حبیب پاک کی مدح میں ایک اہم مقام کے حامل ہیں۔ اسی

اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو قصائی زبان سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ اس میں فصاحت و بلاغت نہیں لیکن تقابلی جائزہ سے معاملہ دگرگوں نظر آتا ہے۔

وكان من الكافرين

• اور تھا وہ کافروں میں کا۔ (مولانا محمود الحسن)۔

• اور وہ کافر ہو گیا (اعلیٰ حضرت)۔

ثم بعثناكم من بعد موتكم

• پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے (مولانا محمود الحسن)۔

• پھر مرے پیچھے ہم نے تمہیں زندہ کیا (اعلیٰ حضرت)۔

وكل انسان طائر في عنقه

• اور جو آدمی ہے لگا دی ہم نے اس کی بڑی قسمت اس کی گردن سے (محمود الحسن)

• اور ہر انسان کی قسمت اس کی گردن سے لگا دی ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

واجتنوا الطغوت

• اور بچو بڑونگے سے (محمود الحسن)۔

• اور شیطان سے بچو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

مذکورہ بالا چند مثالیں صرف بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ان سے ہر ذی شعور انسان فصاحت و بلاغت کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ کس ترجمہ میں فصیح زبان کو پیش کیا گیا ہے۔ ایسی عظیم المرتبت ہستی بردشام طرازیوں کا سلسلہ اس انداز پر پیش کیا جاتا ہے کہ بلاشبہ ان کا کیوں کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ کیسی عالم کی تحریر نہیں بلکہ بدترین جاہل کا کلام ہے کیونکہ اگر یہی علم ہے تو جہالت کسے کہا جاتا ہے؟ اعلیٰ حضرت کو جو کمال لیاں دی گئیں ان کی دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں جو لغویوں کی ذہنیت کا اندازہ لگایا جائے کہ کس طرح پست ذہن رکھنے والے ہیں :-

① برصغیر پاک و ہند کے مبتدع اعظم و فتنہ تکفیر کے بانی مولانا احمد رضا خاں

② مذکورہ ترجمہ و تفسیر اسی فرقہ ضالہ کے پیشوا مولانا احمد رضا خاں بریلوی او

اس کے خلیفہ مفتی نعیم الدین مراد آبادی کی خامہ فرسائی کا نتیجہ ہے۔

③ مولانا بریلوی کے ترجمہ قرآن پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا انسان

مسلمانوں کا رہنمایا عالم اور اہلسنت کا امام تو کیا، ایمان ہی کے نور سے

خالی ہے۔

اگرچہ ایسی نازیبا عبارات ہمارے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ اسی طرح کا جواب دیا جاتا لیکن پھر بھی اخلاق و سنجیدگی کا دامن تھامتے ہوئے فقط اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے محاسن و کمالات تفسیر کے آئینہ میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ جہاں دیگر مترجمین کی کشتیاں تلاطم امواج میں چکولے کھاتی نظر آتی ہیں وہاں محب رسول کی وسعت علم اور دقت نظر جیسے مضبوط و قوی ناخدا کے سہارے کشتی صحیح و سلامت کنارے پر لنگر انداز نظر آتی ہے۔

ابھی تو تحقیق کے ابتدائی مراحل ہیں جس طرح تحقیق کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا، اہل علم کی تحقیق و تدقیق سے انشاء اللہ تعالیٰ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے حسن و جمال میں اور نکھار آئے گا

عبدالرزاق

تقریظ

اتحاد المتحقین اتنا فدی المکرم حضرت علامہ ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی صابو صابو
شیخ الحدیث دارالعلوم ضیاء شمس الاسلام سیال شریف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ يَا رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

محترم مکرم برادر عزیز حضرت مولانا محمد عبدالرزاق صاحب زیدت فواضد
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ مزاج شریف بہ خیریت موجود و خیریت مطلوب مکتوب
گرامی ملایا و آوری کا شکریہ۔ جناب نے بہت متحن قدم اٹھایا ہے اور جیسے کہ چند
مقامات کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے آپ نے خوب معتدل انداز اور مہذب پیرائے
میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی موزونیت اور معنوی عظمت ثابت کی ہے۔ ہونا تو یہ تھا
تھا کہ دوسرے حضرات کے متعلق انصاف اور دیانت سے کام لیتے اور اس ترجمہ
سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کے تراجم درست کر لیتے اور آپ کی ذات
سراپا کمال کی علمی فوقیت برتری کا اعتراف کرتے مگر براہِ حسد اور تعصب کا کہ وہ
کمال جن کو بھی نقصان اور قبیح بنا دکھاتا ہے اور براہِ ہوسند و عناد کا کہ وہ حق کے اعتراف
تسلیم کی طرف کبھی بھی مائل نہیں ہونے دیتا۔ بندہ نے متعدد مقامات تراجم کا تقابلی جائزہ
لیا تو یوں معلوم ہوا کہ ایک طرف ماہر اور تجربہ کار احباب فن کا ترجمہ ہے اور دوسری طرف
طلباء کا مشقی انداز میں ترجمہ جس میں قواعد و ضوابط اور اصولوں کی طرف ذرا بھرتوجہ نہیں
دی گئی بلکہ عظمتِ خداوندی اور عظمتِ رسالت کے متعلق غلط فہمیاں پیدا تو کی ہیں
مگر مکمل غلط فہمیوں کو دور کر دینی معمولی کوشش کر دینی زحمت بھی گوارا نہیں فرمائی جبکہ
اعلیٰ حضرت نے ہر ایسے مقام پر مفسرین کرام کی تفاسیر کا حاصل اور نچوڑ ترجمہ میں پیش
کر کے حق تعظیم بھی ادا کیا ہے اور عوام اہل اسلام کے ایمان کا تحفظ بھی فرمایا جزاء اللہ
احسن الجزاء اللہ تعالیٰ انجناب کی اس محنت اور سعی جلیل کو بطفیل حبیب مکرم و جسد
مقربان بارگاہ ناز شرف قبولیت بخشے اور موجب انصاف دیانت بنائے۔ آمین السلام
احقر محمد اشرف

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ الْحَمْدُ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْغَفَّارِ وَالصَّلَاةُ
وَالسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ لَشَاهِدِ الْمُخْتَارِ وَعَلَى أَصْحَابِهِ الْأَخْيَارِ وَعَلَى الَّذِينَ أَطَاعُوا

أَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ
اهدنا الصراط المستقيم

اللہ تعالیٰ صراطِ مستقیم پر ثابت رکھے۔ افراط و تفریط سے بچائے مقصد
کسی کی دلآزاری نہیں کسی پر کچھ اچھا کرنا کسی کو برا کرنا کسی کو گمراہ کرنا یا کسی کو باہل
کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے
ترجمہ کنز الایمان کے محاسن و کمالات بیان کرنے مقصود ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی بصیرت
اور علمی نکات پر رسانی اور تفاسیر کی آراء اور رائج اقوال سے باخبری پر مطلع کرنا
مطیع نظر ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ اعلیٰ حضرت نے جس طرح شان الوہیت اور
مقامات نبوت اور فضائل مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس کرتے ہوئے ترجمہ کیا
ہے یہ آپ کا ہی حصہ ہے بفضلہ تعالیٰ تفاسیر کی عبارات کو ساتھ پیش کیا جا رہا
ہے جن سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت کا عیاں ہونا مشکل نہیں۔ اگر کسی مقام پر
تفاسیر کے مختلف اقوال ہیں جن سے دوسرے تراجم پر بھی دلیل قائم کی جاسکتی ہو تو اس
کی نشان دہی بھی انشاء اللہ موجود ہوگی۔ کوشش یہی ہے کہ عبارت آسان ہو تاکہ
اس کا سمجھنا صرف اہل علم پر موقوف نہ رہے بلکہ عام آدمی بھی اس سے فائدہ حاصل
کر سکے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ اس کو پڑھ کر انصاف کیا جائے گا اور ایک عظیم
تریز شخصیت اور تحقیق و تدقیق میں ایک خاص مقام رکھنے والے بزرگ کی شان میں
کچھ اچھا کرنا بند کر دیا جائے گا۔ اگر تحقیقی طور پر کوئی اختلاف پیش کرے تو یہ اس کو

حق حاصل ہے لیکن بدزبانی اور طعن و تشنیع پر مبنی کلام اہل دانش کو زیب نہیں دیتی۔
اب قرآن پاک سے چند مقامات پیش کیے جا رہے ہیں جن سے اعلیٰ حضرت کے
ترجمہ کی برتری روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ترتیب وار پہلے پارہ سے سلسلہ کلام
کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق کہنے اور اس پر ثابت رہنے کی
توفیق عطا فرمائے اور میرے بچوں کو بھی اللہ تعالیٰ سخن مسک پر قائم و دائم رکھے!
وما توفیقی الا باللہ العظیم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

• شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے (مولانا محمود الحسن)۔

- شروع ساتھ نام اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والے مہربان کے۔ (شاہ فیض الدین)
- شروع اللہ نہایت رحم کرنے والے بار بار رحم کرنے والے کے نام (عبدالمجید)
- شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان اور نہایت رحم والے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)

- شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (شاہ عبد القادر)
- شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ (فتح محمد)
- اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

عربی قواعد کے مطابق

تراجم میں فرق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی | بسم اللہ الرحمن الرحیم طرف مستقر ہے جس کا تعلق کسی اسم یا فعل سے کیا جاتا ہے جس کو اپنی طرف سے اعتبار کرتا پڑتا ہے۔ اگرچہ کئی احتمال ہیں۔ اسم ہو یا فعل، خاص ہو یا عام، اول ہو یا آخر۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت

کے ترجمہ میں لفظ اللہ پہلے ہے اور شروع بعد میں لیکن دیگر تراجم میں شروع پہلے اور لفظ اللہ بعد میں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے پتا چلتا ہے کہ اس کا تعلق بعد سے ہے۔ اسی ترجمہ کی تائید مدارک سے ملتی ہے جو اس طرح ہے:-

تعلق الباء بمحذوف تقدیرہ بسم اللہ الرحمن الرحیم اقرا اوائلو
یہاں میں پڑھتا ہوں یا تلاوت کرتا ہوں بعد میں ہے۔ خود ہی مفسر اس کی وجہ بھی
بتاتے ہیں: وانما قدر المحذوف متأخر الان الاھم من الفعل والمتعلق بهما
المتعلق بهما وکانوا یبدون باسماء الھتم فیقولون باسم اللات واسم العزى
فوجب ان یقصد الموحّد معنی اختصاص اسم اللہ عن وجہ بالابتداء و
ذا بتقدیمہ والتخیر الفعل وانما قدم الفعل فی اقرا باسم ربك

لانہا اول سورة نزلت فی قول وكان الامر بالقراءة اھم كان
تقدیم الفعل اوقم: یہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ فعل کے مؤخر ہونے
کی وجہ یہ ہے کہ جس کا تعلق ہے فعل سے وہ بہ نسبت فعل کے زیادہ مقصود ہے کیونکہ
کافر اپنے کاموں کی ابتدا میں اپنے معبودانِ باطلہ کے نام لیا کرتے تھے "باسم اللات"
اور "باسم العزى" کہتے تھے۔ اس لیے مومن کے لائق بھی یہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے
اسم گرامی کو اول میں لائے۔ یہی اسی وقت ہوتا ہے جب کہ فعل مؤخر ہو اور اللہ کا اسم گرامی
مقدم۔ اب واضح ہوا کہ اسی نقطہ کے پیش نظر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں لفظ اللہ کو پہلے
لایا اور شروع بعد میں جس کا دیگر حضرات خیال نہ کر سکے۔

پھر ایک سوال ہوتا ہے کہ اقرا باسم ربك میں فعل پہلے کیوں ہے او
لفظ رب بعد میں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ سورۃ نزول میں اول ہے، اس
لیے کہ یہاں فعل قرأت اہم ہے لہذا اس کا پہلے ذکر کرنا ہی مناسب ہے۔ اسی وجہ
سے وہاں ترجمہ کرتے وقت پڑھ، پہلے آئے گا اور رب بعد میں۔ اسی طرح مختصر معانی

میں بھی ہے: ولہذا رای التقديم یفید الاختصاص والاهتمام بقدر الحدوث فی بسم اللہ مؤخر ای بسم اللہ افضل کذا البیض مع الاختصاص والاهتمام لان المشرکین کانوا یبدون باسم الہتم فیقولون باسم اللات وباسم العزى فقصدا لى موحدا تخصیص اسم اللہ بالابتداء للاهتمام والسرہ علیہم۔

مطلب یہ ہے کہ جب تقدیم طرف تخصیص و اہتمام پر دل ہے۔ اسی وجہ سے بسم اللہ میں محذوف مؤخر مانا جاتا ہے یعنی بسم اللہ افضل کذا کہا جاتا ہے تاکہ اختصاص و اہتمام کا فائدہ دے کیونکہ مشرکین اپنے معبودوں کے ناموں سے اپنے کاموں کی ابتدا کرتے تھے۔ کہتے تھے لات و عزى کے نام سے ہماری ابتدا ہے۔ مومن اللہ کے نام سے ابتدا کرتا ہے۔ کہتا ہے، اللہ ہی کے نام سے شروع۔ اس میں تخصیص بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ اللہ کے نام کو پہلے لانے میں اہتمام شان بھی اور کفار کا رد بھی۔ یہ مقصد اسی ترجمہ سے حاصل ہوتا ہے کہ کہا جائے "اللہ کے نام سے شروع"۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

• سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو پالنے والا سارے جہان کا۔ (مولانا محمد الحسن)
• سب تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے۔ (فتح محمد)
• سب تعریف واسطے اللہ تعالیٰ کے جو پروردگار عالموں کا۔ (شارفیع الدین)
• سب خوبیاں اللہ کو جو مالک ہے سارے جہان والوں کا۔ (اعلیٰ حضرت)
یہاں اعلیٰ حضرت نے رب کا معنی مالک کیا ہے اور دیگر حضرات نے پالنے والا معنی کیا ہے۔ اگرچہ رب مجتبیٰ مرتبی یعنی پرورش کرنے والا بھی استعمال ہوتا ہے لیکن یہ خاص ہے فقط پرورش کرنے ہی میں مستعمل ہے لیکن مالک عام ہے جو

اس کے ہر قسم کے تصرف کو شامل ہے۔ اسی ترجمہ کی تائید میں جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: رب العالمین ای مالک جمیع الخلق من الانس والجن و المملکة والدواب وہ تمام مخلوق کا مالک ہے۔ انسانوں، جنوں، فرشتوں، جانوروں وغیرہ کا۔ ناظرین کرام سے انصاف کی توقع ہے کہ کون سا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے! ان کے لیے سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں۔

اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ

• ہدایت ہم کو سیدھی راہ۔ (مولانا محمد الحسن)۔ بتلائیے ہم کو راستہ سیدھا۔ (مولانا شرف علی)
• ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ (مولانا مودودی)۔ دکھا ہم کو راہ سیدھی (شاہ فیح الدین)
• ہم کو سیدھا راستہ چلا۔ (اعلیٰ حضرت)

(۱) یہاں اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے کہ ہم کو سیدھا راستہ چلا اور دیگر ترجمین نے ترجمہ کیا ہے "سیدھی راہ بتلا"۔ راہ بتلا یا دکھا، یہ دعا کافی نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیب نے کفار کو بھی سیدھی راہ بتلائی ہے ہدی للناس سے یہ واضح ہے۔ بلکہ کامل دعا یہ ہے کہ اے اللہ ہمیں سیدھی راہ چلا یعنی اس پر ثابت وقائم رکھ تفسیر کمالین نے اس مقام پر لکھا ہے: والمستقیم المستوی والمراد بطریق الحق ومنعلة الاسلام واتباع القرآن یعنی مستقیم کا معنی سیدھا ہے اور مراد اس سے راہ حق ہے اور اسی کے ضمن میں دین اسلام اور اتباع قرآن ہے۔ اس کے آگے تحریر کرتے ہیں: فان قيل طلب الهداية من العون وهو المهدى تحصيل الحاصل قلنا المراد طلب الثبات عليه او حصول الملائمة المرتبة عليه والزيادة على الهدى الذى اعطوه یعنی اگر کوئی سوال کرے کہ یہاں مومن جو پہلے ہی ہدایت یافتہ ہے یعنی راہ دکھلایا چکا ہے وہ پھر کیسے ہدایت کو طلب کر رہا ہے۔ یہ تو

الحضرت کا ترجمہ واضح ہے ”وہ بلند کتاب“۔ بلند رتبہ کتاب یہ اشارہ بعید سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس پر تفسیر صاوی کی عبارت ملاحظہ ہو: ای هذا الما اشار بذكر الى ان حق الاشارة ان يؤتى بها للقريب وانما الى بما يدل على البعيد للتعظيم لكون القرآن مرفوعا الى مرتبة وعظيم القدر یعنی صاحب جلالین نے ہذا کا لفظ ذکر کر کے اشارہ کیا ہے کہ یہاں حق یہ تھا کہ اشارہ قریب ہوتا لیکن اشارہ بعید لایا تعظیم کے لیے اس لیے کہ قرآن پاک رفیع القدر ہے اور عظیم القدر ہے۔ یہ معنی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے۔ اس ضابطہ کو مختصر معانی میں بھی پیش کیا گیا ہے اور تعظیم بالبعد نحو البرزخ والکتاب تنزیلا لبعده درجته و رفعة محله منزلة بعد المسافة یعنی مندرجہ کو معرفت اشارہ بعید کے ساتھ لانے کا یہ فائدہ ہے۔ وہ بلندی رتبہ اور رفعت مقام پر ایسا ہی دال ہے جس طرح مسافت بعیدہ پر دال ہے۔ لاریب فیہ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے: ”کوئی شک کی جگہ نہیں“ لیکن باقی تراجم، اس میں کوئی شک نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔ دیگر تراجم سے یہ واضح نہیں کہ اس میں شک نہیں ہوتا چاہیے یا اس میں کسی نے شک کیا ہی نہیں بیضاوی کی تفسیر دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت واضح ہو جائے گی۔ بیضاوی کی عبارت یہ ہے: - لاریب فیہ: معناه انه لو ضوحوه وسطوعه برهانه بحیث لا یرتاب العاقل بعد النظر الصحيح بکونه وحیا بالغاحد الاحسان لا ان احدا لا یرتاب فیہ الا تری الى قولہ تعالیٰ وان کنتم فی سرب مما نن لنا علی عبدنا الایۃ یعنی قرآن پاک کے واضح ہونے کی وجہ سے اور روشن دلائل کے ہوتے ہوئے بعد از نظر صحیح عاقل اس کے وحی اور حد اعجاز تک پہنچنے میں شک نہیں کر سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی شک نہیں کرتا یا کسی نے کیا بھی نہیں حالانکہ قرآن پاک میں

حاصل شدہ چیز کا پھر سوال ہے۔ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہاں مراد اس ہدایت پر ثابت رہتا ہے اور جو مراتب اس پر مرتب ہیں ان کے حصول کی دعا ہے اور جو ہدایت اسے حاصل ہے اس سے اور زیادتی کا سوال ہے۔ یہ صورت انہی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ترجمہ ایسا کیا جائے جیسا اعلیٰ حضرت نے کیا ہے کہ اللہ اہم کو سیدھی راہ چلا یعنی ثابت رکھ تاکہ اور مدارج حاصل ہوں۔ صرف راہ دکھلانا یا بتلانا یہ کافی نہیں۔ یہ تو کفار کے لیے بھی ثابت ہے۔

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي كَتَبَ لَاحْمَرِّبِ فِيهِ

- یہ کتاب کہ کوئی شبہ اس میں نہیں۔ (عبدالماجد)
 - اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ (مولانا محمود الحسن)
 - یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔ (مولانا اشرف علی)
 - اس کتاب میں کچھ شک نہیں۔ (شاہ عبدالقادر)
 - یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ (مولانا مودودی)
 - یہ کتاب (قرآن مجید) اس میں کچھ شک نہیں۔ (فتح محمد)
 - یہ کتاب ہے کہ نہیں شک بیچ اس کے۔ (شاہ رفیع الدین)
 - وہ بلند رتبہ کتاب (قرآن) کوئی شک کی جگہ نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)
- اس مقام پر اشارہ بعید کا (ذاک) لگایا گیا ہے کہ قریب کا یعنی ہذا نہیں لایا۔ حالانکہ بظاہر ہذا ہی لانا چاہیے تھا جس کا معنی ہوتا ”اس“ لیکن مقام قریب میں جب اشارہ بعید لایا جائے وہ بلندی مرتبہ عظمت شان پر دال ہوتا ہے۔ اس ضابطہ پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی صحیح صادق آتا ہے دیگر تراجم اس پر صادق نہیں آ رہے کیونکہ

لوگوں نے شک کیا ہے جس پر وان کستم فی سبیب ممانزلنا علی عبد الہیہ
شاید ہے علامہ بیضاوی کی اس عبارت کی وضاحت میں شیخ زادہ کی عبارت یہ
ہے: جواب عما یقال کیف یصح نفی جنس الریب عندہم کثرة
المرتبیین وکثرة المراتب یستلزم کثرة الریب یعنی علامہ بیضاوی نے سوال کا
جواب دیا ہے کہ یہاں لافنی جنس تو جنس ریب کی نفی کر رہا ہے جو صحیح نہیں کیونکہ
مرتبیین (شک کرنے والے) تو کثیر ہیں اور کثرة مراتب میں کثرت ریب کو مستلزم ہے
یعنی زیادہ شک کرنے والوں کا ہونا شک کے زیادہ ہونے کو مستلزم ہے۔ علامہ
بیضاوی کا جواب اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے
کہ آپ نے اسی سوال و جواب کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ترجمہ کیا ہے، کوئی شک کی
جگہ نہیں۔ اس ترجمہ پر بعینہ شیخ زادہ کی عبارت دال ہے۔ شیخ زادہ میں ہے:

فظهر ان معنی نفی الریب عندہم کونہ محلا لمظنة لثبوتہ لا ان
احدا لا یسر تاب فیہ پس ظاہر ہوا کہ معنی یہ ہے کہ قرآن پاک
اشک کا محل (جگہ) نہیں۔ یہ معنی نہیں کہ کسی نے اس میں شک کیا بھی نہیں۔ اب
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت محتاج بیان نہیں۔

يُحْدِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا (۱)

چال بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں۔ (مولانا
اشرف علی)۔

• فریب دیتے ہیں اللہ کو اور ان لوگوں کو کہ ایمان لائے (شاہ رفیع الدین)

• دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے۔ (مولانا محمود الحسن)

• دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے۔ (شاہ عید القادر)

• وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں (مولانا مودودی)
• فریب دیا جاتے ہیں اللہ اور ایمان والوں کو۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ منافقین ظاہر ایمان
لاکر اور باطن کا فرہ کر اللہ تعالیٰ کو اور ایمان والوں کو اپنے خیال میں دھوکا دینا
چاہتے ہیں یعنی حقیقتہً وہ دھوکا نہیں دے سکتے لیکن باقی تراجم سے پتا چلتا ہے کہ
وہ اللہ سے دغا بازی کرتے ہیں یا چال بازی کرتے ہیں۔ اس طرح کے ترجمہ سے یہی
پتا چلتا ہے کہ وہ فی الواقع اس دغا بازی میں کامیاب ہیں حالانکہ یہ درست نہیں۔
تفسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی درست ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: وہی انہم
کیف خادعوا اللہ تعالیٰ فلقائل ان یقول ان یخادع اللہ تعالیٰ ممثنتہ من وجہین
الاول انہ تعالیٰ یعلم الصائر والسر فلا یجوز ان یخادع لہ الذی فعلہ لواظہر ان
الباطن بخلاف الظاہ لم یکن ذلك خلافا فاذا کان اللہ تعالیٰ لا یخفی علیہ البواطن لم یصح
ان یخادع والثانی ان المنافقین لم یعتقدوا ان اللہ بعث الرسول الیہم فلم یکن قصدہم فی
نفاقہم یخادع اللہ تعالیٰ فثبت انہ لا یمکن اجراء هذا اللفظ علی ظاہرہ
بل لابد من التاویل۔

یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا تو ممکن ہے۔ ایک وجہ تو
یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باتیں اور چھپی ہوئی کو جانتا ہے جب کہ منافق باطن کو
ظاہر سے پوشیدہ رکھ کر کیسے اللہ تعالیٰ سے دغا کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے
باطن کو چھپانا ممکن نہیں تو دغا کیسے ممکن ہے؟ دوسری وجہ یہ ہے کہ منافق
کا یہ عقیدہ ہی نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طرف مبعوث فرمایا
لہذا ان کا اپنے تفاق میں اللہ تعالیٰ سے دغا بازی کرنے کا اعتقاد ہی نہیں تھا پس
ثابت ہوا کہ اس لفظ کو ظاہر پر رکھنا ممکن نہیں بلکہ اس کی تاویل ضروری ہے اس

سے جواب میں دو تاویلیں پیش کی گئی ہیں۔ دوسرے تراجم کے مطابق کوئی تاویل بھی نہیں البتہ علحضرت کے ترجمہ کو ایک تاویل کے مطابق کرنا بھی صحیح ہے اور شان الوہیت کے مطابق ہے۔ وہ تاویل یہ ہے: **الذات ان یقال صوره لهم مع الله حيث یظهرون الایمان واهم کافرون صوره من یخادع** وہ اپنے ایمان کو ظاہر کرتے ہیں اور حقیقت میں وہ کافر ہیں۔ لہذا ان کا معاملہ اللہ سے ایسا ہے جس طرح دغا بازی کرنے والے کا ہوتا ہے یعنی وہ اپنے خیال میں دغا بازی کرتا چاہتے ہیں یہ نہیں کہ دغا بازی کرتے ہیں کیونکہ رب تعالیٰ سے دغا بازی ممکن ہی نہیں۔

اسی طرح اوسعود میں ہے: **ان الخدعة والحيلة والمکر واطهار خلاص الباطن فہی بمنزلة النفاق وھی مستحيلة فی حق الله تعالیٰ وصیفة المفاعلة تقتضی المشاركة فاشار الی جوابہ بما ذکرہ محصلہ انہا ہنہنا لیست علی بابہا وقولہ و ذکر اللہ جواب سوال اخر تقدیرہ کیف یخادع اللہ ای یحتال علیہ وھو یعلم الضمان فکیف قیل یخادعون اللہ فالجواب عندہ بما ذکرہ محصلہ ان الایۃ من قبیل الاستعارۃ التمثیلیۃ حیث شبہ حالہم فی معاملتہم اللہ بحال المخادع مع صاحبہ من حیث القبح یہاں دو قسم کے سوال وارد ہوتے ہیں۔ ایک سوال یہ وارد ہوتا ہے کہ بخادعون معنا دعت سے لیا گیا ہے۔ یہ باب مفاعلہ سے ہے۔ وہ ٹکرت جانہیں کو چاہتا ہے جس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی مکر، حیلہ، دغا بازی کرتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ لائق نہیں۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مخادع متراکت کے لیے استعمال نہیں بلکہ ایک ہی جانب سے استعمال ہے۔ پھر سوال ہوا کہ یہ کہنا بھی ممکن نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دغا بازی کرتے ہیں کیونکہ دغا باز تو اپنی چال بازیوں**

کو دوسرے سے مخفی رکھتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ تو اسرار اور مخفی اشیاء پر مطلع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں استعارہ تمثیلیہ ہے جس طرح دغا باز بُرائی کا ترکیب ہوتا ہے اسی طرح یہ اللہ تعالیٰ سے اپنے خیال سے اپنے معاملہ میں بُرائی کے ترکیب ہو رہے ہیں۔ آیات واضح ہے کہ دغا بازی حقیقت میں نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے خیال میں کرنا چاہتے تھے۔ لہذا علحضرت کے ترجمہ میں مغوی کا واضح ہونا مخفی نہ نہ رہا بلکہ روبرو کی طرح عیاں ہو گیا۔

اللہ یستہزی بھم ویمدھم فی طغیانہم یعمہون (پ ۶)

• اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔ (مولانا محمود الحسن)

• اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں بہکے ہوئے۔ (شاہ عہد القادر)

• اللہ ان سے مذاق کر رہا ہے وہ ان کی رسی دراز کیے جاتا ہے اور یہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکے جاتے ہیں۔ (مولانا مودودی)

• ان (منافقوں) سے خدا ہنسی کرتا ہے۔ (فتح محمد)

• اللہ ٹھٹھا کرتا ہے ان سے اور کھینچتا ہے ان کو بیچ سرکشی ان کی بہکتے ہیں۔ (شاہ رفیع الدین)

• انھیں اللہ نیارہا ہے۔ (عبد الماجد)

• اللہ ان سے استہزاء فرماتا (جیسا اس کی شان کے لائق ہے) اور انھیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔ (علحضرت)

اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے کہ اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے جیسا اس کی شان کے لائق ہے۔ یہ ہی معنی مناسب ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ

ہنسی، مذاق، ٹھٹھا نہیں کرتا۔ ان الفاظ کو اس کی طرف منسوب کرنا غلط ہے۔ اس پر مدارک کی عبارت ملاحظہ ہو :

اللہ یستہزیئ بہم ای یجازیہم علی استہزاءہم فہمی جزلہ
الاستہزاء باسمہ کقولہ تعالیٰ وجزاء سیتہ سیتہ مثلہما فن اعتدلی
علیکم فاعتدوا علیہمی جزاء السیتہ سیتہ وجزاء الاعتدال اعتدلا وان یکن الجزا سیتہ
واعتدوا وهذا لان الاستہزاء علی اللہ تعالیٰ لا یجوز من حیث الحقیقۃ لانه من باب المعبت و تعالیٰ عنہ
اللہ تعالیٰ کے استہزاء کا یہ مطلب ہے کہ وہ ان کو جزائے استہزاء دیتا ہے
جس طرح اللہ تعالیٰ نے یرائی کے بدلے کویرائی سے اور حد سے تجاوز کے بدلے کو
تجاوز سے تعبیر فرمایا حالانکہ فی الواقع وہ جزا بری یا تجاوز نہیں۔ اسی طرح یہاں بھی
استہزاء کے بدلے کو استہزاء سے تعبیر فرمایا گیا۔ (گویا یہی اس کی شان کے لائق ہے)
کیونکہ حقیقتاً ہنسی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف جائز نہیں کیونکہ ہنسی مذاق یہ ایک بے
فائدہ کھیل ہے۔ اللہ تعالیٰ بعثت، بے فائدہ کام کرنے سے بلند و بالا ہے۔ اسی طرح
وہ تم کو ترجمہ العظمت کا یہ ہے ان کو مہلت دیتا ہے۔ یہ تفسیر کے مطابق ہے جلالین
مدارک میں ویدہم کا معنی یدہم کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے ان کو مہلت دیتا
ہے۔ ایسے ہی یعمدون کا ترجمہ بھی العظمت کا ہی تفسیر کے مطابق ہے۔ کیونکہ
اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے بھٹکتے رہیں، چونکہ تفسیر میں یمنہ دون خیرا ترجمہ
کیا گیا ہے جس کا اردو میں مطلب بھٹکتے رہیں، زیادہ مناسب ہے۔ عبدالمجید کا ترجمہ
مہلت اور مراد دونوں کے مخالف استہزی کا ترجمہ بنا رہا ہے۔ غلط ہے۔

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (پ ۶)

اور نہ ہوئے وہ راہ پانے والے۔ (مولانا محمود الحسن)

اور نہ یہ ٹھیک طریقہ پر چلے۔ (مولانا اشرف علی) اور یہ ہرگز صحیح راستے پر
نہیں ہیں۔ (مولانا مودودی) اور نہ وہ ہدایت یاب ہی ہوئے۔ (فتح محمد) اور
نہ راہ پائے (شاہ عبد القادر) اور وہ سودے کی راہ جانتے ہی نہ تھے۔
(علحضرت) اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔ (شاہ رفیع الدین) اور نہ وہ
راہ یاب ہوئے۔ (عبدالمجید)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفسیر کے آئینہ میں دیکھیں فیض اللہ تعالیٰ صاف و شفاف
نظر آئے گا۔ مدارک میں ہے : و مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ لطريق التجارة وہ طریقہ تجارت
کی راہ نہیں جانتے تھے : جلالین میں ہے : و مَا كَانُوا مُهْتَدِينَ فیما فعلوا
اس پر حاشیہ میں ہے فیما فعلوا ای طریق التجارة مقصد اس کا بھی یہ
ہی ہے کہ وہ طریقہ تجارت کو نہیں جانتے تھے بیضاوی تشریف میں ہے :

وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ لطريق التجارة فان المقصود منها سلامة سرائلهم والربح
وهو لا عقدا صاعوا للطلبين لأن سرائلهم كان الفطرق السليمة والعقل
الصرف فلما اعتقدوا هذه الضلالت بطل استعدادهم واختل عقلهم ولم
يبق لهم سرائلهم مال يتوسلون به الى درك الحق ونيل الكمال
فبقوا خاسرين آيسين من الربح فاخذوا بالاصل -

یعنی وہ تجارت (سودے) کی راہ نہیں جانتے تھے۔ کیونکہ تجارت میں مقصد یہ
ہوتا ہے کہ اصلی سرمایہ محفوظ رہے اور نفع بھی حاصل ہو اور ان لوگوں نے دونوں
کو ضائع کر دیا کیونکہ اصل ان کا سرمایہ فطرت سلیمہ اور عقل خاص تھا لیکن عقائد باطلہ
کی وجہ سے ان کی استعداد باطل ہو گئی عقلوں میں فتور آ گیا اور ان کا اصل سرمایہ جو
حق کو پانے اور حصول کمالات کا ذریعہ تھا وہ ضائع ہو گیا پس اس طرح وہ اصل
مال کے ضائع کرنے کی وجہ سے خسارے میں ہوئے اور نفع سے محروم ہوئے۔

تفسیر بیضاوی کی وضاحت سے بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید حاصل ہوئی۔
 اسی طرح بیضاوی پر شیخ زادہ میں یہ ہے: فظہران من اشتري الضلالة بالهدى
 كما يلزم ان يكون خاسرا في تجاسرة یعنی جو شخص ہدایت کے
 بدلے گمراہی کو حاصل کرتا ہے وہ اپنی تجارت میں خسارے میں رہتا ہے: وما كان
 محتمدا من پر شیخ زادہ نے یہ تحریر کیا کہ ان المراد بعدم الاهتداء عدم
 اهتدائهم بطريق الهدى ان کے ہدایت نہ پانے سے مراد یہ ہے کہ وہ سودے کی راہ
 نہیں جانتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی واضح ہو گئی جو کہ معتبر تفسیر کے بحثوں
 کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ يَا

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 اور جب کہا پروردگار تیرے نے واسطے فرشتوں کے (شاہ رفیع الدین)۔
 جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو۔ (مولانا محمود الحسن)۔
 اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے (مولانا اشرف علی)
 اور (یاد کر) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں برکیٹ میں یاد کر لفظ زائد ہے جو دیگر تراجم میں
 نہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے جس کی طرف دیگر ترجمین نظر نہ کر سکے۔
 تفسیر جلالین میں ہے: وَإِذْ قَالَ مُحَمَّدٌ أَذْ قَالَهُ رَبُّكَ وَإِذْ يَدْعُو أَسْمَاءَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
 اس پر محشی لکھتے ہیں: (اشارہ الی ان اذ فی محل النصب وان العامل فیہا اذکر
 مقدس قال ابوالیقار فی تفسیر اذ قال هو مفعول یہ تقدیر اذکر اذ قال
 یعنی یہاں اشارہ ہے کہ اذ محل نصب میں ہے اور اس کا عامل اذکر مقرر

ہے۔ ابوالیقار نے اذ قال کی تفسیر میں کہا ہے کہ اذ قال مفعول یہ ہے اور تقدیر
 عبارت کی یہ ہے اذکر اذ قال اس کا لحاظ کرتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے یاد کر
 کے لفظ کو برکیٹ میں بڑھایا ہے۔ اسی طرح مدارک میں ہے اذ نصب باضمار
 اذکر یعنی اذ، اذکر کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔

إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ

مگر انہی پر جن کے دل پگھلے ہیں۔ جن کو خیال ہے۔ (شاہ عبدالقادر)
 مگر ان فرماں بردار بندوں کے لیے مشکل نہیں جو سمجھتے ہیں۔ (مولانا مودودی)
 مگر انہی عاجزوں پر جن کو خیال ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
 وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال کرتے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)
 مگر خشوع رکھنے والوں پر (نہیں) جنہیں اس کا خیال رہتا ہے کہ انہیں پروردگار
 سے ملنا (بھی) ہے۔ (عبدالماجد)۔
 مگر ان پر جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔
 اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے یظنون کا معنی یقین کیا ہے اور دیگر حضرات
 نے خیال اور سمجھنا۔ لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے مفسرین کرام نے
 بھی بمعنی یقین کے لیا ہے۔ مدارک میں ذکر کیا گیا ہے: وَخَسِرَ يَظُنُّونَ بَيِّنَتُونَ
 لِقَاءَ رَبِّهِمْ عَبْدُ اللَّهِ يَعْلَمُونَ أَيْ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ لَا بُدَّ مِنْ لِقَاءِ الْجَزَاءِ فَيَعْلَمُونَ
 عَلَى حَسَبِ ذَلِكَ وَأَمَّا مَنْ لَمْ يَوْفَ بِالْجَزَاءِ وَلَمْ يَرْجِ الثَّوَابَ كَانَتْ عَلَيْهِ
 مَشَقَّةٌ خَالِصَةٌ۔ چوں کہ یہاں مقصد بیان یہ ہے کہ نماز لوگوں
 پر مشققت ہے۔ وہ اسے گراں سمجھتے ہیں لیکن جن لوگوں کو یقین ہے کہ وہ اپنے رب
 سے ملاقات کرنے والے ہیں ان پر گراں نہیں۔ علامہ نسفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

یظنون کی تفسیر یقینوں سے کی گئی ہے اس لیے کہ حضرت عبداللہ کی قرأت میں یظنون آیا ہے معنی یہ ہے کہ وہ یقین کرتے ہیں کہ بے شک ضرور اللہ سے ملاقات ہوتی ہے اور ضرور جزا حاصل ہوتی ہے اور جس کو یہ یقین ہو اس کو یہ یقین کافی ہے وہ نماز کو گراں نہیں جانے کا لیکن جس کو یقین نہیں ہو گا جزا کا اس کو ثواب کی امید نہیں ہوگی۔ اس پر نماز خالص مشقت ہوگی۔

اسی طرح شیخ زادہ علی البیضاوی میں بیان کیا گیا ہے:- بیان لوجہ استعمال الظن بمعنی یقین مع ان الظن عوالات اعتقاد الراجح الذی یحتمل النقص والیقین عوالات اعتقاد الراجح الذی لا یحتمل النقص فانہما المائتساہما من حیث ان کل واحد منهما اعتقاد راجح صم ان یستعد کل واحد منهما للآخر بحسب اقتضاء المقام خاص تعیر لفظ الظن ہما بمعنی یقین

یہاں یہ وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے اس لیے کہ ظن کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقص کا احتمال رکھے یقین کہتے ہیں اعتقاد راجح کو جو نقص کا احتمال نہ رکھے۔ اس لیے دونوں میں اعتقاد راجح پایا گیا ہے لہذا یہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ہر دو کو ایک دوسرے کی جگہ مجازاً استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں ظن بمعنی یقین ہے۔ اسی طرح جلالین میں بھی یظنون کی تفسیر یقینوں سے کی گئی ہے اور پھر اس پر حاشیہ میں یہ ہے:- ان الظن ہما بمعنی یقین یعنی یہاں یہ اشارہ ہے کہ ظن بمعنی یقین ہے۔ اب تفاسیر کی عبارات دیکھنے سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت مخفی نہ رہی بلکہ خوبی واضح ہو گئی۔

اسی طرح فاشعین کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے "جو دل سے میری طرف جھکتے ہیں" یہ زیادہ واضح اور مناسب ہے یہ نسبت عاجز اور دل سے گھلے کے۔

عاجز اردو زبان میں مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ غریب، محتاج، بے دست و پا، کسی کام کو کرنے کی طاقت نہ رکھنا۔ ان تمام معانی پر لفظ عاجز کا اطلاق ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح دل سے پگھلنا غیر معروف ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ معروف ہے اور اس میں کسی اور معنی کا وہم نہیں اور تفسیر کے مطابق بھی۔ جلالین میں ہے: الساکنین الی الطاعة اور جمل میں ہے الساکنین ای مائلین اور معالم التنزیل میں ہے: فالخاشع ساکن الی طاعة اللہ ان تفاسیر کی عبارات کا مشترکہ مفہوم یہ ہی ہے کہ جو اللہ کی اطاعت کی طرف جھکتے ہیں یعنی دل سے میری طرف جھکتے ہیں۔

اُسکُنْ پ ۴

رہا کرو۔ (مولانا محمود الحسن)۔ رہا کرو (شاہ عبدالقادر)۔ رہا کرو (مولانا اشرف علی)۔ رہو۔ (اعلیٰ حضرت)

وَاتَّقِ الزُّكُوةَ پ ۴

دیا کرو زکوٰۃ۔ (مولانا محمود الحسن)۔ دیا کرو زکوٰۃ۔ (شاہ عبدالقادر) اور زکوٰۃ دیا کرو۔ (فتح محمد) اور زکوٰۃ دیا کرو۔ (عبدالماجد) اور زکوٰۃ دو دو اعلیٰ حضرت)۔

رہا کرو اور دیا کرو زکوٰۃ اردو محاورہ میں ایک کام کو جاری رکھنا اور اس میں تکرار کا ہونا سمجھ میں آتا ہے حالانکہ اصول فقہ میں ایک ضابطہ پیش کیا جاتا ہے کہ امر تکرار کو نہیں چاہتا بلکہ عبادات تکرار اسباب سے متکرر ہوتی ہے لیکن یہاں تو امر کا ایسا ترجمہ کیا گیا ہے جو تکرار پر دال ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں تکرار نہیں۔

اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر عالموں کے۔ (شاہ رفیع الدین)
 کہ میں نے تم کو تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی۔ (مولانا شرف علی)
 اور یہ کہ اس سارے زمانہ میں تمہیں بڑائی دی۔ (اعلیٰ حضرت)
 یہاں بنی اسرائیل کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ انہیں رب تعالیٰ نے اپنے انعامات
 یاد دلانے اور فرمایا: **وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ** اب اگر ترجمہ یہ کیا جائے، تم
 کو بڑائی دی تمام عالم پر۔ اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ بنی اسرائیل کو فضیلت صرف
 اپنے زمانہ میں دوسروں پر تھی کہ ہر زمانہ میں انہیں دوسروں پر فضیلت دی گئی۔ بلکہ
 اس طرح کے ترجمہ کو دیکھ کر قوی دہم ہوتا ہے کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی
 امت پر بھی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ عقدہ حل ہو جاتا
 ہے کہ ان کو فضیلت صرف ان کے زمانہ میں دوسروں پر حاصل رہی نہ کہ بعد میں آنے
 والوں پر بھی۔ اس پر تائید جلالین میں دیکھیں۔ عالمین کی تفسیر اسی عالمی زمانہ ہم
 سے کی گئی ہے کہ انہیں زمانہ میں اوروں پر فضیلت دی گئی تھی۔ اور اس کی زیادہ
 وضاحت کمالین میں ہے جو اس طرح ہے: **يَعْنِي لَيْسَ الْمُرَادُ بِالْعَالَمِ**
جَمِيعَ مَا سِوَى اللَّهِ لَيْزِمَ فَضِيلَتِهِمْ عَلَى هَذِهِ الْأُمَّةِ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْمُرَادِ بِالْعَالَمِ كُلِّ مَوْجُودٍ سِوَاهُ فِي ذَلِكَ الْوَقْتُ۔

یعنی عالم سے مراد اللہ تعالیٰ کے بغیر جمیع اشیاء نہیں تاکہ ان کی فضیلت نبی کریم کی امت
 پر لازم نہ آئے بلکہ عالم سے مراد اس وقت ان کے بغیر جو بھی تھے ان پر انہیں فضیلت
 دی گئی۔ ان تفسیر کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی برتری کا انکار کیسے کیا جائے؟
 اسی طرح ۲۵ **ع** **وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ** کے ترجمہ میں بھی مترجمین سے
 لغزش ہوئی۔

حاشی میں ہے: **وَلَا مَوْجِبَ لَهُ فِي التَّكْرَارِ وَلَا يَحْتَمِلُهُ**۔ کہ امر
 میں تکرار ہونا ہے اور نہ تکرار کا احتمال جب امر میں تکرار کا احتمال تک نہیں تو ایسا
 ترجمہ جس میں صراحتہً تکرار سمجھ رہا ہو، کیسے صحیح ہو گا؟ حاشی کی اسی عبارت پر نامی
 میں یہ ہے **فَإِذَا خِيلَ صَلَ كَانَ مَعْنَاهُ اخْلَ فَعِلَ الصَّلَاةُ لَا يَقْتَضِي**
ذَلِكَ التَّكْرَارَ وَلَا يَحْتَمِلُهُ یعنی اگر کسی کو کہا جائے صَلَّ تو اس کا
 معنی ہو گا اخْلَ فَعِلَ الصَّلَاةُ مَرَّةً تو ایک دفعہ نماز ادا کر کیونکہ امر نہ تکرار کا
 مقتضی ہے اور نہ ہی اس کا احتمال رکھنا ہے۔ البتہ تکرار صلوة تکرار اسباب کی وجہ
 سے ہے یعنی جب بھی نماز کا وقت آئے گا، نماز لازم ہوگی۔ تو وقت کے بار بار آنے
 کی وجہ سے بار بار نماز لازم ہوگی، امر کے تکرار کی وجہ سے نہیں۔ یہاں بھی اسی ضابطہ
 کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ **تَوَالِ زَكَاةً** کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ زکوٰۃ دینا
 ثابت ہے اس امر سے البتہ ہر سال زکوٰۃ اس لیے لازم ہوگی کہ اس کے پاس اتنی
 مقدار میں مال ہے جس پر زکوٰۃ لازم آتی ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے۔ تو یہ
 زکوٰۃ کا تکرار سبب کے تکرار کی وجہ سے ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی اعتراض سے
 محفوظ ہے کہ امر تکرار کو نہیں چاہتا تو ایسا ترجمہ کیوں کیا ہے جس سے تکرار سمجھ میں
 آ رہا ہے۔ آپ کا ترجمہ تکرار کا معنی نہیں دے رہا۔

وَإِنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۚ

- ① اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی تمام عالم پر۔ (مولانا محمود الحسن)
 تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت دی تھی۔ (مولانا مودودی)
 اور یہ کہ میں نے تم کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ (فتح محمد)
 اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں سے۔ (شاہ عبد القادر)

وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ (پ ۶)

اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش۔ (مولانا محمود الحسن)

نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی۔ (مولانا مودودی)

اور نہ کسی کی سفارش منظور کی جائے۔ (فتح محمد)

اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش۔ (شاہ عبدالقادر)

اور نہ قبول کی جائے اس سے سفارش۔ (شاہ رفیع الدین)

اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہو سکتی ہے۔ (مولانا شرف علی)

اور نہ کسی کے حق میں سفارش قبول ہوگی۔ (عبدالماجد)

اور نہ کافر کے لیے کوئی سفارش مافی جائے۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ کافروں کے لیے کسی کی

سفارش قبول نہیں لیکن دیگر تراجم سے یہ سمجھ آتا ہے کہ کسی کی سفارش کسی کے لیے

نہیں ہوگی حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ ایمان والوں کے لیے انبیاء، شہداء، صلحا،

سفارش فرمائی گئی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید مدارک سے اس طرح ملتی ہے:

لَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ لِلْكَافِرِينَ وَقِيلَ كَانَتِ الْيَهُودُ تَزْعُمُ أَنَّ أَبَاءَهُمْ

الْأَنْبِيَاءَ يَشْفَعُونَ لَهُمْ فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ فَهَذَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ

الشَّافِعِينَ تَنْشِئُ الْمَعْتَزِلَةُ بِأَدْنَى نَفْسٍ الشَّفَاعَةَ لِلْعَصَاةِ مَرْدَةً

لَا تَنْفَعُ شَفَاعَةُ الْكَفَّارِ فَقَدْ قَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ شَفَاعَتِي ^{إِلَّا} أَهْلَ الْكَلْبَاتِ مِنَ

یعنی کافروں کے لیے شفاعت قبول نہیں کی جائیگی۔

تفسیر کبیر میں اسی آیت کریمہ کے ماتحت بہت سیط بحث کی گئی ہے۔ معتزلہ

منکرین شفاعت کے دلائل اور ان کا رد پیش کیا گیا ہے۔ تمام بحث کا ذکر کرنا تو اس مختصر

میں ممکن نہیں البتہ مختصر طور پر ذکر کی جا رہی ہے۔

اجمعنا الامتہ علی ان لمحمد صلی اللہ علیہ وسلم شفاعۃ فی الآخرۃ وحمل

علی ذلک قولہ تعالیٰ عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا وقولہ تعالیٰ

ولسوف یعطیک ربک فترضی ثم اختلفوا بعد ہذا فی ان شفاعۃ

علیہ السلام لمن تكون للمؤمنین المستحقین للثواب ام تكون

لاہل الکلبات المستحقین للعقاب۔ فذهب المعتزلۃ علی انہا

للمستحقین للثواب وتأثیر الشفاعۃ فی ان تحصل زیادۃ من المنافع

علی قدس ما استحقوه وقال اصحابنا تاثیرہا فی اسقاط العذاب عن

المستحقین للعقاب اما بان یشفع لهم فی عرصة القیامۃ حتی

لا یدخلوا النار وان دخلوا النار فیشفع لهم حتی ینخرجوا

منہا ویدخلوا الجنة والتفقوا علی انہا لیست ککفار۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو آخرت میں شفاعت کے حامل ہونے پر امت کا اجماع

ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی عسی ان یبعثک ربک مقاما محمودا اور اللہ تعالیٰ

کا قول ولسوف یعطیک ربک فترضی اس پر دلالت ہے۔ پھر اس میں اختلاف

ہے کہ یہ شفاعت صرف مؤمنوں کو نفع دے گی جو حق ثواب ہیں یا کہ کبیرہ گناہوں کے

مترکبین جو عذاب کے مستحق ہوں گے ان کو بھی نفع دے گی ^{بمعزلہ} کا مذہب یہ ہے کہ

یہ شفاعت صرف ان مؤمنوں کو نفع دے گی جو ثواب کے مستحق ہوں گے شفاعت

کا فائدہ ان کو یہ ہوگا کہ ان کے ثواب اور منفعت میں ان کو استحقاق سے زیادتی حاصل

ہوگی لیکن جمہور اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ مستحقین عذاب سے عذاب کے معاف

کرنے میں یہ شفاعت فائدہ دے گی۔ یا تو میدانِ حشر میں ہی ان کے لیے شفاعت ہو

گی۔ لہذا ان کو جہنم کی آگ میں نہیں داخل کیا جائے گا اور یا ان کے جہنم میں داخل ہونے

کے بعد شفاعت ہوگی جس کی وجہ سے اسی کو بہتر کی آگ سے نکال دیا جائے گا۔ البتہ کافروں کے حق میں شفاعت کے نہ ہونے میں اتفاق یعنی کافروں کے لیے انبیائے کرام یا صالحین نے شفاعت کرنی ہی نہیں کہ ان کو نفع دے۔ معززہ نے گنہگاروں کے لیے شفاعت کی نفی پر جو اعتراض کیے علامہ رازی نے ان کا رد کیا ہے۔ ایک اُن کی دلیل یہ ہی ہے: ولا یقبل منها شفاعۃ وھذہ منکرۃ فی سیاق النفی فتعم جمیع الخواص الشفاعۃ اس مقام پر شفاعت منکرہ ہے اور سیاق نفی میں ہے چونکہ منکرہ تحت انفی عموم کا فائدہ دیتا ہے لہذا شفاعت کی تمام قسموں کی نفی ہو جائے گی یعنی کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ اس کا جواب اس طرح دیا گیا فہم (فہمدا باطل) ان العبۃ بمعنی اللفظ لا بخصوص السبب الا ان تخصیص مثل هذا العام بذلک السبب المخصوص یکفی فیہ ادنی دلیل فاذا قامت الدلائل الدالۃ علی وجود الشفاعۃ وجب الی تخصیصا یہ دعویٰ باطل ہے کہ اعتبار عموم لفظ کا ہے خصوصی سبب کا نہیں اس لیے کہ عام کو خصوصی سبب سے کسی ادنیٰ دلیل کے پیش نظر بھی خاص کرنا صحیح ہوتا ہے اور جب وجود شفاعت پر واضح دلائل موجود ہیں تو اس کو خاص کرنا ضروری ہے مطلب یہ ہوا کہ عموم لفظ کا اعتبار اس وقت ہوتا ہے جب اس کی تخصیص پر کوئی دلیل قائم نہ ہو سکے۔ اسی طرح ایک اور دلیل منکرین شفاعت نے یہ پیش کی: مالا لظالمین من حمیم ولا شفیع یطاع والظالم ھو لا یتقٰ بالظلم وذلک یتناول الکافر وغیرہ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں اور نہ ہی ان کا شفاعت کرنے والا جس کی بات مانی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ظالموں کے متعلق ہے اور ظالم وہ ہے جو ظلم کرے۔ یہ کافر اور غیر کافر سب کو شامل ہے۔ لہذا پتا چلا کہ فاسقوں کی کوئی شفاعت نہیں کر سکے گا۔ اس کا جواب اسی طرح دیا گیا: فالجواب عندنا قولہ ما الظالمین من حمیم ولا شفیع نقیض لقولنا للظالمین حمیم وشفیع لکن قولنا

للظالمین حمیم وشفیع موجبۃ کلیۃ ونقیض الموجبۃ کلیۃ سالبۃ جزئیۃ والسالبۃ جزئیۃ یکفی فی صدقہا تحقق ذلک السلب فی بعض الصور ولا یمتاز فیہ الی تحقق ذلک السلب فی الصور علی هذا فنحن نقول بموجبہ لا وف عندنا انہ لیس لبعض الظالمین حمیم ولا شفیع یجاب وھم الکفار فاما ان یحکم علی کل واحد منھم بسلب الحمیم والشفیع فلا۔

یعنی جواب یہ دیا گیا ہے کہ مالا لظالمین من حمیم ولا شفیع یہ نقیض ہے للظالمین حمیم وشفیع کی اور یہ موجبہ کلیہ ہے موجبہ کلیہ کی نقیض سالبہ جزئیہ ہوتی ہے اور سالبہ جزئیہ کے لیے یہ کافی ہے کہ بعض صورتوں میں سلب پائی جائے۔ جمیع صورتوں میں سلب کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اس وجہ سے ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض ظالموں کا کوئی مددگار اور شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔ وہ بعض ظالموں سے مراد کافر ہیں۔ اگر تمام ظالم مراد لیے جائیں تو یہ درست نہیں۔

اور نفی شفاعت پر یہ دلیل قائم کی گئی من قبل ان یاتی یوم لا یمیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ۔ ظاہر الایۃ یقتضی نفی الشفاعۃ باسرها یعنی اس مذکورہ آیت میں مکمل طور پر شفاعت کی نفی کی گئی ہے کہ قیامت میں کوئی دوستی اور سفارش کام نہیں آئے گی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: فالجواب عندنا تقدم فی الوجه الاول یعنی اس کا جواب بھی وہی ہے جو ابھی پہلی آیت کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اسی طرح اور دلیل نفی شفاعت پر یہ دی گئی ہے: قوله تعالیٰ فما تنفعهم شفاعة الشافعين ولو اشرت الشفاعۃ فی اسقاط العقاب لكانت الشفاعۃ قد تنفعهم وذلک ضد الایۃ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت نفع نہیں دے گی۔ اگر شفاعت عذاب کے ختم ہونے میں

نفع ہوئی تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہ ہوتا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے: قوله فما
 نفعهم شفاعۃ الشافعين فهذا واضح في حق الكفار وهو يدل
 بسبب التخصيص على ضد هذا الحكم ^{منع} یعنی یہ آیت کریمہ کافروں کے بارے میں
 نازل ہوئی۔ لہذا یہ حکم ان ہی کو شامل ہے ان کی ضد مومنوں کو یہ حکم شامل ہی نہیں۔
 جب کہ واضح دلائل قرآن پاک اور احادیث مبارکہ سے ثابت ہیں تو گنہگاروں کے
 لیے انبیائے کرام صلیحہ کی شفاعت کا انکار ناممکن ہے۔ قرآن پاک میں ہے:
 لا يملكون الشفاعۃ الا من اتخذ عند الرحمن عهدا اللہ تعالیٰ کے حکم
 اور اجازت سے شفاعت کا حق حاصل ہوگا (۱) مستغفرہم الرسول میں بھی
 شفاعت کا ہی ذکر ہے کیونکہ گنہگاروں کے لیے طلب مغفرت شفاعت ہی ہے۔
 مذکورہ بیان کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ کافروں کے لیے کسی کی شفاعت قابل قبول
 نہیں البتہ مومن گنہگاروں کے لیے شفاعت قبول ہوگی۔ لہذا اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی
 حق پرستی ہے مطلقاً شفاعت کے انکار پر دلالت کرنے والا ترجمہ کسی طرح بھی قابل
 قبول نہیں۔

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا (پ ۱۶)

پھر کپڑے تم نے گائے کا بچہ۔ (شاہ رفیع الدین)
 پھر تم نے اُن کے پیچھے گوسالہ کو اختیار کر لیا۔ (عبدالماجد)
 پھر تم لوگوں نے تجویز کر لیا گوسالہ کو موسیٰ کے بعد۔ (مولانا اشرف علی)
 پھر تم نے بنا لیا بچہ اس کے پیچھے۔ (شاہ عبدالقادر)
 پھر تم نے بنا لیا بچہ موسیٰ کے بعد (مولانا محمود الحسن)
 پھر اس کے پیچھے تم نے بچہ کی پوجا شروع کر دی۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر بعض تراجم میں ایک تو ”موسیٰ“ کسی لفظ کا ترجمہ نہیں بلکہ ضمیر
 کے مرجع سے سمجھ میں آتا ہے۔ مخالفین کو یہ اعتراض تو کرنا آتا ہے کہ ضمیر کا مرجع
 نبی کریم ہو تو ”محبوب“ ترجمہ میں کیوں آتا ہے۔ یہاں بعض تراجم میں ”موسیٰ“ کیوں آیا
 ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ دیگر تراجم سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ انھوں نے
 موسیٰ علیہ السلام کے طور پر جانے کے بعد ایک بچہ بنا لیا یا تجویز کر لیا۔ کیا ان پر ایک
 دوسرے کو قتل کرنا فقط اس لیے واجب تھا کہ انھوں نے بچہ کیوں بنا لیا یا بچہ
 کو خدا کیوں مانا؟ اور اس کی پوجا کیوں کی؟ اگر صرف بنانا مقصود تھا تو یہ فعل صرف
 سامری کا تھا، تمام کا نہیں۔ پھر دوسروں کا مواخذہ کیسے۔ یہاں تو یہ ذکر ہے انھوں
 نے بچہ کیوں کو خدا مان کر اس کی پوجا شروع کر دی تھی۔ اس پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ زیادہ
 واضح ہے۔ باقی تراجم سے مقصد واضح نہیں۔ اس پر زیادہ تفاسیر کی عبارات نقل
 کرنے کی ضرورت اس لیے نہیں خود قرآن پاک کے دوسرے مقام پر واضح کیا گیا
 ہے کہ انھوں نے بچہ کو خدا مانا تھا۔ اس کی عبادت کرتے رہے فقالوا هذا
 إِلَهُكُمْ وَإِلَهُ مُوسَىٰ (۱)۔ سامری اور اس کے متبعین نے دوسروں کو کہا:
 ”یہ ہے تمہارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا“ اس سے آگے ان کا جواب حضرت ہارون
 علیہ السلام کے منع کرنے پر یہ تھا: قَالُوا لَنْ نَبْرَحَ عَلَيْكَ كَافِرِينَ حَتَّىٰ
 يَرْجِعَ إِلَيْنَا مُوسَىٰ (۲) ”انھوں نے کہا ہم تو موسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے
 تک اسی پر (گاؤ پرستی) پر قائم رہیں گے۔ تاہم صرف بیضاوی شریف کی عبارت پر
 اتنا کیا جاتا ہے: ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهَا (۱) ”یعنی
 تم نے بچہ کو خدا، معبود بنا لیا۔“

فَفَرَّقَ بَيْنَهُمْ وَفَرَّقَ تَقْتُلُونَ (پ ۱۷)

پھر بعض کو تم نے بھٹلایا اور بعض کو تم ہی قتل کرنے لگے۔ (عبدالماجد)

ایک گروہ (انبیاء) کو تو جھٹلاتے رہے اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے۔
پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو مار ڈالتے (شاہ عبدالقادر)
کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔ (مولانا مودودی)
پھر ایک جماعت کو جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کر دیا (مولانا محمود الحسن)
سویعضوں کو قتل کرنے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو قتل ہی کر ڈالتے تھے۔ (مولانا
اشرف علی)

تم ان (انبیاء) میں ایک گروہ کو جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو شہید کرتے
ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں ایک ان تراجم میں یہ فرق واضح ہے کہ یہاں بھی یہود کا انبیاء کو شہید
کرنے کا ذکر ہے وہاں ہی دیگر حضرات کے تراجم میں لفظ قتل استعمال ہوا ہے۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں لفظ شہید ہے جو ادب و احترام پر دال ہے کیونکہ ہر قتل شہادت
کو مستلزم نہیں۔ اگرچہ انبیائے کرام کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے تخصیص تو ہے
لیکن بات تو یہ ہے کہ ترجمہ کے الفاظ ہی سے کسی کے مقام کا پتا چل جائے اور تفسیر
کی طرف اشارہ ہو جائے یہ ہی ترجمہ کی کم لیت پر دال ہے۔ تفسیر جلالین کی عبارت
ملاحظہ ہو: فخر یقا منہم کذبتم کعبیسی و فخر یقا تقتلون ای کرکریا و یحییٰ
اسی طرح منہم کے ماتحت بین اسطورہ بحوالہ کمالین ای من الرسل
الدال علیہ قولہ رسول یعنی انبیاء کی ایک جماعت جیسے عیسیٰ علیہ السلام
کی انہوں نے تکذیب کی اور ایک جماعت جیسے زکریا و یحییٰ علیہما السلام کو شہید کیا۔ اسی
طرح مدارک میں بھی ہے: فخر یقا کذبتم کعبیسی و محمد عذی اللہ السلام
و فخر یقا تقتلون کرکریا و یحییٰ علیہما السلام یعنی ایک جماعت جیسے عیسیٰ علیہ السلام
اور نبی کریم کی انہوں نے تکذیب کی اور جماعت جیسے حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام

کو انہوں نے شہید کیا۔ یہ مفہوم کون سے ترجمہ سے واضح ہے ذی شعور خود ہی فیصلہ
کر سکتا ہے۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنَا (پ ۴۱)

اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ۔ (عبدالقادر)
① اور جب ہم نے مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ
امن کی۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور یہ کہ ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا (مولانا
مودودی)۔

اور جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لیے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔
(فتح محمد)۔

اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امان بنایا۔ (اعلیٰ حضرت)
اس مقام پر مشابہت کا ترجمہ اجتماع کی جگہ کیا گیا ہے اور اعلیٰ حضرت نے مرجع یعنی جائے
رجوع کیا اور یہ ترجمہ لغت کے مطابق ہے اور مقصد بھی بیان کرنے کا یہی ہے کہ لوگ اس
کی طرف بار بار لوٹتے ہیں اور دیکھنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی
فوقیت پر جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: مرجعاً یثوبون الیہ من کل جانب
یعنی مرجع بنایا کہ ہر جانب سے لوگ اس طرف لوٹتے ہیں۔ جلالین کے حاشیہ پر یہ ہے:
یثوبون ای یرجعون ثوب گرد آمدن مردم (مر) یہاں بھی معنی کوٹنا ہے۔
مدارک میں اس طرح ہے: صلباً و مرجعاً للعصاج و العمام یتغی خون عند
تشریث یثوبون الیہ "حاجیوں اور عمرہ کرنے والوں کے لیے مرجع بنایا جو اس سے جدا
ہوتے ہیں اور پھر اس کی طرف لوٹتے ہیں" بیضاوی میں ہے: مرجعاً یثوبون الیہ
الزحفی اول مثالمہ "مرجع ہے کہ اس کی طرف زائرین لوٹتے ہیں" تفاسیر عبارات
سے یہ خود بخود پتا چل جاتا ہے کہ صرف اجتماع کی جگہ ترجمہ کرنے سے اس کا مرجع ہوتا

کہ تمام باطل دینوں نے جدا ہونا ایک دین مستقیم پر قائم ہونا۔ مدارک نے اس طرح بیان کیا الحنیف المائل من کل دین باطل الی الحق یعنی حنیف کا مقصد یہ ہے کہ ہر باطل دین سے جدا ہونا، دین حق کی طرف متوجہ ہونا بیضاوی میں یہ ہے: (حنیفاً) مائلاً عن الباطل الی الحق باطل سے جدا ہونا۔ حق کی طرف متوجہ۔ مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ تو حقیقت سے بالکل دور ہے کیونکہ حنیفاً کا ذکر ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ہے نہ کہ ملت کے یعنی یہ حال واقع ہو رہا ہے لفظ ابراہیم سے لیکن مودودی صاحب کا ترجمہ صرف خیالی ہے۔ عربی گرامر کی مطابقت سے اسے دور کا واسطہ بھی نہیں۔ اسی طرح مولانا اشرف علی صاحب نے حنیفاً کا ترجمہ کیا ہے۔ (جس میں کبھی کا نام نہیں) یہ کوئی لغوی ترجمہ نہیں اور نہ ہی مقصد کو واضح کرتا ہے۔

لَا تَفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ (پ ۱۴)

نہیں جدا کر دیتے ہم درمیان کسی ان میں سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔ ہم فرق نہیں کرتے ایک میں ان سب سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔ ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔ (عبدالماجد)۔ ہم ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ (اشرف علی)۔ ہم فرق نہیں کرتے ان سب میں سے کسی ایک میں بھی۔ (مولانا محمود الحسن)۔ ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ (مولانا مودودی)۔ ہم ان میں کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔ (علی حضرت)۔

ان تراجم میں فرق سمجھنے سے پہلے اس پوری آیت کا مفہوم ذہن میں رہے کہ اس آیت میں خطاب مومنوں کو ہے کہ تم کو ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف آنا را گیا یعنی قرآن پاک اور جو ابراہیم علیہ السلام اور اسمعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر آنا را گیا یعنی صحیفے اور جو عطا کیا گیا مولے

علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو یعنی تورات اور انجیل اور جو باقی انبیائے کرام کو ایسے رب کی طرف سے عطا ہوئے یعنی کتب و آیات۔ ہم ان میں کسی ایک پر ایمان میں فرق نہیں کرتے۔

اب اس آیت کریمہ کے مفہوم کے بعد واضح ہو کہ صرف اتنا کافی نہیں کہ ہم ان میں فرق نہیں کرتے کیونکہ فرق تو ہم کرتے ہیں اور قرآن پاک کو افضل الکتاب مانتے ہیں۔ لہذا ایمان جس فرق کی نفی ہے وہ یہ ہی ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے کہ بعض کتب پر ایمان ہو اور بعض پر نہ ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر جلالین میں اس طرح تفسیر پیش کی گئی ہے: فَمِنْ بَعْضٍ وَنَكَهَ بَعْضٌ كَالْيَهُودِ وَالنَّصَارَى ہم ایسا نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان رکھیں اور بعض کے ساتھ کفر کریں جس طرح یہود و نصاریٰ کرتے تھے۔ مدارک میں بھی اسی طرح بالفاظ دیگر مفہوم پیش کیا گیا ہے: اِیْ لَاحِیْ مِنْ بَعْضٍ وَنَكَهَ بَعْضٌ كَمَا فَعَلَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَى اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصد کے مطابق ہے جب کہ دیگر تراجم قابلِ اعتراض ہیں۔

فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ (پ ۱۴)

تو تمہاری طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے۔ (اشرف علی)۔ سو اب کفایت ہے تیری طرف سے ان کو اللہ۔ (شاہ عبدالقادر)۔ سو اب کافی ہے تیری طرف سے اللہ۔ (مولانا محمود الحسن)۔ سو اب اللہ آپ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں ہے۔ (عبدالماجد)۔ تو اے محبوب! عنقریب اللہ ان کی طرف سے تجھیں کفایت کرے گا (علی حضرت)۔ یہاں لفظ اللہ فاعل ہے اور "ک" ضمیر اور "هم" ضمیر مفعول ہیں۔ بظاہر وہو معنوں کو عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ مطلب ہو کہ اللہ نبی کریم کی طرف سے ان کو کافی ہو۔ یعنی عذاب دے۔ یا یعنی ہو کہ اللہ ان کی طرف سے نبی کریم کو کافی ہو کہ وہ آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچا سکیں بلکہ خود ہی گرفت میں آجائیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے عین

مطابق ہے۔ مدارک میں ہے: ضمان من الله لا يظلمكم رسولہ علیہم
 قد اجنح وعدہ بقتل بعضهم واجلاء بعض یعنی اللہ تعالیٰ نے
 ذمہ داری اٹھائی ہے کہ نبی کریم کو غالب کریگا ان پر یعنی اللہ ان کی طرف سے تمہیں کفایت
 کرے گا۔ اسی وعدہ کو اللہ نے اس طرح پورا فرمایا کہ بعض ان میں سے قتل ہو گئے اور
 بعض جلاوطن۔ ایسے ہی جلالین میں یا محمد شقاہم سے تفسیر کی گئی جس کا مطلب
 ہے کہ اے نبی کریم آپ کو اللہ کافی ہے ان کی مخالفت کے باوجود۔ کیونکہ شقاق کا
 ترجمہ خود مفسر نے پہلے خلاف کر دیا ہے۔ اس آیت کریمہ کے اختتام پر بھی جلالین میں
 مدارک کے مطابق ہی عبارت ہے: وقد كفاه الله اياهم بقتل قريظة
 وحفي النضير وخراب الجحمة علیہم اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کی ان کی طرف سے
 کفایت کی تو قریظہ قتل ہو گئے اور نضیر جلاوطن ہوئے اور ان پر جزیہ مقرر ہوا۔ شیخ
 زادہ حاشیہ بیضاوی میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے: حسیکفی الله اياك امر
 الیہم والنصارى بحفظك من شوءهم ونضرك علیہم یعنی اللہ تعالیٰ آپ
 کی یہود و نصاریٰ کی طرف سے کفایت کرے گا۔ ان کے ناپاک ارادوں کو ختم کر کے
 آپ کی حفاظت فرمائے گا اور آپ کو ان پر غالب فرمائے گا۔
 تفسیر کے بیان کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کریں تو آپ کی وسعت علمیت
 کا اعتراف کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں رہے گا۔

وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (پ ۶)

اور ہووے پیغمبر اور تمہارے گواہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 اور رسول ہو تم پر بتانے والا۔ (شاہ عبد القادر)۔
 اور پیغمبر آخر الزمان تم پر گواہ بنیں۔ (فتح محمد)۔
 اور رسول تم پر گواہی دینے والا۔ (محمود الحسن)۔
 اور رسول تم پر گواہ ہو۔ (مولانا مودودی)

اور رسول گواہ ہیں تم پر (عبد المجید) اور تمہارے لیے رسول اللہ صلی علیہ وسلم
 گواہ ہوں۔ (اشرف علی)۔ اور یہ رسول تمہارے نگہبان و گواہ (اعلیٰ حضرت)۔
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت لوگوں پر گواہی دے گی اور آپ اپنی امت کی
 صداقت کی گواہی دیں گے اور ان کے نگہبان ہوں گے۔ دیگر تراجم نے صرف گواہ
 ذکر کیا جب کہ علحضرت نے نگہبان و گواہ ذکر کیا ہے۔ اس معنی پر مدارک دال ہے:
 لما كان الشهيد كالرقيب حتى يكمل استعداده لقوله تعالى كنت انت
 الرقيب علیہم چونکہ گواہ نگہبان کی طرح ہوتا ہے اسی وجہ سے جس طرح
 رقیب (نگہبان) کے بعد کلمہ علی آتا ہے اسی طرح یہاں بھی لایا گیا ہے بیضاوی نے
 بھی اسی طرح بیان کیا کہ جب پہلی امتیں تبلیغ انبیاء کا انکار کر دیں گی تو رب تعالیٰ
 باوجود علم کے منکرین پر حجت قائم کرنے کے لیے تبلیغ پر گواہ طلب کرے گا۔ انبیائے
 کرام امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ پیش کریں گے۔ پہلی امتیں کہیں گی، تم ہمیں
 کیسے پہچانتے ہو؟ تو یہ کہیں گے کہ ہمیں اپنے سچے نبی نے اللہ کا کلام اس کی کتاب کے
 ذریعے پہنچایا۔ ہمیں علم حاصل ہوا۔ پھر ان پر گواہی کے لیے نبی کریم کو لایا جائے گا۔ آخر
 مقصودی عبارت ملاحظہ ہو: فیوثی بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم فیستال
 عن حال امته فیشهد بعد التسمی و هذه الشهادة وان كانت
 لهم لكن لما كان الرسول علیہ السلام كالرقيب المظہم علی
 امته عدی بعلمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا جائے گا۔ آپ اپنی امت
 کی عدالت کی گواہی دیں گے۔ آگے علامہ بیضاوی نے ایک سوال کا جواب دیا
 ہے کہ شہادت کے بعد علی آئے تو یہ شہادت کسی کے خلاف ہوتی ہے۔ جب کسی کے حق
 میں شہادت دینی ہو تو شہادت کے بعد لام آتا ہے۔ اس کا جواب علامہ نے دیا کہ اگرچہ
 نبی کریم کی شہادت ان کے حق میں ہوگی لیکن آپ چونکہ ان کے لیے قیوب (نگہبانوں) کی
 طرح ہیں اس وجہ سے علی سے متعبدی کیا ہے۔ چونکہ آپ نگہبان ہیں نہ کہ یہ مراد ہے
 کہ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ اسی سوال و جواب کو علحضرت نے ترجمہ میں نگہبان کا

لفظ بڑھا کر مندرجہ کر دیا جس کی حقیقت سے دیگر مترجمین بے خبر رہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ رُوحَنَا

اور جس قبلہ پر تم (پہلے) تھے اس کو ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں (فتح محمد)۔ اور جس سمت قبلہ پر آپ رہ چکے ہیں وہ تو محض اس کے لیے تھا کہ ہم کو معلوم ہو جاوے (اشرف علی)۔ نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں (محمود الحسن)۔ اور وہ قبلہ جو ہم نے ٹھہرایا جس پر تو تھا، نہیں مگر اسی واسطے کہ معلوم کریں۔ (شاہ عبدالقادر)۔ اور اے محبوب تم پہلے جس قبلہ پر تھے ہم نے وہ اسی لیے مقرر کیا تھا کہ دیکھیں۔ (المصطفیٰ)۔ اور نہیں کیا تھا ہم نے قبلہ جو تھا تو اوپر اس کے مگر تو کہ جانیں ہم۔ (شاہ رفیع الدین)۔

یہاں تحویل قبلہ کا ذکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ پہلے کعبہ تھا۔ مائتہ طیبہ میں اگر سو کہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس قبلہ بنایا گیا۔ پھر نبی کریم کی مرضی کے مطابق کعبہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔ اس واقعہ کو رب قدوس نے ذکر فرمایا کہ تحویل قبلہ کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان اور کافر میں فرق ہو جائے کہ کون نبی کریم کی تابعداری کرتا ہے اور کون شک کرتا ہے اور رُکود دانی کرتا ہے۔ اب اس تمہید کے بعد واضح ہوا کہ عام تراجم میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو اس لیے تبدیل کیا کہ اسے متبعین اور منکرین کا علم ہو جائے۔ اس میں ایک وہم ہوتا ہے جو تفاسیر نے ذکر کیا اس کا ازالہ نہیں ہوتا بلکہ اس وہم کو تقویت ملتی ہے۔ وہ وہم جو تفاسیر میں ہے وہ دیکھیں: خان قبل کیف یکون علمہ تعالی غایۃ الجعل وھو لم یزل عالما۔ بیضاوی۔

اعتراف کیا جاتا ہے کہ علم کو جعل کی غایہ بنانا صحیح نہیں کہ قبلہ اس لیے بنایا کہ ہم جانیں کیونکہ اللہ تعالیٰ تو ازل لاً عالم ہے۔ جواب اس طرح دیا گیا ہے قلت هذا و اشباعہ باعتبار التعلق الخالی الذی ھو مناط الجذاء والمعنی لیتعلق علمنا به موجودا۔ یعنی یہاں جزا کا تعلق موجود کے علم سے ہے۔ اسی جواب

کو مدارک میں زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ قال الشیخ ابو منصور بمعنی قولہ لنعلم کائناتنا موجودا ما قد علمناہ انہ یکون ویوجد فاما لہ تعالیٰ عالم فی الازل بکل ما اسماہ وجودہ انہ یوجد فی الوقت الذی شاء وجودہ فیہ ولا یوصف بانہ عالم فی الازل بانہ موجود کائن لانہ لیس بموجود فی الازل فکیف یعلمہ موجودا اذا اصار موجودا یدخل تحت علمہ الا انہ فیہ صیر معلوما لہ موجودا کائناتنا والتغییر علی المعلوم لا علی العالِم۔

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو علم ازلی حاصل ہے کہ فلاں چیز نے موجود ہونا ہے لیکن پہلے علم کا تعلق غیر موجود سے جو بعد میں موجود ہونا ہے لیکن جب وہ چیز موجود ہوگی اب موجود سے متعلق ہوگا یہاں علم میں تبدیلی نہیں بلکہ معلوم میں تبدیلی ہے۔ پہلے علم وہ تھا کہ معلوم مقام ظہور میں نہیں تھا۔ اب علم ہے کہ معلوم مقام ظہور میں ہے۔

اب آپ تراجم میں فرق دیکھیں کہ یہ کہا جائے تاکہ ہم معلوم کریں تو یہ اعتراف مندرجہ ہوگا یا یہ کہا جائے کہ ہم دیکھیں تو اعتراف مندرجہ ہوگا۔ یہ ہے مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علمی بصیرت جس میں صاحب نظر کو اعتراف کرنے میں کوئی کلام نہیں۔

وَلَئِنْ أَتَيْتُمْ أَهْوَاءَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكُمْ مِنَ الْعِلْمِ

اور اگر تم یا وجود اس کے کہ تمہارے پاس دانش (یعنی وحی خدا) آچکی ہے ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو ظالموں میں داخل ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد) اور کبھی تو چلا ان کی پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بیشک تو بھی ہے بے انصافوں میں۔ (شاہ عبدالقادر)

اور اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو اختیار کر لیں اور (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (وحی) آئے پیچھے لپٹنا آپ ظالموں میں شمار ہونے لگیں۔ (اشرف علی)

اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی ہوا
بے انصافی میں۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور اگر تم نے اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشات کی پیروی کی
تو یقیناً تمہارا شمار ظالموں میں ہوگا۔ (مولانا مودودی)۔

اور اگر (کہیں) آپ ان کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے
پاس علم آچکا ہے تو یقیناً آپ (بھی) ظالموں میں (شمار) ہوں گے۔ (عبد الماجد)۔

اگر تو پیروی کرے گا خواہشوں ان کے کی پیچھے اس چیز کے کہ آئی تیرے پاس علم
سے تحقیق تو اس وقت ظالموں سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور (اے سننے والے کے باشند) اگر تو ان کی خواہشوں پر چلا بعد اس کے کہ
تجھے علم مل چکا تو اس وقت تو ضرور ستم گار ہوگا۔ (علیٰ حضرت)

یہاں دیگر تراجم میں انک من الظالمین کی نسبت نبی کریم کی طرف کی
گئی جس میں ولین انتعت کے ساتھ کوئی یا لغرض کی قید کا اضافہ نہیں ہوا۔

بظاہر عام ترجمہ سے یہ سمجھ آتا ہے کہ نبی کریم سے یہود و نصاریٰ کی خواہشات کی تابعداری
ممکن ہے اور اگر آپ نے تابعداری کر لی تو معاذ اللہ آپ بے انصافوں، ظالموں سے

ہوں گے۔ حالانکہ یہ تصور بھی ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے جلالین میں ہے: انک
اذ ان انتعتهم فخرجنا من الصالحین یعنی یہ کلام بالغرض محال پر مبنی ہے۔

صاحب مدارک نے کہا: وفي ذلك لطف لهما معین وقمہم للشبات
على الحق وتحذیر من يترتب الدليل بعد اناربه ويتبع

الحق وقيل الخطاب في الظاهر للنبی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد انک اس میں سامعین پر
مہربانی ہے اور حق پر نیت رہنے کے لیے براہِ گنجتہ کیا گیا ہے۔ اور جو شخص دلیل

کے روشن ہونے کے بعد چھوڑتا ہے اور خواہشات کے درپے ہوتا ہے اس کو ڈرایا
گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے لیکن مراد

امت ہے۔ اسی لیے علحضرت نے اپنے ترجمہ میں (اور اے سننے والے کے باشند) کا

اضافہ کیا ہے تاکہ تفاسیر کا مفہوم ترجمہ سے ہی واضح ہو جائے۔ بیضاوی نے بھی
علیٰ بسبیل الفرض و التقدير ذکر کیا ہے محشی نے کہا ہے کہ یہ سوال کا

جواب ہے اتباع اهل المذاهب لیس بہ محتمل فی حقہ علیہ السلام
للقطع بعصمة من المعصی کیونکہ نبی کریم سے مخالفین کی خواہشات کی اتباع کا قطعی

احتمال منقذ ہے کیونکہ آپ تو ماصی سے معصوم ہیں۔ بیضاوی نے علیٰ بسبیل
الفرض و التقدير کے الفاظ ذکر کر کے جواب دیا ہے کہ یہ کلام بالغرض ہے نہ کہ

حقیقت۔ محشی نے اس کا جواب بھی نقل کیا ہے فی عادة الناس ان یوجهوا
امرهم فیہم الی من هو اعظم منزلة عندہم اسر شاد اللغین و تاکیدا

کہ عام لوگوں کی عادت ہے اوامر و نہی کو بڑے کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں اگرچہ مقصود
اس سے غیروں کو ہدایت دینی ہوتی ہے۔ اس مقام پر یہی صورت ہے جس کو علحضرت نے

اختیار کیا ہے۔

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُسْتَرِينَ (پ ۶)

تو وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہوشک لانے والا۔ (محمود الحسن)۔

حق ہے پروردگار تیرے کی طرف سے پس مت ہوشک لانے والوں سے (شاہ رفیع الدین
(اے پیغمبر یہ نیا قبلہ) تمہارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے

والوں میں نہ ہونا۔ (فتح محمد)۔

حق وہی جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہوشک لانے والا (شاہ عبدالقادر)۔

یہ قطعی ایک امر حق ہے تمہارے رب کی طرف سے لہذا اس کے متعلق تم ہرگز کسی
شک میں نہ پڑو۔ (مولانا مودودی)۔

یہ امر حق سے تمہارے پروردگار کی طرف سے تو کہیں شک کر نیوالوں میں ہرگز
نہ ہو جانا۔ (عبد الماجد)۔

سو ہرگز شک و شبہ کرنے والوں میں شمار نہ ہونا۔ (اشرف علی)۔

(اے سننے والے) یہ سچی تیرے رب کی طرف سے (یا سچی وہی ہے جو تیرے رب کی طرف سے ہو) تو خبردار تو شک نہ کرنا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی مترجمین نے شک کی نسبت نبی کریم کی طرف کی اور یہ ترجمہ کیا کہ تو نہ ہو شک لانے والا۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے اس نازک مقام کو تفاسیر پر نظر رکھتے ہوئے اپنے ترجمہ سے حل فرمایا۔ (اے سننے والے) لفظ کا اضافہ کیا تاکہ نبی میں مخاطب نبی کریم نہ ہوں بلکہ عام آہستی ہو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر بیضاوی کی عبارت بطور تائید دیکھیے و لیس المراد منہ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم عن الشک فیہ لانه غیر متوقع منہ و لیس بقصد واختیار بل ما تحقیق الامر انہ یحیی لا یشک فیہ ناظر لمراد الامم بالکتاب المعاصر المزیج للشک علی الوجه الابلغ اس پر محشی کی عبارت اس طرح ہے: فان الانسان کمالا ینھی عمالا یتوقع منہ لا ینہی امیضا عمالا مدخل فیہ للقصود واختیار کالشک والجهل والجور والعطش فاذا اوصفت صوۃ النہی فی مثل هذه المواضع لا یراد بہا حقیقۃ النہی بل یقصد بہا شئی اخر فقوله تعالیٰ فلا تكونن من الممتزین من قبیل الخطاب العام العارض علی صوۃ النہی والمقصود منہ اخبار کافة الناس بان المقام لیس بمظنۃ لان یمس تاب فیہ عن الانعام دونوں عبارتوں کا خلاصہ کلام اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شک سے نہیں روکا گیا کیونکہ آپ سے تو شک کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی کیونکہ جس مقام پر نبی کی توقع نہ کی جاسکے وہاں بھی نبی پائی جاسکتی۔ اسی طرح جہاں قصد اختیار نہ پایا جاسکے وہاں بھی نبی نہیں پائی جاتی۔ لہذا یہاں حقیقتاً نبی نہیں پائی گئی بلکہ یہاں عام خطاب ہے جو صورتہ نبی ہے مقصد یہاں عام لوگوں کی خبر دینا ہے کہ یہ مقام ایسا ہے کہ اس میں کسی ایک کو شک نہیں کرنا چاہیے حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ایمان افروز ہے اس کا کوئی ثانی نہیں جس میں علمی بصیرت تفاسیر و لغات پر نظر ہوتی ہے محبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک

درس ہے۔

وَمَا أَهْلٌ بِهِ لَغَيْرِ اللَّهِ (پ ۲۱)

(محمود الحسن)

اور جس چیز کا نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا۔ اور کوئی ایسی چیز نہ کھاؤ جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا گیا ہو (مولینا مؤوی) اور جو (جانور) غیر اللہ کے لیے نامزد کیا گیا ہے حرام کیا ہے۔ (عبدالماجد) اور جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کا۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور جو کچھ پکارا جاوے اوپر اس کے واسطے غیر اللہ کے (شارف الدین) اور وہ جانور جو غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔ (اعلیٰ حضرت)

مسئلہ یہ ہے کہ جو جانور ذبح کرتے وقت اللہ کے نام کے بغیر کسی اور نام سے ذبح کیا گیا وہ حرام ہے جس طرح کفار اپنے بتوں لات و عزی کے ناموں سے اپنے جانوروں کو ذبح کرتے تھے ایسے باطل طریقوں سے روکا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے مذکورہ جانور حرام ہوں گے۔ اسی طرح اگر ذبح میں غیر خدا کا تقرب حاصل کئے گویا اس کو معبود سمجھے تو یقیناً وہ جانور حرام ہوگا اگرچہ اس کے ذبح کے وقت اللہ کا نام بھی لیا گیا ہو لیکن اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے اور اس مذبح کا گوشت اولیاء اللہ کے ایصال ثواب کے لیے تقسیم کیا گیا ہے یہ ارادہ خواہ قبل از ذبح موجود تھا یا بعد از ذبح، ہر حال میں وہ جانور حلال ہوگا۔ اس مسئلہ پر قطب المصابی حضرت پیر مہر علی شاہ گلوڑوی رحمہ اللہ کی اعلیٰ کلمۃ اللہ ایک جامع اور تحقیق پر مبنی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ یہاں تو صرف بیان کرنا مقصود ہے کہ کون سا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ وما اهل به لغير الله اى دفعه على اسم غيره تعالى والاهل

دفع الصوت وكانوا يرفعونه عند الذبح لالههم

(جلالین) جو جانور غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔ اہلال کا معنی آواز بلند کرنا۔ مشرین ذبح کے وقت اپنے معبودوں کا نام لیتے تھے اى دفعه به الصوت عند ذبح

للصوم (ریضاً وی) یعنی ذبح کے وقت بتوں کا نام لیا جائے ای ذبح للاصنام
فانکم عبدی غیر اسم اللہ واصل الہدای کفر الصلوات فی ذبح الصلوات وذلک قول اہل اہلیۃ
باسم اللہ والہی (بتوں) یعنی غیر خدا کا نام لے کر ذبح کیا گیا۔ اصل اہلال آواز کو بلند کرنا
ذبح کے وقت بت کا نام لیا جائے۔ زبانہ جاہلیت میں وہ باسم اللات، باسم العزی کہتے
تھے۔ غیر کے تقرب کی وجہ سے ذبح کرنا ارتداد اور ذبیحہ حرام۔ اس کی وضاحت بھی
شیخ زادہ میں موجود ہے جس کا مقصد غیر اللہ کے لیے جانور کو خاص کرنا اور اسے معبود
سمجھنا ذبح کے وقت بھی یہی ارادہ ہو فمعنی قوله وما اهل بلغین اللہ ما
ذبح للاصنام والہوا غیت قال العلماء لو ذبح مسلم ذبیحۃ وقصد سربا
التقرب الی غیر اللہ صاس موقدا و ذبیحۃ میتۃ (غیر خدا) بتوں شیطانون
کے نام ذبح کے وقت استعمال کرنا یا مسلمان کا غیر خدا کو معبود سمجھ کر اس کا تقرب چاہنا
یقیناً یا عیش ارتداد و حرمہ ہے۔ بات تو اس مسئلہ میں ہے کہ ذبح کے وقت خدا کا
نام لیا جائے۔ اسی کو معبود وحدۃ لا شریک لہ سمجھا جائے۔ فقط کسی جانور کے گوشت
کی تقسیم سے کسی بزرگ کے لیے ایصال ثواب مقصود ہو اس میں کوئی قیاحت نہیں۔
یہ مسئلہ علامہ حضرت کے ترجمہ سے بخوبی واضح ہے۔

قَالَ النَّبِيُّ ﷺ

پھر بلو اپنی عورتوں سے۔ (محمود الحسن)۔
اب تم اپنی بیویوں کے ساتھ شرب باشی کرو۔ (مولانا مودودی)
سواپ تم ان سے ملو ملاؤ۔ (عبدالماجد)
آپ (تم کو اختیار ہے کہ) ان سے مباشرت کرو۔ (فتح محمد)
پس اب ملا کرو ان سے۔ (شاہ رفیع الدین)
تو اب ان سے صحبت کرو۔ (اعلیٰ حضرت)

وَلَا تَبَا شَرُوْهُنَّ ۚ

وَلَا تَبَا شَرُوْهُنَّ ۚ

اور نہ ملو عورتوں سے (محمود الحسن) تو بیویوں سے مباشرت نہ کرو (مولانا مودودی)
بیویوں سے صحبت نہ کرو (عبدالماجد) ان سے مباشرت نہ کرو (فتح محمد)
اور مت ملو ان سے (شارفیع الدین) اور عورتوں کو ہاتھ نہ لگاؤ (اعلیٰ حضرت)
یہاں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور دوسروں میں فرق سمجھنے کے لیے ایک تو یہ خیال
کیا جائے عورتوں سے ملو، یا ان سے صحبت کرو یا ان سے شرب باشی کرو۔ ایک ہی معنی
میں استعمال ہوئے ہیں یعنی جماع کرنا۔ نہ ملو عورتوں سے یا ان سے مباشرت نہ کرو۔
یہ اسی پہلے معنی کی نفی ہے یعنی جماع نہ کرو۔ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں "صحبت کرو"
پر نفی نہیں کہ ترجمہ یہ ہوتا "ان سے صحبت نہ کرو" لیکن آپ نے ترجمہ کیا ہے "اور عورتوں
کو ہاتھ نہ لگاؤ"۔ ویر فرق کیا ہے؟ اس مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے یہ سمجھا جائے کہ
باشی وھن میں امر کا تعلق رمضان کی راتوں سے ہے اور ولا تباشروھن
کی نہی کا تعلق احکام سے ہے۔ باشی وھن کا ترجمہ سمجھنے سے پہلے اصل وجہ نزول
کو ذہن میں رکھیں: عن ابن عباس کا نوا علی غمدہ صلی اللہ علیہ وسلم
اذا صلوا العشاء حرم علیہم الطعام والشراب والنساء و فی البخاری عن البیہ
کون المنع مقیداً بالنوم قال الحافظ یحتمل ان یکون التقتید بالحقیقۃ
انما هو بالنوم و ذکر صلوة لکون ما بعدھا مظنۃ
النوم غالباً۔
حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ نبی کریم کے زمانہ میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے
بعد کھانا پینا، جماع کرنا منع تھا۔ بخاری شریف میں حضرت برار سے مروی ہے کہ یہ
حکم سونے کے بعد تھا۔ ان دونوں حدیثوں میں محاکمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ حکم حقیقی
نہیں ہے ہی مقید تھا لیکن چونکہ بعد از نماز عشاء عام طور پر سویا جاتا ہے لہذا ایک جگہ
نماز عشاء کا ذکر ہے دوسری جگہ نہی کا۔ لیکن یہ حکم کئی صحابہ کرام کی معذرت پر
منسوخ کر دیا گیا اور جماع کو یا کھانے پینے کو رات میں جائز کر دیا گیا۔ لیکن رمضان کے
دن میں شہوت سے ہاتھ لگانا، یوس و کنا منع نہیں جب کہ انسان کو اپنے آپ پر غماز

ہو۔ انوال نہ ہو یا وہ بے صبری سے کام لے کر غلطی نہ کر دے۔ لیکن اعتکاف کی حالت میں جس طرح صحبت کرنا منع ہے اسی طرح اس کے دوائی بھی منع ہیں یعنی شہوت سے ہاتھ لگانا یا یوس وکنار۔ اب اس مسئلہ کی حقیقت جاننے کے بعد دونوں ترجموں میں پھر توجہ کریں۔ یہ مسئلہ صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہو گا کہ رمضان شریف میں جماع کی قید کو اٹھایا گیا لیکن اعتکاف کی حالت میں جماع سے اور اس کے اسباب سے بھی ممانعت ہے ہدایۃ کتاب الصوم میں دیکھیں ولا بأس بالقبلة اذا امن علی نفسه ای الجماع والانزال ویکرہ اذا لم یامس۔ روزے کی حالت میں جماع یا انزال کی فکر نہ ہو تو بوسہ لینے میں کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ خطرہ ہو تو مکروہ ہے (بشرطیکہ انزال یا جماع نہ ہو ورنہ دونوں کا حکم علیحدہ لیکن اعتکاف میں کیا حکم ہے ہدایۃ باب الاعتکاف - ویحرم علی المعتکف الوطی لقولہ تعالیٰ ولا تنباشواہن وانتم عاکفون فی المساجد و کذا اللمس والقملۃ لانہ دواعیہ فیحرم علیہ اذہو محظوظا کما فی الاحکام بخلاف الصوم لان الکف مکنہ لا محظوظا فله یتعدالی دواعیہ

حالت اعتکاف میں وطی حرام ہے اور اسی طرح بوس و مس بھی منع ہے جس طرح احرام میں منع ہیں لیکن یہ روزے کا حکم نہیں کیونکہ وہاں جماع سے رکنا رکن صوم ہے یہ فرق واضح کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے۔ ارباب ناظرین! اقدار انصاف کریں۔ اسی فقہی فرق پر کون سا ترجمہ دال ہے اور کون سا کوسول دور ہے۔ اسی پر شیخ زادہ کی عبارت بھی شاہد ہے: واما اذا المسہا بشہودۃ او قبلہا او بامرہا فہا دون الفرج فہو حرام علی المعتکف شہوت کے ساتھ مس اور بوسہ اور پیچنڈ و تطین سب ہی معتکف پر حرام ہیں۔

وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مَسْكِينٍ (پ ۶۴)

اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا (محمود الحسن) جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (پھر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں (موسووی) اور جو لوگ اسے مشکل سے برداشت کر سکیں ان کے ذمہ فدیہ ہے کہ وہ ایک مسکین کا کھانا ہے۔ (عبد الماجد)۔

اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں (لیکن رکھیں نہیں) وہ روزے کے بدلے محتاج کو کھانا کھلائیں (فتح محمد) اور اوپر ان لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کی بدلہ ہے کھانا ایک فقیر کا۔ (شاہ رفیع الدین)

اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دے ایک فقیر کا کھانا (اعلیٰ حضرت)۔ یہاں روزے کا فدیہ دینے کا ذکر ہے۔ آیا فدیہ وہ شخص دے جو روزہ رکھ سکتا ہے۔ پھر یہ حکم فسوخ ہو گیا۔ یا کہ حکم ابھی باقی ہے۔ فدیہ دینے کا حکم اس شخص کو ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا دوسرا قول ہے۔ یہ ہی زیادہ معتبر ہے اگرچہ پہلے قول کو بھی ذکر کیا گیا ہے: وعلى الذين لا يطيقونه كلبوا ومرض لا يرجى برؤه (جلالین) فدیہ ان لوگوں پر ہے جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے بڑھاپے کی وجہ سے یا مرض دائمی کی وجہ سے۔

حاشیہ جلالین میں اس طرح ہے: قوله على الذين لا يطيقونه واعلم ان عند اكثر المفسرين فيه قولان احدهما ان المراد بالذين يطيقون الاصحاء المقيمون خیرهم فی ابتداء الاسلام بین الامیین بین ان یصوموا و بین ان یغطروا و یفقدوا النسل یشق علیہم لانهم كانوا لم یتعبدوا ثم نسخ التعمیر و نزلت العزیمۃ بقوله فمن شهد منكم الشهر فليصمه و ثانیہا ان یکون لا محذور فا وهو واقع فی کثیر من استعمال الفصحاء کما فی قوله تعالیٰ یبئین انشدکم

أَنْ تَصِلُوا وَكَانَ الْمُحْفَى وَعَلَى الَّذِينَ لَا يَطِيقُونَ خَدِيَةَ طَعَامٍ مَسْكِينٍ -
 بے شک اکثر مفسرین کے اس میں دو قول ہیں۔ ایک یہ ہے کہ اس سے مراد وہ
 لوگ ہیں جو طاقت رکھتے ہیں صحیح ہوں، مقیم ہوں۔ ان کو ابتدائے اسلام دوامروں میں
 اختیار دیا گیا تھا کہ وہ روزہ رکھیں یا افطار کریں اور فدیہ دیدیں تاکہ ان پر شاق
 نہ ہو کیونکہ ان کو روزہ رکھنے کی پہلے طاقت نہ تھی۔ پھر اس اختیار کو منسوخ کر دیا گیا :
 مِنْ شَهْدِ مَنْكُمْ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ - دوسرا قول یہ ہے کہ یہاں محذوف
 ہے۔ فصا کے استعمال میں ایسا کثیر الوقوع ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد و گرامی میں
 يَسِينُ اسْتَدَ لَكَ ان تَصِلُوا ۱ (یہاں بھی لا محذوف ہے اور معنی ان
 لا تَصِلُوا ہے)۔ اس مذکورہ آیت میں معنی یہ ہے کہ و علی الذین لا یطیقون
 خدیة اور جنہیں اس کی طاقت نہ ہو وہ فدیہ دیں۔ اسی نفی والے قول پر ایک اور
 صورت پیش کی گئی ہے۔ قوله یطیقونہ قال فی تفسیر الشیخ یطیق
 من اطاق فلان اذا نالت طاقته والهمزة للسلب ای لا یقدرون
 علی الصوم یطیقونہ باب افعال سے جس کا ہمزہ سلب کے لیے آتا ہے۔ اطاق
 فلان کہتے ہیں جب کسی کی طاقت سلب ہو جائے۔ یہاں بھی ہمزہ سلب کے لیے ہے
 معنی یہ ہو گا کہ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ زیادہ پسندیدہ قول یہ ہی
 ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں بلکہ شیخ فانی کے حق میں باقی ہے۔

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ (پ ۶۴)

حلال کی گئی واسطے تمہارے رات رونے کی رغبت کو نا طرف بیسیوں اپنی کی۔
 (شاہ رفیع الدین)

تمہارے لیے روزوں میں راتوں کو اپنی بیسیوں کے پاس جانا حلال ہوا (مولانا مودودی)
 حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے (محمود الحسن)
 حلال ہوا تم کو روزے کی رات میں بے پردہ ہونا اپنی عورتوں سے (شاہ عبدالقادر)

روزوں کی راتوں میں تمہارے لیے اپنی عورتوں کے پاس جانا جائز کر دیا گیا۔
 روزوں کی راتوں میں اپنی عورتوں کے پاس جانا تمہارے لیے حلال ہوا۔ (علی حضرت)

فَلَا رَفَثَ (پ ۶۵)

تو بے حجاب ہونا جائز نہیں (مولانا محمود الحسن)۔
 کوئی شہواتی فعل سرزد نہ ہو۔ (مولانا مودودی)۔

تو بے پردہ ہونا محذوف سے۔ (شاہ عبدالقادر)
 تو (حج کے دنوں میں) نہ عورتوں سے اختلاط کرے۔ (فتح محمد)
 تو نہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

ان دونوں مقاموں میں رفث کا معنی ایک ہی لیا گیا۔ ایک جگہ منیت، ایک
 جگہ منفی لیکن علی حضرت نے مثبت مقام میں جماع معنی لیا ہے کیونکہ عورتوں کے
 پاس جانا محاورہ جماع ہی ہے۔ برخلاف دوسرے مقام کے وہاں صرف جماع
 کی نفی نہیں بلکہ عورتوں کے ساتھ صحبت کا تذکرہ بھی منع کیا گیا ہے۔ وجہ فرق کیا
 ہے وہ پہلی آیت کی وجہ تو باشی و حق کے ضمن میں گزر چکی ہے کہ رمضان شریف
 میں رات کی قیود کو اٹھایا اور جماع کو حلال کیا گیا۔ اب معنی بے حجاب ہونا یا بے
 پردہ ہونا، رغبت کر لیا جائے، یا عورتوں کے پاس جانا کر لیا جائے، ایک ہی صورت
 ہے لیکن دوسرا مقام حج کے احکام میں ہے کہ حج میں رفث منع ہے۔ اب یہاں
 صرف جماع منع ہونا کافی نہیں بلکہ عورتوں کے سامنے ذکر صحبت بھی منع ہے۔

مدارک میں ہے : فلا رفث ہوا الجماع ای ذکرہ عند النساء الخ
 رفث جماع ہے یا جماع کا عورتوں کے سامنے ذکر کرنا۔ ہدایہ میں بھی رفث کے
 معنی ذکر الجماع بحضرة النساء موجود ہے۔ اسی طرح در مختار میں ہے : یتفح
 الرفث ای الجماع اور ذکر بحضرة النساء یعنی رفث سے بچے۔ رفث کا معنی جماع
 ہے اور اسی طرح عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا۔ علامہ شامی نے

بحضرة الناس پر تحریر فرمایا: قول ابن عباس یعنی حضرت ابن عباس کا قول یہی ہے کہ عورتوں کے سامنے صحبت کا تذکرہ کرنا منع ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر نظر کی جائے تو یقیناً سمجھ آئے گا کہ آپ نے اس فقہی یاری کو مد نظر رکھ کر ترجمہ کیا جب کہ دیگر حضرات اس کو نہ سمجھ سکے۔

ثُمَّ آفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ (پ ۴۸)

پھر طواف کے لیے پھر وہاں سے سب لوگ پھریں (مولانا محمود الحسن) پھر طواف کو چلو وہاں سے سب لوگ چلیں۔ (شاہ عبدالقادر) پھر بات یہ ہے کہ اے قریشیو! تم بھی وہیں سے پلٹو وہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

زمانہ جاہلیت میں قریش کا دستور تھا کہ حج میں یہ عام لوگوں کے ساتھ مقام عرفات پر کھڑے نہیں ہوتے تھے بلکہ تکبیر کی وجہ سے یہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے۔ رب قدوس نے ان کو اس طریقہ سے روکا کہ تم بھی لوگوں کے ساتھ ہی ٹھہرو اور وہاں سے ہی لوٹو وہاں سے اور لوگ لوٹتے ہیں۔ تم مزدلفہ ہی سے پلٹ کر نہ آ جاؤ۔ یہ مفہوم اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے بہت واضح ہے جب کہ دیگر تراجم میں اس طرح نہیں کیونکہ دیگر تراجم سے یہ نہیں پتا چلتا کہ یہ حکم قریش کو ہے یا اور لوگوں کو۔ جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: ثُمَّ آفِضُوا مِمَّا قَرَّيْشُ مِنْ حَيْثُ

أَفَاضَ النَّاسُ أَيْ مِنْ عَرَفَاتٍ بَانَ تَقْفُوا بِمَدَائِي بِعَرَفَاتٍ بِمَعْنَى مَعَ سَائِرِ النَّاسِ وَكَانُوا لَا يَقِفُونَ بِعَرَفَاتٍ وَكَانُوا يَقِفُونَ بِالْمَزْدَلِفَةِ تَرَفُّعًا عَنْ الْوُقُوفِ اءَ قَرَيْشِيو! تَمَّ يَهِي وَهِي سَ (عرفات) سے پلٹو وہاں سے لوگ پلٹتے ہیں۔ مدارک میں بھی ایسے ہی ہے: هَذَا مِنْ قَرَيْشٍ بِالْأَصْنَاةِ مِنْ عَرَفَاتٍ إِلَى جَمْعٍ وَكَانُوا يَقِفُونَ

بجمع وسائر الناس بعرفات ويقفون عن عطفان (سكان) حرم مزدلفہ میں قریش کو حکم ہے کہ تم بھی عرفات سے پلٹ کر مزدلفہ میں آؤ کیونکہ وہ مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے اور دوسرے لوگ عرفات میں ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم چونکہ حرم کے رہنے والے ہیں لہذا حرم سے نہیں نکل سکتے۔

هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ (پ ۴۹)

کیا وہ اس کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں (محمود الحسن) کیا لوگ یہی انتظار رکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں (شاہ عبدالقادر) یہ لوگ صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس آویں۔ (اشرف علی)۔

کیا اب وہ اس کے منتظر ہیں کہ اللہ بادلوں کا پتھر لگائے فرشتوں کے پرے ساتھ لیے خود سامنے آ موجود ہو (مولانا مودودی)۔

۴۹ (لوگ) تو بس اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ ان کے پاس خدا بادل کے سائبانوں میں آجائے۔ (عبدالماجد)

نہیں انتظار کرتے مگر یہ کہ آوے ان کے پاس اللہ بیچ سایوں کے بادلوں سے (شاہ رفیع الدین)۔

کا ہے کے انتظار میں ہیں مگر یہی کہ اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی ترجمہ اعلیٰ حضرت کا تفسیر کے مطابق ہے لیکن دوسرے تراجم میں یہ ذکر ہے کہ اللہ آئے، خود سامنے آ موجود ہو۔ سب تراجم اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اور تفسیر کے برخلاف ہیں۔ کسی مفسر نے خود اللہ تعالیٰ کے آنے کا ذکر نہیں کیا۔ توحید کے دعوے دار شان الوہیت کو سمجھنے میں قاصر ہے: الا ان یاسیم اللہ اى امده لقولہ وایاتی امر سبک اى عذابہ فی

ظلل جمع ظلة من الغمام السحاب (جلدین)

مگر یہی کہ اللہ کا امر آئے جس طرح دوسرے مقام پر اویسیائی امر کی بک ہے۔ وہاں بھی اس کا عذاب مراد ہے یعنی اللہ کا عذاب آئے چھائے ہوئے بادلوں میں: الا ان یاتیمم اللہ ای امرہ وباسہ (مدارک) یعنی اللہ کا امر اور عذاب آئے الا ان یاتیمم اللہ ای یاتیمم امرہ وباسہ (بیضاوی) مگر یہی کہ اللہ کا امر اور عذاب

فَاتَوَاحَرْتُكُمْ اَنِ شِئْتُمْ (پہلے ۶)

جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ (محمود الحسن)۔

سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو۔ (شاہ عبدالقادر)۔

تو آؤ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو۔ (علی حضرت)۔

اس مقام پر بھی ایک فرق تو یہ ہے کہ فاتوا، التیان سے ہے جس کا معنی آنا ہے نہ کہ جانا۔ البتہ اس کے دوسرے معانی میں سے ایک معنی کسی سے گزرنا۔ اس تو جہیزہ سے جانا معنی کیا جائے تو کچھ بات بنتی ہے۔ تاہم یہ وجہ کوئی اتنی اہم نہیں۔ زیادہ جو باعث گرفت بات ہے وہ یہ ہے کہ انی شئتم کا معنی۔ جہاں سے چاہو یہ سراسر تمام تفاسیر اور اصول فقہ کی جمیع کتب کے مخالف ہے اس لیے کوئی شخص اردو پر مکمل دسترس رکھنے والا کبھی تائید نہیں کر سکے گا کہ لفظ جہاں کیفیت کا معنی دیتا ہے بلکہ یہ مکانیت کا معنی دیتا ہے۔ اگر کسی آدمی کو یہ کہنا ہو کہ تولا ہو، کراچی، پشاور، اسلام آباد میں سے جس شہر میں جانا چاہے جاسکتا ہے۔ اسے یہ کہا جائے گا۔ تو جہاں چاہے جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف اگر یہ کہنا مقصود ہو تو سبق یاد کر چاہے بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر یا لیٹ کر۔ یعنی جس حال میں چاہے اسی طرح تو یاد کر سکتا ہے مقصود تو سبق یاد کرنا ہے۔ اب اس جملے کو اردو گرامر میں اس طرح بیان کیا جاتے، جہاں چاہے سبق یاد کر۔ یہ غلط ہے۔ اردو زبان کی مشہور کتاب فیروز اللغات نے بھی لفظ جہاں کا استعمال اس طرح کیا ہے۔ جہاں۔

جس جگہ جس وقت جس گھڑی۔

اب اس مسئلہ کو سمجھنے کے بعد اصل آیت کے مقصود کی طرف آئیں۔ آیت کریمہ میں اپنی عورتوں سے جماع کا ذکر ہے۔ عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دی ہے۔ عربی زبان میں لفظ انی بمعنی این کے بھی آتا ہے اور کیف کے بھی صرف لفظ انی کو دیکھنے سے تو دونوں معنی صحیح ہیں۔ لیکن جب یہ دیکھا جائے کہ انی بمعنی این (جگہ) کے لینے میں خرابی ہے تو یقیناً یہ ایسی غلطی ہے جس کی کوئی توجہ نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا کافی نہیں کہ یہودی عورت سے دبر کی طرف سے فرج میں وطی کرنے سے بچے کے بھیجنا ہونے کے قائل تھے۔ اس کا رد کیا ہے کہ دبر کی جانب سے وطی فرج میں کرنے سے یہ صورت نہیں۔ اس تفسیر سے انی کو بمعنی جہاں کے کرنا کیسے صحیح ہے۔ پھر بھی جس طرح ہی معنی کرنا صحیح ہوگا۔

اب اصل مسئلہ سمجھنے کے بعد دیکھیں۔ اسی مسئلہ کو نور الانوار نے اس طرح بیان کیا: ^{مثالہ} _{المشکل} قوله تعالى فاتواحرشکم انی شئتم فان کلمۃ انی مشکل تجئ تاسمة بمعنی من این کما فی قوله تعالى انی لک هذا ای من این لک هذا الرشق الا فی کل یوم وتساقی بمعنی کیف کما فی قوله تعالى انی یکون لی غلام ای کیف یکون لی غلام فاشبه ههنا انه بای معنی هو فان کان بمعنی این یکون المعنی من ای مکان شئتم قبلہ او قبل فتخل اللواطة من امرئته وان کان بمعنی کیف فیکون المعنی بایۃ کیفیۃ شئتم قائما او قاعدا او مضطجعا فیدل علی تعمیم الاحوال دون المعال فاذا تأملنا فی لفظ احرش علمنا انه بمعنی کیف لان الدبر لیس بموضع العرش بل موضع الفرات

اصول فقہ میں اسی کو مشکل کی مثال بنایا گیا ہے فاتواحرشکم انی شئتم۔ اس جگہ کلمہ انی مشکل ہے۔ کبھی این کے معنی میں آتا ہے جیسا قرآن پاک میں ہی استعمال ہے انی لک هذا حضرت زکریا نے حضرت مریم سے یہ سوال کیا کہ ہر دن آنے والا رزق

تمہارے پاس کہاں سے آتا ہے اور کبھی یہی لفظ انی بمعنی کیف کے آتا ہے جس طرح قرآن پاک میں آیا ہے : انی یکون لی غلام حضرت زکریا کو جب بیٹے کی نشأت دی گئی تو آپ نے کہا کہ میرا بیٹا کیسے ہوگا۔ اب مذکورہ مثال میں جب غور کیا کہ کس معنی میں لیا جائے کیونکہ یہاں اشتباہ ہوا۔ دیکھا کہ اگر انی کے معنی میں لیا جائے تو معنی یہ ہوگا جس مکان سے چاہو وہی کر سکتے ہو۔ اس طرح قبل اور دبر دونوں مکانوں کا ثبوت ہو گیا۔ اس طرح لواطت ثابت ہوگی۔ اگر بمعنی کیف کے لیں تو معنی یہ ہوگا جس طرح چاہو، کھڑے ہو کر، بیٹھ کر، لیٹ کر۔ یہ معنی عموم احوال پر دال ہوگا۔ لیکن عموم محلیت پر دال نہیں ہوگا۔ اب تامل کیا کہ لفظ حرث کا استعمال بمعنی کھیتی کے ہے تو خود واضح ہو کہ خطر کے معنی میں لینا ہی درست ہے اس لیے کہ مقام پیداوار قبل ہے نہ کہ دبر بلکہ دبر تو فقط ایک گندگی کا مقام ہے۔ اسی طرح مدارک میں ہے : فالتوا حرثکم انی شتمت جامعوهن مق شتمت انی کیف شتمت بارکۃ او مستلقتۃ او مضطجعة - ان سے جب چاہو جس طرح چاہو جماع کرو خواہ وہ حالت بروک، استلقا یا اضطجاع ہو۔ جلالین میں ہے فالتوا حرثکم ای محلتہ و هو المقبل انی کیف شتمت من قیام وقعود واضطجاع واقبال وادبار منزل رد القول الیہود من انی امرتہ فی قبلہما من جہۃ دبرہا جاء الولد احوال جماع فرج میں ہی ہو جس طرح چاہو حالت قیام ہو یا قعود واضطجاع ہو۔ خواہ آگے کی جانب سے یا پیچھے کی جانب سے ہو۔ یہود کا رد کیا گیا ہے کہ ان کا گمان تھا کہ اگر پھلی جانب سے جماع ہو تو بچہ احوال ہوگا۔ اب یہاں سے بھی واضح ہوا کہ صحیح معنی جس طرح ہے۔ اگر معنی جہاں کیا جائے تو ساری توجہات باطل ہوں گی۔ حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو ضرور ماننا پڑے گا کہ یہ معنی جہاں والا کرتا غلط ہے۔

و للمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین (پ ۳)

اس آیت کریمہ کے ترجمہ میں اعلیٰ حضرت پر بہت اعتراض کیا گیا ہے۔ جس انداز پر زبان استعمال کی گئی وہ اور اعتراض کی پوری تفصیل بیان کرتا ہوں تاکہ آپ کو جواب سمجھنے میں دقت درپیش نہ آئے۔

معرض کی بحث دیکھنے کے بعد تبصرہ تفاسیر کے آئینے میں دیکھیں۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر معرض کی بحث : طلاق شدہ عورت (عنوان) البقرہ میں طلاق کے احکام بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے طلاق شدہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان کے ساتھ احسان سے پیش آنے کا حکم بطور یاد دہانی کے مکرر فرمایا اور کہا : و للمطلقات متاع بالمعروف حقا علی المتقین اس جگہ مترجم حضرات نے متاع بالمعروف کا ترجمہ، کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا (تھانوی) فائدہ دینا ساتھ اچھی طرح کے (شاہ رفیع الدین) خرچ دینا ہے موافق دستور کے (شاہ عبدالقادر) کپڑے کے جوڑے وغیرہ سے کچھ سلوک کرنا (ڈپٹی تذیبرا احمد) کیا تاکہ اس آیت میں طلاق شدہ عورتوں کے حقوق واجبہ اور اخلاقی حسن سلوک کی تمام صورتیں شامل ہو جائیں۔ وہ صورتیں حسب ذیل ہیں :-

- ۱۔ مہر مقرر تھا اور اب خلوت و ملاقات کے بعد طلاق دے دی گئی تو اب عورت کو پورا مہر دیا جائے گا۔ اور تا عدت نان و نفقہ ادا کرنا واجب ہوگا۔
- ۲۔ مہر مقرر نہ تھا اور خلوت کے بعد طلاق دے دی گئی تو اب مہر مثل واجب ہوگا اور عدت کا نان نفقہ بھی۔
- ۳۔ مہر مقرر تھا اور خلوت سے پہلے طلاق دے دی گئی تو اب آدھا مہر واجب ہوگا۔

۴۔ لڑکی صغیرہ اور ناقابل خلوت ہے یا قابل خلوت ہے مگر خلوت نہیں ہوئی تو اب اسے کپڑا ایک جوڑا دینا واجب ہوگا اور اس پر عدت نہ

ہوگی۔ ان تمام صورتوں میں عورت کو فائدہ پہنچانا صادق آتا ہے کہیں پورے مہر کی صوت کہیں مہر مثل کی صورت میں اور کہیں آدھے مہر کی صورت اور آخری مسئلہ میں صرف ایک جوڑا کپڑے دینے کی صورت میں۔

اس آیت مذکورہ میں تمام صورتیں شامل ہیں اور قرآن کریم نے اس کے لیے ایک عام لفظ (مباح بالمعروف) استعمال کیا ہے لیکن مولانا احمد رضا خاں صاحب نے مباح بالمعروف کا ترجمہ یہ فرمایا ہے اور طلاق لینے والیوں کے لیے بھی مناسب تان نفقہ ہے یہ واجب ہے پرہیزگاروں پر۔ خاں صاحب کے ترجمہ کے مطابق مذکورہ چوتھی صورت بھی آیت کے حکم (نان نفقہ) میں شامل ہے کیونکہ وہ بھی طلاق والیوں میں شامل ہے حالانکہ یہ وہ طلاق والی ہے جس پر عادت واجب نہیں تو پھر شرعی نان نفقہ کید بطور حسن سلوک کے صرف کپڑے کا ایک جوڑا دینا کافی ہے ہو سکتا ہے کہ مولینا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرحوم نے پیروی کی ہے لیکن بقول رضا خانی حضرات کے جس مجتہد و فقیہ بے مثال نے فتاویٰ رضویہ کے نام سے بارہ ہزار صفحات پر مشتمل فقہی مسائل کا خزانہ امت کے لیے چھوڑا ہو اس کی نظر آیت پاک کی اس باریکی کی صورت کی طرف کیوں نہیں گئی اور آیت کے مفہوم کو ایک صورت میں خاص کر کے آیت کی حقیقی روح کو بے اثر کر دیا۔ اس پر تعجب ہوتا ہے۔ حضرت شاہ عبد القادر صاحب کا مختصر تفسیری حاشیہ ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ قرآن فہمی کی خداداد صلاحیت کیا چیز ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں۔ پہلے خروج فرمایا تھا یعنی جوڑا اس طلاق پر کہ مہر نہ ٹھہرا ہو اور ہاتھ نہ لگایا ہو۔ یہاں سب پر حکم فرمایا، سب طلاق والیوں کو جوڑا دینا بہتر ہے اور اس پہلی کو ضرور ہے۔ شاہ صاحب بتانا چاہتے ہیں کہ طلاق شدہ عورت کو مہر واجب کے ساتھ ساتھ کپڑے کا جوڑا دینا بھی مختصن ہے تاکہ علیحدگی کے باوجود آپس میں صلح و احسان کے جذبات موجود رہیں۔ اور پہلی صورت میں یہ جوڑا دینا اور کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچانا ضروری ہے۔ امید کی جاسکتی تھی کہ محشی مرحوم اس آیت پر تشریحی نوٹ لکھ کر مسئلہ

کو صاف کرتے لیکن مرحوم محشی بھی یہاں سے صاف پنج کزنکل گئے اور قرآن کریم کی ایک فقہی آیت کا ترجمہ تشنہ رہ گیا۔ میں نہیں چاہتا کہ خاں صاحب مرحوم کے ترجمہ کا علمائے دیوبند کے تراجم اور تفاسیر سے موازنہ کر کے اپنے رضا خانی بھائیوں کو تکلیف پہنچاؤں لیکن جو حضرات علمی مسائل کو علمی مسائل کی نظر سے دیکھتے ہیں ان سے گزارش ہے کہ وہ حضرات شیخ الہند کا تفسیری حاشیہ اور مولانا اشرف علی خاں صاحب بھٹانوی کی بیان القرآن اور مولینا عبدالحق صاحب خفانی کی تفسیر خفانی کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ ان حضرات نے الیقہ کی قانونی آیات طلاق کو قانونی اسلوب و انداز میں کس سلیقہ سے واضح کیا ہے اور کتنا الامان ان تفاسیر کے مقابلہ میں ایک سطحی اور طالب علمانہ تفسیر نظر آتی ہے۔ (معرض کی بحث ختم)

تبصرہ
سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اعحضرت پر یہ اعتراض کرنا کہ آپ فقہ کی باریکیوں سے بے خبر ہیں، خود معرض صاحب نے جو چوتھی صورت مطلق ذکر کی ہے مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی۔ وہ محل نظر ہے کیونکہ لڑکی صغیرہ اور ناقابل خلوت ہے اور مہر مقرر تھا تو طلاق کی صورت میں نصف مہر ہے صرف جوڑا کپڑوں کا دینا کافی نہیں۔ ہاں اگر مہر مقرر نہ ہو تو یہ صورت ہے لیکن معرض صاحب نے مہر کے مقرر ہونے یا نہ ہونے کی کوئی قید نہیں لگائی۔ اسی طرح یہی دو صورتیں اس عورت میں بھی ہیں جو قابل خلوت تو ہے لیکن اس کو طلاق قبل از خلوت دیجائے تو مہر مقرر ہونے کی صوت میں نصف مہر اور مہر کے مقرر نہ ہونے کی صورت میں متعہ کپڑوں کا جوڑا، لیکن معرض صاحب کی عبارت سے یہ سمجھ آ رہا ہے کہ صغیرہ لڑکی کو ہر حال میں کپڑوں کا جوڑا دیا جائیگا حالانکہ مہر کے مقرر ہونے کی صورت میں یہ غلط ہے : وان تزوجھا ولم یسما لھا مہرا او تزوجھا علی ان لا مہر لھا فلھا مہر مثلھا ان دخل بہا او مات عنها ولو طلقھا قبل الدخول بہا فلھا المتعہ لیس لھا مہر نکاح کیا لیکن مہر مقرر نہیں کیا یا نکاح ہی اس شرط پر کیا کہ مہر نہیں دیا جائے گا۔ ایسی صورت میں اس عورت طلاق دخول

کے بعد دی گئی یا اس کا خاوند فوت ہو گیا تو اس عورت کو مہر مثل دیا جائے گا۔ فوت ہونے کی صورت میں دخول عدم دخول کی ذی نہیں۔ اگر اسی صورت میں یعنی مہر مقرر نہیں کیا گیا تھا یا مہر کی نفی کر دی گئی تھی تو طلاق دخول سے پہلے دیدی گئی تو کپڑوں کا جوڑا دینا واجب ہوگا۔

دوسری بات یہ سمجھیں کہ مقرض صاحب نے خود اعتراف کیا ہے کہ میں نے اپنے ہی حضرات کے تراجم اور تفسیر کو دیکھا جو اردو زبان میں ہیں کیونکہ وہ خود لکھتے ہیں کہ ہو سکتا ہے مولانا بریلوی کے سامنے کوئی ترجمہ ایسا بھی ہو جس کی مرحوم نے پیروی کی ہے۔ یہ اعتراف حقیقت ہے جس کی وضاحت ابھی آتی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس آیت کریمہ کا فقہی مسائل سے تعلق ہے جس کا اعتراف مقرض صاحب نے برملا کیا ہے۔ لہذا فقہی مسائل کی تفسیر احاف کی پیش کردہ ہی فقہ حنفی میں مقبہ ہوگی۔ آئیے! احاف کی مقبہ تفسیر مدارک کو دیکھیں۔ آپ نے اس طرح تفسیر کی :

وللمطلقات ستاع ای نفقة العدة کہ متاع سے مراد عدت کا نفقہ ہے۔ اب یہ کہنا کہ یہ ترجمہ جو بھی صورت کو شامل نہیں کہ وہاں عدت نہیں۔ یہ فقہی باریکی سے بخبری ہے۔ یہ غلط ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے جب کہ علحضرت کا ترجمہ تفسیر مدارک کے عین مطابق ہے۔ تو جب یہ کہا جائے گا کہ کثر الایمان ایک طالب علمانہ تفسیر ہے تو اس سے یہ کہنا خود بخود لازم آئے گا کہ مدارک بھی ایک طالب علمانہ تفسیر ہے لیکن ایک ایسے محقق و مدقق کو طالب علم کی حیثیت دینا جن کی کتاب منار اور کثر الذقائق کو درس نظامی کے کورس میں داخل کیا ہوا ہے یہ سورج کے سامنے منہ چڑھانے کے مترادف ہے۔ اور اپنی جہالت و حماقت کا اعتراف کرنا ہے۔

اور اگر مطلقاً کچھ نفع دینا معنی کیا جائے تو اس میں تکرار ہے کیونکہ وہ عورت جس کا مہر مقرر نہیں کیا گیا اور خلوت بھی نہیں اس کو متعہ رکپڑوں کا جوڑا دینا تو مالہ تسوہن اور نفقہ منویہن ہر بیعتہ و منعوتہ میں آچکا ہے۔ یہ پھر تکرار ہے۔ اسی وجہ سے حاشیہ خلائین میں ہے وضمنی صاحب العدا ملک المتاع بنفقة

العدة فلا تنکس اس یعنی صاحب مدارک نے متاع کا معنی عدت کا نان نفقہ لیا ہے لہذا اس میں کوئی تکرار نہیں۔ تفسیر کے مطالعہ سے تو علحضرت کے ترجمہ کی فوقیت واضح ہوتی ہے۔ لیکن جس شخص کے علم کا محور شیخ الحداد کا تفسیری حاشیہ در بیان القرآن اور تفسیر حقانی ہو وہ نہ سمجھ سکے تو کوئی اعتراض بھی نہیں کیونکہ کم علم کو معذوری سمجھنا چاہیے۔ البتہ جہل مرکب کے حامل کو سمجھنا بھی ممکن نہیں لیکن اگر خدا اور عناد کو چھو کر حقیقت پسندی کی طرف آنا ہو تو معتبر تفسیر کی عبارات کو علحضرت کے ترجمہ کی تائید پر پیش کر رہا ہوں تاکہ حق راہ نظر آئے اور محققین کو طالب علمانہ حیثیت دینے کی حماقت گرتے سے اجتناب کیا جائے ورنہ ان مفسرین کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ اور اپنی حماقت ثابت ہو جائے گی۔

البحر المحیط میں ہے : وقيل لسراد بالمتاع ههنا نفقة العدة متاع سے مراد عدت کا نفقہ ہے۔ یہاں سے بھی پتا چلا کہ نان نفقہ ترجمہ علحضرت کا ہی نہیں بلکہ اس میں اور باب تفسیر بھی شریک ہیں۔ الجامع لاحکام القرآن نے بھی اختلاف بیان کرتے ہوئے مقرض صاحب کی جو بھی صورت کو ایک قول میں خاج کیا ہے۔ الجامع کی عبارت کو ملاحظہ کریں : وقال عطاء ابن سباح وغيره هذه الايتة في الثيبات اللواتي قد جو معن اذ تقدم في غير هذه الايتة ذكر بيت للنتعة اللواتي لحد دخل بهن عطار وابن رباح وغيره نے کہا ہے کہ یہاں ان عورتوں کے بارے میں ہے جن سے جماع کیا گیا ہو، شبہ ہوں۔ اس لیے کہ جن عورتوں سے دخول نہیں ہوا ان کے متعہ کا پہلی آیت میں ذکر آچکا ہے تفسیر منظر میں ہے : قيل لسراد بمتاع في هذه الايتة نفقة ايام العدة كما هو المراد فيما سبق من قوله تعالى وصية لادنوا جهم متاعا الى الحول بجامع ان السرة في كل الصورتين الموت والطلاق محبوسة لحقوق الزوج فيجب الاتفاق في مله متاع سے مراد زمانہ عدت کا نان و نفقہ مراد ہے جیسا کہ پہلے اللہ تعالیٰ کے قول وصية لادنوا جهم متاعا الى الحول میں عدت کے نان و

لفقہ کا بیان ہے۔ دونوں صورتوں یعنی موت و طلاق میں وجہ جابح یہ ہے کہ عورت چونکہ دورانِ عدت اپنے آپ کو حقوقِ زوج میں پابند رکھتی ہے اس لیے خاوند کے مال سے اس کا نفقہ لازم ہے۔ اسی طرح روح المعانی میں ہے: وقيل المراد بالمتاع نفقة الحدة متاع سے مراد عدت کا نان و نفقہ ہے۔

ناظرین کرام! آپ نے مذکورہ بالا عبارات سے سمجھ لیا ہو گا کہ اس آیتِ کریمہ میں متاع کا ترجمہ نان و نفقہ کرنے میں اعلیٰ حضرت منفر نہیں بلکہ اکابرین مفسرین کرام کے اقوال بھی موجود ہیں۔ اب مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے جویش عتاد کی وجہ سے جنبشِ قلم کی زد میں اکابرین مفسرین کرام کو بیٹھنا کہاں کا انصاف ہے۔ میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا۔ یہ کہنا "کہ ہو سکتا ہے کوئی ترجمہ ایسا ہو" اس سے پہلے تفاسیر کو دیکھ لیا جائے تاکہ بعد میں خود ہی صیاد اپنے دام میں نہ پھنس جائے۔

تطف کی بات یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق ہے لیکن اس کی تعریف کر دی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض۔ یہ انصاف سے بعید ہے خیال کریں، مناسب نان و نفقہ یا خرچ دینا ہے موافق کتب دستور کے، ان میں کتنا فرق ہے۔

وَالْاُخْلَةُ وَالْاَشْفَاعَةُ (پ ۳۶)

اور نہ آشنائی اور نہ سفارش (محمود الحسن)

نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ (مولانا مودودی)

اور نہ دوستی اور نہ سفارش (عبد الماجد)

اور نہ آشنائی سے اور نہ سفارش (شاہ عبدالقادر)

اور نہ دوستی اور نہ سفارش ہو سکے۔ (فتح محمد)

اور نہیں دوستی اور نہیں سفارش۔ (شاہ رفیع الدین)

نہ (کافروں کے لیے) دوستی اور نہ شفاعت۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں دوستی اور شفاعت کو کافروں کے ساتھ تخص کیا گیا ہے۔ جب کہ دوسرے ترجمہ میں عام طور پر نفی کی گئی ہے جس سے یہ پتا نہیں چلتا کہ مسلمانوں کی شفاعت ہو سکے گی یا نہیں۔ آئیے تفاسیر کی نظر میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو روز روشن کی طرح عیاں ہو گا کہ جس مسئلہ کو تفاسیر نے اعتراضات و جوابات کی شکل میں پیش کیا ہے اعلیٰ حضرت نے اس کو ایک لفظ کی زیادتی سے بیان فرما دیا ہے۔

ولا خلة صداقة تنفع (جلالین) دوستی نہیں ہوگی جو کسی کو قیامت میں نفع پہنچائے۔ قوله صداقة تنفع دن الخلة لا تنفع يوم القيمة بين الاخلاء

الا بين المتقين لقوله تعالى الاخلاء يومئذ بعضهم لبعض عدو الا المتقين (حاشیہ جلالین) دوستی کسی کے لیے قیامت میں نفع مند نہیں ہوگی سوائے المتقین کے۔ کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس دن دوست ایک دوسرے کے دشمن ہونگے سوائے متقین کے: ولا شفاعت بغیر اذن و هو يوم القيمة

(جلالین) اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر قیامت کے دن کسی کو شفاعت کرنے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔ قوله بغیر اذن هو جواب سوال کیف يصم نفی الشفاعة

على سبيل الاستعاضة وقد ثبتت شفاعته الا نبياً يوم القيمة بالاحادیث كحديث انس سالت النبي صلى الله عليه وسلم ان يشفع لي يوم

القيمة فقال انا فاعل حسنة الترمذی وایضا ح ان الاية مقيدة لا من اذن له الرحمن وسمی له قوله والنبي ما ذون له وایضا ذن فی ذن

د (جمل) مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے بغیر اذن کی قید کا کیوں اضافہ کیا؟ اس لیے کہ یہ ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ مطلقاً شفاعت

کی نفی کیسے کی گئی ہے کہ کسی کو کسی کی شفاعت کام نہیں آئے گی حالانکہ حدیثِ پاک انبیائے کرام کی شفاعت کا ثبوت ہے کہ ان کو قیامت کے دن یہ حق حاصل ہوگا جیسا

کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال

کیا کہ قیامت کے دن آپ میری شفاعت فرمائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ میں شفاعت کروں گا۔ (ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے)۔

واضح ہو کہ آیت کریمہ مقتدیہ ہے کہ جس کو رب کی طرف سے اجازت ہوگی اور رب نے جس کی بات کو پسند کیا وہ شفاعت کر سکے گا۔ اسی وجہ سے انبیائے کرام کو شفاعت کی اجازت ہوگی۔ اگر انبیائے کرام شفاعت کی اجازت طلب کریں پھر بھی ان کو اجازت دی جائے گی لیس لا یموت من یشتفع عندہ الا باذنہ وهو بیان ملکوتہ وکعبیائہ وان احدا لا یتماثلک ان یتکلم بکرم القیمۃ الا اذا اذن له فی الکلام وفیہ سئل عن الکفاس ان الاله صام فیشفع لہم۔ (مدارک) کسی ایک کو رب کے پاس اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی بادشاہی اور اس کی کبریائی کا ذکر ہے کہ قیامت کے دن کسی کو اس کی اجازت کے بغیر اس سے کلام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

اس سے کافروں کا رد کیا جا رہا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے بڑے ہماری سفارش کریں گے۔ یہاں سے بھی واضح ہو کہ رب تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہیں وہ سفارش نہیں کر سکتے۔ والشفاعة ثابتہ للرسول والاعیان فی حق اہل الکتاب والامستفیض من الاخبار خلاف المعتزلۃ (شرح عقائد) رسول اور انبیاء کو شفاعت کا حق گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے لیے اخبار مشہورہ سے ثابت ہے اس میں معتزلہ کا خلاف ہے۔ قولہ علیہ السلام قولہ علیہ السلام شفاعتی لکل الکبائر من امتی وهو مشہور بل الشہادۃ فی باب الشفاعۃ متواترۃ (شرح عقائد) نبی کریم کا ارشاد کہ میری شفاعت میری امت کے گناہ کبیرہ کے مرتکبین کے لیے بھی ہوگی یہ حدیث مشہور ہے بلکہ احادیث شفاعت متواترۃ المعنی ہیں۔ والاخبار سے مراد کون لوگ ہیں نیز اس میں ہے: وہو الملئکۃ والصلحاء والشہداء وہ فرستے اور نیک لوگ اور شہید لوگ۔ نیز اس کے اسی مقام پر جاثیہ میں ہے:

بقال الغفرانی اعلم انہ اذا حق دخول النار علی طوائف من المومنین فان الله تعالیٰ بفضلہ یقبل فیہم شفاعۃ الانبیاء والصلیقین بل شفاعۃ العلماء والصلحیین وکل من له عند الله تعالیٰ جاه وحسن معاملۃ فانہ شفاعتی اہلہ وقربائہ واصدقائہ ومعاصمہ فکل حریصا علی ان یتکلم لنفسک عندہ من تبت الشفاعۃ علامہ غزالی فرماتے ہیں جب یہ حقیقت ہے کہ مومنوں کا ایک گروہ (گنہگار) جہنم میں جائیں گے بے شک اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کے لیے انبیاء اور صدیقین کی شفاعت قبول فرمائے گا بلکہ علماء اور نیک لوگ، ہر وہ شخص جو اللہ کا مقرب ہے اور اس کا معاملہ سے اللہ تعالیٰ سے اس کی طرف سے یہ حق دیا جائے گا کہ وہ اپنے اہل اقرباء، احباب اور اپنی شناخت والے لوگوں کی شفاعت کر سکیں۔ لہذا اے عام مخاطب تو بھی ان کے ہاں اپنی ذات کے لیے مرتبہ شفاعت حاصل کرنے میں حریص ہو جا۔ شفاعت کا ذکر احادیث میں بہت بساطت سے کیا گیا ہے۔ یہاں تو مختصر کے پیش نظر اس پر بحث نہیں کی جا رہی ورنہ یہی باب ایک ضخیم کتاب کو مستلزم ہے۔ ایک مختصر حدیث پر اکتفا کیا جاتا ہے: عن عثمان بن عفان قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم یشفع یوم القیمۃ ثلثۃ الانبیاء شہداء العلماء شہداء الشہداء (سوادہ ابن ماجہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے دن تین حضرات انبیائے کرام علماء، شہداء اور شفاعت کریں گے تین کا ذکر اتفاقی ہے۔ ان تین میں انحصار نہیں: شافعوا وشفعوا تو آپ نماز جنازہ میں پچوں کے لیے دعائیں بھی پڑھتے ہیں چہاں ان کی شفاعت کرنا اور مقبول ہونے کی خود دعا کرتے ہیں۔ اب حقیقت حال واضح ہو چکی ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں کیا خوبیاں پنہاں ہیں۔

فَبِمَتِ الَّذِیْ کَفَرَ (پ ۳۶)

تب حیران رہ گیا وہ کافر (محمود الحسن)۔

یہ سن کر وہ متحیر رہ گیا۔ (مولانا مودودی)۔

اس پر وہ جو کافر تھا دنگ رہ گیا۔ (عبد الماجد)۔

اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر۔ (مولانا اشرف علی)۔

تب حیران رہ گیا وہ متحیر۔ (شاہ عبدالقادر)۔

یہ (سن کر) کافر حیران رہ گیا۔ (فتح محمد)۔

تو ہوش اڑ گئے کافر کے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرد کو لایا جواب کرنے کا ذکر ہے کیونکہ جب فرد کو آپ نے یہ فرمایا کہ میرا اللہ تعالیٰ تو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اس نے دو قیدیوں کو بلا کر نرے موت پانے والے کو بری کر دیا اور بری ہونے والے کو قتل کر دیا۔ کہا اگر میں ایسا نہ کرتا تو قتل ہونے والا زندہ رہتا اور زندہ رہنے والا قتل ہو جاتا۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اس بتی کی حماقت کو دیکھا کہ سمجھنے کی اہلیت سے محروم ہے تو آپ نے دوسری دلیل پیش فرمادی کہ میرا رب تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اور تو مغرب سے نکال۔ وہ کافر جواب دینے سے عاجز آ گیا۔ اسی بات کو رب قدوس نے ذہنت الذی کہتا ہے ذکر فرمایا۔

اب آپ دیکھیں کہ یہ ترجمہ کرنا کہ کافر حیران رہ گیا، ہشدر رہ گیا، دنگ رہ گیا یہ اس لیے مقصد کو مکمل طور پر واضح نہیں کر رہا کہ اردو زبان میں لفظ حیران کبھی مقام پر بھی بولا جاتا ہے جیسے کبھی خوب صورت مقام کو دیکھ کر کہا جائے میں اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ یہاں تو معنی لایا جواب ہوتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ”تو ہوش اڑ گئے کافر کے“ یہ صرف اسی معنی کو شامل ہے کہ وہ جواب دینے کی ہمت نہ کر سکا خجیر و دھشت (مدارک جلالین) تفاسیر نے بھی متحیر و مدہوش کیا۔ یعنی اس کے ہوش اڑ گئے۔

الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ (پ ۳)

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا۔ (محمود الحسن)۔

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگی کا۔ (شاہ عبدالقادر)۔

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو فقر کا۔ (شاہ رفیع الدین)۔

شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر مقصد کے قریب ورتفا سیر کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ نظر آتا ہے

يَعِدُكُمُ الشَّيْطَانُ الْفَقْرَ (تفاسیر جلالین) وہ تمہیں خوف دلاتا

ہے اگر تم نے صدقہ دیا تو محتاج ہو جاؤ گے۔ لہذا ایسا مال اپنے پاس ہی محفوظ

رکھو۔ يَعِدُكُمْ بِالْاِنْفَاقِ الْفَقْرَ وَيَقُولُ لَكُمْ اِنْ اِنْفَاقَكُمْ اَنْ تَقْتَدِرُوا

وَالْوَعْدُ يَسْتَعْمَلُ فِي الْخَيْرِ وَالْشَّرِّ (مدارک) شیطان تمہیں

خرچ کرنے سے ڈراتا ہے محتاجی سے اور تمہیں کہتا ہے کہ تمہارے خرچ کرنے کا

انجام تمہارا محتاج ہونا ہے۔ اس سے آگے ایک ضابطہ کی طرف اشارہ کیا کہ وعدہ کا

لفظ تحیر اور شرم دونوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی اگر تحیر میں استعمال ہو تو جواب اور

اچھائی کی امید دلاتا، اور شرم میں استعمال ہو تو مجنی و عید ہو گا یعنی ڈرانا۔ اس سے

پتا چلا کہ شیطان تمہیں اندیشہ دلاتا ہے محتاجی کا، یہ معنی یہ نسبت ”وعدہ دیتا ہے“

کے زیادہ ادراک کے قریب ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ یہ مقام شرم ہے اس لیے

اَوْذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ (پ ۴)

یا قبول کرو گے کوئی مدت۔ (محمود الحسن)۔

یا قبول کرو گے کوئی مدت۔ (شاہ عبدالقادر)۔

یا منت مانو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

نذر، منت کو قبول کرنا۔ عام اردو محاورہ وصول کرنے کو کہا جاتا ہے لیکن یہاں پورا مفہوم ماقبل کا اور ان الفاظ مبارکہ کا یہ ہے۔ اللہ کی راہ میں جو مال تم خرچ کرو (زکوٰۃ، صدقات) یا نذر مانو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے (تمہیں جزا دیگا) اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔ ظالموں سے ہمدرد زکوٰۃ نہ دینا، نذر کو پورا نہ کرنا یا مال ناجائز کاموں میں خرچ کرنا یا معاصی کی نذر ماننا۔

اب اس وضاحت کے بعد تفاسیر کو دیکھیں: او مذی تم من نذر بشرط او یخیر شی طی طاعة او معصية فان الله يعلمه فيجازيكم عليه یعنی تم کوئی نذر مانو بشرط سے متعلق ہو یا نہ ہو، خواہ نذر نیک کام کی ہو یا بد کی اللہ تعالیٰ اس کا اسی کے مطابق بدلہ دیگا او مذی تم من نذر فی طاعة الله او فی معصيته فان الله يعلمه لا یخفی علیہ یجازیکم علیہ (مدارک) یعنی کوئی نذر تم مانو نیک کام میں ہو یا معصیت میں، اللہ پر مخفی نہیں وہ تمہیں اس کا ایسا ہی بدلہ دے گا۔

اب بخوبی واضح ہوا کہ منت ماننا معنی اس مقام کے مناسب ہے، منت قبول کرنا مناسب نہیں۔

وَاصْطَلَفَ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ (پ ۹)

اور جہان کی عورتوں کو منتخب کیا ہے۔ (فتح محمد)۔
اور برگزیدہ کیا تم کو اوپر عورت عالموں کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں پر۔ (محمود الحسن)۔
او تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لیے چن لیا۔ (مولانا مودودی)۔

اور آپ کو دنیا جہان کی عورتوں کے مقابلہ میں برگزیدہ کر لیا ہے۔ (عبدالحمید)
اور تمام جہان کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے۔ (مولانا اشرف علی)

اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں سے (شاہ عبدالقادر)۔

اور آج سارے جہاں کی عورتوں سے تجھے پسند کیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں حضرت مریم علیہا السلام کو خطاب ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں لفظ ”آج“ کی زیادتی ہے جو بظاہر وہم واقع ہوتا ہے۔ اس کا تفسیر نے بھی ازالہ کیا اور اس وہم کے ازالہ کے لیے تفسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت نے بھی ایک لفظ کی زیادتی کی۔ وہ یہ وہم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو تمام جہان کی عورتوں پر فضیلت کیسے حاصل ہے حالانکہ حضرت فاطمہ اور حضرت عائشہ پر حضرت مریم کو فضیلت حاصل نہیں۔

اس کا جواب دیا گیا ہے اہل نعمانک (جلالین) یعنی تمہیں اپنے زمانے کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اسی مقام پر جلالین کے حاشیہ پر وضاحت موجود ہے۔

وَاصْطَلَفَ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ اى بان وهب لك عيسى من غير اب ولم يكن ذلك لاحد من النساء هذا وان كان من خصائص من جبر علیہا

السلام لکن لا یلزم من هذه الفضيلة افضليتها مطلقا على فاطمة بنت

محمد صلى الله عليه وسلم وعائشة زوجة النبي صلى الله عليه

وسلم ففاطمة وعائشة رضی الله عنهما افضل نساء العالمين

من الاولين والآخرين۔ کما هو المذهب المحقق عند العلماء یعنی مفسر

الرحمۃ نے اہل زمانہ کے الفاظ کو کیوں زیادہ کیا۔ اس لیے کہ حضرت مریم کو بغیر باپ

کے حضرت عیسیٰ کا عطا ہونا اگرچہ آپ کی خصوصیت ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا

کہ آپ کو مطلقاً حضرت فاطمہ بنت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ زوجۃ النبی صلی

اللہ علیہ وسلم پر بھی فضیلت حاصل ہو۔ اگرچہ یہ خصوصیت تو ان دونوں کو حاصل نہیں لیکن

ان دونوں کو کثرتِ خصائل حاصل ہیں جو احادیث مبارکہ میں وارد ہیں جو فضائل حضرت

مریم میں نہیں پائے جاتے پس فاطمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما کو تمام جہان کی عورتوں

پر فضیلت ہے۔ اس پر علماء کی تحقیق و اتفاق موجود ہے۔ یہ وجہ تھکی جس کا مفصل

بیان اعلیٰ حضرت کے ایک لفظ سے سمجھ میں آتا ہے لیکن اگر مطلقاً عام تراجم کی طرح

ترجمہ کیا جاتا تو اعتراض کا اندفاع ممکن نہیں تھا۔

نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ (پ ۳۶، ۳۷)

ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کی۔ (محمود الحسن)۔ ہم اللہ کے مددگار ہیں (موسیٰ)
ہم ہیں اللہ کے مددگار (عبدالماجد)۔ ہم ہیں مدد کرنے والے اللہ کے (شامی و لقاوی)
کہ ہم ہیں مدد دینے والے اللہ کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں ذکر کیا جا رہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ کون شخص ہے جو اللہ کے دین میں میری مدد کرے گا۔ آپ کے حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے دین کی مدد کریں گے۔ اب اس مخفوم کو ان الفاظ میں ادا کرتا کہ ہم ہیں اللہ کی مدد کرنے والے۔ یہ نظام بہت بڑی غلطی کا عام آدمی کے لیے سبب بن جاتا ہے کیونکہ عام لوگ صرف ترجمہ کو دیکھ کر خود بخود مطالبہ حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں جو یقیناً اس سے مطلب حاصل کریں گے کہ معاذ اللہ اللہ تعالیٰ ابھی مدد کا محتاج ہے لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے ”ہم دین خدا کے مددگار ہیں“ تو اس میں یہ وہم نہیں ہوتا بلکہ مطلب صاف واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو دین خدا کے پھیلانے میں مدد کرنے کا ارشاد فرمایا اور اسی کا انھوں نے جواب دیا کہ ہم دین خدا کے مددگار ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ہی تفاسیر بھی واضح کرتی ہیں: نحن انصار اللہ اعوان دینہ (مددگار) ہم اس کے دین کے مددگار ہیں۔ بحیثیتہ ان الفاظ سے ہی جلالین میں تفسیر کی گئی ہے۔

وَمَكْرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَكْرِينَ (پ ۳۶)

اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا مکر سب سے بہتر ہے۔ (محمود الحسن)۔

فریب کیا ان کافروں نے اور فریب کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ (شاہ محمد انصاری)۔

(یعنی یہود قتل عیسیٰ کے بارے میں) ایک چال چلے اور خدا بھی (عیسیٰ کو بچانے کے لیے) چال چلا اور خدا خوب چال چلنے والا ہے۔ (فتح محمد)۔
اور مکر کیا انھوں نے یعنی کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی اور اللہ سب سے بہتر تدبیر والا ہے (اعلیٰ حضرت)

اس آیت کریمہ کا ترجمہ کرتے وقت عام مترجمین نے اس مقام کی نزاکت کو نہیں سمجھا اور براہ راست مکر، فریب، دھوکا، دغا، داؤ جیسے الفاظ کی نسبت ربّ قدّوس بے عیب ذات کی طرف کردی۔ عام انسان جو مفسرین کرام کے کلمات سے بے خبر ہے ضرور یہ سمجھے گا کہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ مکار، دھوکا باز وغیرہ ہے (معاذ اللہ) اسی وجہ سے مفسرین کرام نے اس مقام پر نہایت غور و فکر کے بعد بتایا کہ یہاں مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کیسے ہے: وَمَكَرَ اللَّهُ عِبَارَةً عَنْ الْاِخْتِيَالِ فِي الْاِصْطِلَاحِ وَالْاِحْتِيَالِ عَلَى اللَّهِ تَعَالَى مُحَالٌ فَصَارَ لِفِظِ الْمَكْرِ فِي حَقِّهِ مِنَ الْمُمْتَنَبِهَا تِ وَذَكَرُوا فِي تَاوِيلِهِمْ وَجْهًا اَحَدًا هَآءِ تَعَالَى سَمَى جَزَاءَ الْمَكْرِ مَكْرًا كَقَوْلِهِ تَعَالَى وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا سَمَى جَزَاءَ الْمَخَادَعَةِ بِالْمَخَادَعَةِ وَجَزَاءُ الْاِسْتِهْزَاءِ بِالْاِسْتِهْزَاءِ وَالثَّانِي اَنْ مَعَامَلَةَ اللَّهِ مَعَهُمْ كَانَتْ شَبِيهَةً بِالْمَكْرِ فَمِنْ بَذَلِكَ - وَالثَّالِثُ اَنْ هَذَا الْفِظُ لَيْسَ مِنَ الْمُمْتَنَبِهَا تِ لِأَنَّهُ عِبَارَةٌ عَنْ التَّدْبِيرِ الْمَحْكَمِ الْكَامِلِ ثُمَّ اخْتَصَّ فِي الْحَرْفِ بِالتَّدْبِيرِ فِي الْاِصْطِلَاحِ الشَّرَّاحِي الْغَيْبِ وَذَلِكَ فِي حَقِّ اللَّهِ تَعَالَى غَيْبٌ مُمْتَنِعٌ وَاللَّهُ اَعْلَمُ (کبیر)
اعتراض یہ ہوا کہ مکر کا معنی ہوتا ہے کہ کسی کو شہر پہنچانے میں جیلہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کا ایصالِ شرم میں جیلہ کرنا محال ہے۔

جواب : یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی شان میں استعمال ہونے سے قسا بہات سے ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں کی گئیں۔ ایک یہ ہے کہ یہاں جزاء مکر کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے جس طرح قرآن پاک میں جزاء سیدہ کو سنیہ کہا گیا ہے۔ اسی ضابطہ کے مطابق جزاء مخادعہ کو مخادعہ سے اور جزاء استہزار کو استہزار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اس تاویل کے مطابق مکر اللہ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکر کی جزا دیتا ہے۔ دوسری تاویل یہ کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ایسا معاملہ فرماتا ہے کہ جو ان کے مکر کے مشابہ ہوتا ہے یعنی مکر کا اصل مطلب یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچانے میں خفیہ طور پر حیلہ کرنا جس سے وہ بے خبر ہو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو اس فعل کی جزاء دیکھا جس جزا (عذاب) سے وہ بے خبر ہیں۔

تو اس طرح مکر کی مشابہت ہوئی کیونکہ ہر کسی ایک صورت میں کافی ہوتی ہے وہ فقط خفیہ ہے۔ انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا حیلہ ان سے مخفی رکھا اللہ تعالیٰ کا عذاب ان سے مخفی ہے۔ اب اس صورت میں مکر اللہ کا معنی ہوا اللہ تعالیٰ ان کے مکر کا معاملہ ان سے ایسا ہی فرمائے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ یہ لفظ مشابہات سے نہیں بلکہ اس کا معنی تدبیر محکم و کامل۔ پھر عرف میں اس کا معنی مختص ہو گیا کہ کسی کو عذاب پہنچانے، ہلاک کرنے میں خفیہ تدبیر کرنا اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں منتہی نہیں۔ اب تفسیر کبیر کی اس بحث کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں آپ کا ترجمہ اسی تیسری صورت کے عین مطابق ہے کہ اللہ نے ان کے ہلاک کی خفیہ تدبیر فرمائی۔ لیکن باقی تراجم کو بھی دیکھا جائے کہ ان تینوں صورتوں میں کسی کے مطابق بھی نہیں ہیں۔ جب تراجم کا مقصد عام اردو دان کو سمجھانا مقصود ہے وہی ترجمہ اس کو راہ راست پر لاسکتا ہے جس میں وہ غلطیوں میں واقع ہو کر اللہ تعالیٰ پر عیب ثابت کرنے شروع نہ کر دے۔ اسی طرح ۱۹ء میں بھی تراجم میں فرق موجود ہے۔ اسی طرح ۲۰ء کے ترجمہ میں بھی مترجمین نے ایسی ہی غلطی کی۔

اِنْ مَّتَوْفِيكَ (پہلے)

میں لے لوں گا تجھ کو۔ (محمود الحسن) اب میں تجھے واپس لے لوں گا (موردی) لے عیسیٰ میں تم کو موت دینے والا ہوں۔ (عبد الماجد)۔ بے شک میں تم کو وفات دینے والا ہوں۔ (اشرف علی)۔ میں تجھ کو پھر لوں گا (شامی القادر) تحقیق میں پھر لینے والا تجھ کو (رفیع الدین) میں تجھے پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔ (اعلیٰ حضرت)۔ یہ خطاب ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ اگر ترجمہ کیا جائے کہ میں لے لوں گا تجھ کو، موت دینے والا ہوں۔ اس میں کئی احتمال ہیں۔ تجھے لے لوں گا یعنی تیری روح کو قبض کر لوں گا۔ تجھے اپنی حفاظت میں لے لوں گا۔ یہ الفاظ احمدیوں کے عقائد کا رد نہیں کرتے۔ اور موت دینے والا ہوں۔ یہ ترجمہ ان کی امداد کرتا ہے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تو فوت ہو چکے ہیں ان کے متعلق تورب فرما چکا ہے: اِنِّیْ مَتَوْفِیْکَ لَمَّا اٰدٰیثِیْکَ پاك میں مسیح موعود کا ذکر ہے۔ اس سے مراد ہمارا نبی (کذاب) مرزا غلام احمد قادیانی (لعنة الله عليه) ہی ہے لیکن ان کے اس نظریے کے ابطال کے لیے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ موزوں ترین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کبیر کے مطابق ہے۔ یہ احمدیوں کا فروں کا گروہ توکل کی پیداوار ہے۔ علامہ رازی نے پہلے ہی ایسی تفسیر کی جو ان کے اس وہم کو دور کرنے کے لیے کافی ہے: مجنی قولہ اِنِّیْ مَتَوْفِیْکَ اِیْ اِنِّیْ مَتَمِّمٌ عَمَلِکَ فَحَمِیْنُکَ اِنِّیْ فَاکَ فَلَئِنْ کَرَمَ حَقِّیْ قَتَلْتُکَ بَلْ اِنَّا لَفَعَلْکَ اِلٰی سَمَآئِیْ وَمَقَرَّکَ بَمَلٰئِکَتِیْ وَاصْوَفَکَ عَنْ اَنْ یَّمْکِنَکَ مِنْ قَتْلِکَ وَهَذَا تَاوِیْلٌ حَسَنٌ میں تمہیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا پھر تمہیں وفات عطا کروں گا۔ ان کو نہیں چھوڑوں گا کہ وہ تمہیں قتل کر سکیں بلکہ میں تمہیں آسمانوں کی طرف اٹھاؤں گا۔ اپنے ملائکہ کے ساتھ تمہیں اٹھاؤں گا۔ میں آپ کی حفاظت کروں گا۔ وہ تمہیں قتل کرنے کی قدرت نہیں رکھ سکتے۔ یہ تاویل

اچھی ہے معلوم ہوا کہ جس تاویل کو علامہ رازی نے اچھا کہا ہے، پسند کیا ہے وہ یہی ہے کہ میں تمھیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔ ان کے قتل کرنے کے دعوے باطل ہیں۔ وہ کسی طرح بھی اس پر قافہ در نہیں ہو سکتے۔ یہ ہی ترجمہ اعلیٰ حضرت کا بھی ہے اور اسی سے احمدیوں کا رد کامل طور پر ایک اردو دان بھی ترجمہ سے سمجھ سکتا ہے۔ اسی طرح مدارک نے بھی تفسیر کی: انی متوفیک ای مستوفی اجلاک یعنی تمھیں پوری عمر تک پہنچاؤں گا۔

ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ (پ ۱۰)

پھر آوے تمھارے پاس کوئی رسول۔ (محمود الحسن)۔

کل اگر کوئی دوسرا رسول آئے۔ (مولانا مودودی)۔

پھر تمھارے پاس کوئی رسول آئے۔ (عبد المجاہد)۔

پھر تمھارے پاس کوئی اور پیغمبر آئے۔ (اشرف علی)۔

پھر آوے تمھارے پاس کوئی رسول۔ (شاہ عبد القادر)۔

پھر تمھارے پاس کوئی پیغمبر آئے۔ (فتح محمد)۔

پھر تشریف لائے تمھارے پاس وہ رسول (اعلیٰ حضرت)۔

وجہ فرق آوے، آئے اور تشریف لائے میں ثابت ہے۔ ہر ذی شعور کے فہم و ادراک سے بعید نہیں کہ تشریف لائے جس طرح ادب و احترام پر دال ہے اس طرح لفظ آوے میں کیسے ادب و احترام؟ دوسرا فرق ”کوئی رسول“ عام ہے وہ رسول خاص ہے۔ اس فرق کو سمجھنے سے پہلے اس آیت کریمہ کے سیاق و سباق کا کچھ مطلب ذہن نشین کریں۔

وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام سے وعدہ کیا کہ جب میں تمھیں کتاب و حکمت عطا کروں پھر تمھارے پاس وہ رسول تشریف لائیں جو تمھاری کتاب و حکمت کی تصدیق کرنے والے ہوں تو ضرور برضو و ان پر ایمان لانا اور ان کی امداد کرنا۔ پھر رب تعالیٰ نے ان کو فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس میرے وعدے کو قبول

کر لیا؟ تو انھوں نے عرض کیا کہ ہم نے اقرار کر لیا۔ اب اس مفہوم کے سمجھنے کے بعد واضح ہو کہ یہاں جن رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق انبیائے کرام سے وعدہ لیا گیا وہ خاص رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اگر یہاں یہ وہم پیش کیا جائے کہ آیت کریمہ میں لفظ رسول نکرہ ہے اس کے مطابق کوئی رسول ہی ترجمہ ٹھیک ہے ”وہ رسول“ یہ تو خاص ہے۔ یہ ترجمہ کیسے درست ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ نکرہ کا تنوین تعظیم سے خاص ہو جاتا جو کی کتب میں موجود ہے اور تنوین کا تعظیم کے لیے ہونا بھی علم معانی میں مذکور ہے جب معنی رسول مقبول کیا جائے گا تو تخصیص ہوگی جس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوں گے۔ اسی پر تفسیر بھی دال ہیں: ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ وَهُوَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (جلالین) پھر تمھارے پاس وہ رسول تشریف لائے جو تصدیق کرے نبیوں کے ہوں تمھاری کتاب و حکمت کی۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ حکم اگرچہ بظاہر انبیائے کرام کو ہے لیکن ان کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اس حکم میں داخل ہیں و مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ فِي ذَٰلِكَ (جلالین) انبیائے کرام کی امتیں بھی ان کے تابع ہونے کی وجہ سے اسی حکم میں داخل ہیں۔ اب یہاں پر اگر یہ وہم پیش کیا جائے کہ انبیائے کرام سے وعدہ لینے اور اقرار کرانے کی وجہ کیا ہے جب کہ نبی کریم آخر الزماں ہیں۔ انبیائے کرام نے تو آپ کا زمانہ پانا ہی نہ تھا۔ اس کا جواب صاوی میں ہے سوال و جواب اس طرح پیش کیا گیا ہے: قول آخر ذل

جواب عن سوال مقدّم ما قلوا حينئذ وشوقا المعاهدة على محمد مع علم الله انه لا يأتي في زمن من زمن من الانبياء الثواب على العزم بالاتباع والعقاب على العزم بعدم الايمان فجميع الانبياء امثال يوسف على الايمان بمحمد ومن عزم على عدم الايمان به لو ظن عوقب سوال یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ انبیائے کرام میں سے کوئی بھی نبی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہیں آئیں گے تو اس وعدہ و اقرار کا کیا فائدہ

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مقصود یہ ہے کہ جو نبی کریم پر ایمان لائے
کا عزم کرے اس کو ثواب دیا جائے اور جو ایمان نہ لائے کا عزم کرے اس کو عذاب
دیا جائے۔ گویا جمیع انبیائے کرام کو نبی کریم پر ایمان لانے کا ثواب دینا مقصود تھا۔
اور اگر یہ ظاہر ہو جائے کہ کسی نے نبی کریم پر ایمان لانے کا ارادہ کیا ہے تو اس کو
عذاب دیا جائے یعنی اس حکم میں انبیائے کرام کے ساتھ چونکہ ان کی امتیں بھی
داخل ہیں اس لیے امتوں میں سے جس شخص نے عدم ایمان کا عزم بھی کیا ہوگا، وہ
عذاب میں داخل ہوگا۔

اب اس بیان کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل نہ رہی کہ یہ حکم نبی کریم کے متعلق ہی
ہے۔ لہذا ایسا معنی کرتا جو محمول پر دال ہو جس سے مقصد واضح نہ ہو، یقیناً اس سے
بہتر وہی ترجمہ ہوگا جو تخصیص پر دال ہوگا اور مقصد کو واضح کرے گا۔ وکتبہ
ای الرسول وھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم

وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ (پہ ۴)

تم کمزور تھے۔ (محمود الحسن)۔ حالانکہ تم اس وقت بہت کمزور تھے (مؤدکی)
حالانکہ تم پست تھے (عبد المجید)۔ اور تھے تم ذلیل (شاریع الدین)
تم بالکل بے سروسامان تھے۔ (اعلیٰ حضرت)۔ وانتھا ذلۃ بقلۃ العدد
والسلاۃ (جلالین) تم تعداد اور ہتھیاروں کے لحاظ سے کم تھے یعنی بے سروسامان
تھے۔ وانما فسر بقلۃ العدد والسلاۃ لشدۃ ینا فی مذلول ہذہ الایۃ

وہذا العزۃ والرسولہ واللعنۃ وبقیضۃ العزۃ والغلبۃ بے سروسامان ہونے
سے یعنی قلت عدد اور ہتھیاروں کی قلت سے تفسیر کی گئی ہے تاکہ بظاہر قلت کا مفہوم
رب قدوس کے اس ارشاد کے منافی نہ ہو کہ اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے
لیے عزت ہے اس لیے کہ قلت کی نقیض عزت، قوت، غلبہ ہے لیکن یہاں تو
معنی تعداد کی کمی اور ہتھیاروں کی کمی مراد ہے: وھی ان المسلمین کانوا

ثلثمائۃ و ثلاثۃ عشر رجلاً وستۃ وسبعون من المهاجرین وبقیۃہم
من الانصار وماکان فیہم الا فرس واحد والکفار قریب من الف مقاتل
ومنہم مائۃ فرس مع الاسلحۃ الکثیرۃ۔

مسلمانوں کی کل تعداد تین سو تیرہ تھی چھترہ مہاجرین اور باقی انصار تھے۔ ان

کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا جب کہ کافر ایک ہزار کے قریب تھے اور ان کے پاس

ایک سو گھوڑے اور کثیر ہتھیار موجود تھے۔ وانتھا ذلۃ بقلۃ العدد (مذکر)

”تم قلیل تعداد میں تھے“ اب اس وضاحت کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر کی جائے

کہ آپ کا ترجمہ کس طرح شان صحابہ کے مطابق ہے لیکن اس کے برخلاف دوسرے

تراجم کو دیکھیں۔ تم ذلیل تھے۔ تم بہت پست تھے۔ کتنے شان صحابہ کرام کے خلاف تراجم

ہیں۔ اور تم بہت کمزور تھے۔ یہ ترجمہ بھی مقصد کو واضح کرنے میں ناکام ہے کیونکہ تم بہت

کمزور تھے، اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا ہے، تم صغیر طوری کمزور تھے۔ العیاذ باللہ!

تم ایمانی طور پر کمزور تھے۔ اسی لیے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ حقیقت کو سمجھانے میں اور صحابہ

کرام کی شان کو ثابت کرنے میں ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا (پہ ۵)

اور اس لیے کہ معلوم کرے اللہ جن کو ایمان ہے۔ (محمود الحسن)۔

تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے۔ (عبد المجید)۔

تاکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو جان لیویں۔ (اشرف علی)۔

اور اس واسطے کہ معلوم کرے جن کو ایمان ہے۔ (شاہ عبد القادر)۔

اور اس لیے کہ اللہ پہچان کرادے ایمان والوں کی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

جنگ اُحد کا ذکر ہو رہا تھا کہ اے مسلمانو! اگر تمہیں اعدائے کوئی تکلیف پہنچی

تو کفار کو بدر میں اسی طرح تکلیف پہنچ چکی۔ یہ دن لوگوں کے درمیان ہم بدلتے رہتے

ہیں۔ اس کے بعد ذکر ہے: وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا۔ اس پر جلالین نے علم

ظہور سے تفسیر کی۔ اس پر حاشیہ یہ ہے :- علم ظہور ای علم وجود
ای علمنا متعلق بالوجود الخارجی :-
یعنی یہاں علم کا تعلق وجود خارجی سے ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ پہلے ہی جانتا
ہے اس کو خارج میں ظاہر فرمائے :- والعلم فیہ بیان عن التسمین من
بإطلاق اسم السبب علی السبب ای لیمیز التائبین علی ایمان من غیرہم روح المعانی
یہاں علم کا مجازی معنی جِد کرنا، تمیز پیدا کرنا یعنی سبب کا نام سبب پر اطلاق ہے
(مجاز مرسل ہے) یعنی معنی یہ ہوا کہ ایمان پر ثابت رہنے والوں کو ان کے غیروں سے
ممتاز کر دے۔ اب اس تفسیر روح المعانی کی تفسیر کے مطابق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر غور کریں
اللہ پہچان کر دے ایمان والوں کی، کہ یہ نفیس ترجمہ ہے جس میں کوئی سطحی ذہن والا
بھی وہم و گمان نہیں کر سکتا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے محاذ اللہ ان کو آزمائش میں ڈال کر
جانا، پہلے علم نہیں تھا۔

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمِ الصَّابِرِينَ (پ ۳۶)
ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور نہ صبر
کرنے والوں کو جانا۔ (عبد الماجد)
حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی را
میں جانیں لڑنے والے اور اس کی خاطر صبر کرتے ہوئے ہیں۔ (مودودی)
حالانکہ ابھی خدا نے تم میں سے جہاد کرنے والوں کو تو ابھی طرح معلوم نہیں
کیا کہ اور یہ بھی مقصود ہے کہ وہ ثابت قدم رہنے والوں کو معلوم کرے (فتح محمد)
اور ابھی تک معلوم نہیں کیا کہ اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں
کیا ثابت رہنے والوں کو۔ (محمد الحسن)
اور ابھی معلوم نہیں کیا کہ اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم کرے ثابت
رہنے والے۔ (شاہ عبدالقادر)

اور ابھی اللہ نے تمہارے غازیوں کا امتحان نہ لیا اور نہ صبر کرنے والوں
کی آزمائش کی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مفسرین کی بحث باسانی سمجھ میں آتی ہے کہ
یہاں اللہ کے علم کی کیسے نفی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ کہا جائے ابھی تک اللہ نے
معلوم نہیں کیا :- ای ولما تجاہدوا لأن العلم متعلق بالمعلوم فتدل نفی
العلم بمنزلة نفی متعلقہ لأنه منتف باشتفاء نقول ما علم الله في
فلان خيال ای مافیہ خیال حتی یعلمہ (مدارک) یعنی یہاں مقصد نفی جہاد ہے
نفی علم نہیں اس لیے کہ علم کا تعلق معلوم سے ہے نفی معلوم کی جگہ نفی علم کو رکھا گیا
ہے۔ کیونکہ معلوم کے انتفاء سے علم کا انتفاء ہوتا ہے جیسے تم کو ما علم اللہ فی
فلان خیال اس کا یہ معنی نہیں کہ اللہ نے فلاں میں خیر کو جانا نہیں بلکہ اس کا معنی یہ ہے
کہ فلاں میں خیر ہے ہی نہیں جو اللہ کے علم میں آئے مقصود بھی یہی ہے کیونکہ ما قبل
آ رہا ہے کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے، ابھی تو اللہ نے تمہیں جہاد
میں آزمایا بھی نہیں اور نہ صبر کرنے والوں کی آزمائش کی۔ فان ساء العجز من غیث
عمل من یعلم انه منوط به مستبعد عند المعقول۔ ولما قبل ترجوا الحاجة
ولم تسلكها مسالكها۔ ان السفينة لا تجري على اليبس۔ وسمعت عن شمر بن
حوشب طلب الجنة من غير عمل ذنب من الذنوب وانتظار الشفاعة
يلا سبب نوع من العزوف وان تجاء الرحمة ممن لا يطاع حمق
وجہالتہ (روح المعانی) اجر کی امید بغیر عمل کے جانتے
ہوئے کہ اس کا دار و مدار بھی اسی پر ہے یہ عقل سے بعید ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہا
گیا۔ نجات کی امید اس راہ پر چلنے کے بغیر کشتی کو خشکی پر چلانے کے مترادف ہے۔
شمر بن حوشب کہتے ہیں۔ بغیر عمل کے طلب جنت گناہ ہے۔ انتظار شفاعت بلا سبب
دھوکا میں مبتلا ہونا۔ رحمت کی امید بغیر اطاعت کے جہالت و بے وقوفی ہے۔
اس تقریر سے واضح ہوا کہ یہاں نفی آزمائش جہاد و صبر ہے نہ کہ نفی علم :-

نفی اللہ ہم لازم نفی الملزم و کثیرا ما یقال ما علم اللہ تعالیٰ فی ذلک
خیرا و یزاد ما فیہ خیر حتی یعلمہ (روح المعانی) اس عبارت کا معنوم وہی
ہے جو پہلے مارک کے حوالہ سے گزر چکا ہے۔ ام حسبہ ان تدخلوا الجنة والحال
انہ لم یتحقق منکسر الجہاد والصبر (روح المعانی) یہاں بھی نفی جہا
وصبر ہے نہ کہ نفی علم۔

اَفَاِنَّ مَاتَ اَوْ قُتِلَ (پ ۱۴)

پھر اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔ (محمود الحسن)۔
پھر کیا وہ اگر مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں۔ (مودودی)۔
سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں۔ (عبدالماجد)۔
پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
بھلا اگر یہ مر جائیں یا مارے جائیں (فتح محمد)۔

تو کیا اگر وہ انتقال فرمائیں یا شہید ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ذکر کیا جا رہا ہے۔ جنگ اُحد میں جب شیطان
نے نبی کریم کے شہید ہو جانے کی افواہ پھیلا دی صحابہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے
اس وقت رب تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ سے پہلے بھی انبیاء کرام کا انتقال ہو چکا ہے
تو کیا اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا شہید ہو جائیں تو تم دین سے روگردانی کر جاؤ گے
اب توجہ طلب بات یہ ہے کہ کون سا معنی نبی کریم کی شان کے لائق ہے۔ ادب و
احترام پر دال ہے جس میں شہید ہونے کا ذکر ہے یا مارا جانا، قتل ہو جانے کا ذکر ہے
تو یقیناً یہ ترجمہ بہتر ہے۔ یہاں دانش پر مخفی نہیں۔

بَعْضُ مَا كَسَبُوا (پ ۱۵)

ان کے گناہ کی شامت سے۔ (محمود الحسن)۔

اُن کے بعض کرتوتوں کے سبب (عبدالماجد)۔
کچھ اُن کے گناہ کی شامت سے۔ (شاہ عبدالقادر)۔

ان کے بعض اعمال کے باعث (علیٰ حضرت)۔

جنگ اُحد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک درہ میں صحابہ کرام کی جماعت کو کھڑا
کیا کہ تم نے یہاں ہی کھڑے رہنا ہے۔ جب صحابہ کرام کو فتح حاصل ہوئی تو وہ جماعت
بھی اس جگہ کو چھوڑ کر مال غنیمت کے اجتماع میں دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ شریک
ہو گئے۔ یہ صحابہ کرام کی اجتہادی خطا تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ شاید فتح تک بھڑکنے کا
ہمیں حکم دیا گیا۔ نبی کریم کی اجازت کا انتظار نہ کرنے کی وجہ سے آزمائش میں آ گئے۔
اسی درہ سے کفار نے حملہ کر دیا صحابہ کرام کو تکلیف پہنچائی۔ اسی درہ کو چھوڑنے کا ذکر
رب نے فرمایا کہ اُن کے بعض اعمال کی وجہ سے شیطان نے انہیں بھسلا دیا۔ پھر بیشک
اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ اسی مقصد کو علیٰ حضرت نے صحابہ کرام کے ادب کا
محافظ کرتے ہوئے، اُن کے بعض اعمال کے باعث، ترجمہ کیا۔ اُن کے بعض اعمال کی
شامت سے، ایسا ترجمہ نہیں کیا جس میں گناہ کی نسبت صراحت صحابہ کرام کی طرف ہو بظاہر
کی بات یہ ہے کہ علیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کرنا کہ بے محبوب، کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے
اس پر گناہ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔

وَلْيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ وَلْيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا (پ ۱۶)

یہ مقصود تھا کہ خدا مومنوں کو اچھی طرح معلوم کرے اور منافقوں کو بھی معلوم
کر لے۔ (فتح محمد)۔

اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو اور تاکہ معلوم کرے ان کو جو
منافق تھے۔ (محمود الحسن)۔

تاکہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون (مودودی)
تاکہ اللہ مومنین کو جان لے اور ان لوگوں کو بھی جنہوں نے منافقت کی۔
(عبدالماجد)

اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو اور معلوم کرے جو منافق تھے۔
(شاہ عبدالقادر)

اس لیے کہ پہچان کرانے ایمان والوں کی اور اس لیے کہ پہچان کرانے جو منافق ہوئے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر بھی اللہ تعالیٰ کی شان کو مد نظر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مناسب ترین ہے جو اوہام باطلہ کو رد کرتا ہے ورنہ وہم ہو سکتا ہے کہ اللہ کا علم اس واقع کے بعد حاصل ہوا حالانکہ ایسا وہم کرتا ایمان کو ضائع کرنا ہے کیونکہ رب تعالیٰ کے اس ارشاد سے پہلے جو آ رہا ہے اس کا مفہوم یہ ہے: ”جو بھی تمہیں (اصحاب میں تکلیف پہنچی وہ اللہ کے ارادہ ہی سے ہے تاکہ مومنوں اور منافقوں کی پہچان کرادے۔“

والمراد لیظهر للناس ومیشیت لدیسرہم ایمان المؤمن (روح المعانی) مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظاہر کرے مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے نفاق کو۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور روح المعانی کی تفسیر میں مطابقت ہے۔ لوگوں پر ظاہر کرے یا پہچان کرانے ایک مفہوم کو شامل ہے لیکن معلوم یا جانے اس قسم کے الفاظ سے غلط مفہوم لینا یقینی ہو جاتا ہے

لَا يَغُرُّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ (پہ ۶۱)

تجھ کو دھوکا نہ دے کافروں کا شہروں میں۔ (محمود الحسن)۔
نہ فریب میں ڈالے تجھ کو پھر نالوں لوگوں کا کہ کافر ہوئے بیچ شہروں کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

(اے پیغمبر) کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا تمہیں دھوکا نہ دے۔ (فتح محمد)
تو نہ بہک اس پر کہ آتے جلتے ہیں کافر شہروں میں (شاہ عبدالقادر)
اے نبی دنیا کے ملکوں میں خدا کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تھیں کسی دھوکا میں نہ ڈالے۔ (مودودی)

یہ کافروں کا شہروں میں چلنا پھرنا کہیں تجھے دھوکے میں نہ ڈال دے عیلملجاد۔
اے سننے والے کافروں کا شہروں میں اہل گمراہی پھرنا ہرگز تجھے دھوکا نہ دے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ عام مخاطب کو خطاب ہے کہ کافروں کا شہروں میں گھومنا پھرنا تجارت کرنا مال حاصل کرنا انھیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ دنیا کا سامان تھوڑا ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ بات واضح ہے کہ اس خطاب کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ آپ کی امت ہے لیکن دیگر تراجم میں اے سننے والے کے الفاظ زائد نہیں۔ لہذا بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے حالانکہ یہ درست نہیں اور مولانا مودودی صاحب اور مولانا فتح محمد صاحب نے تو صراحتہً نبی کریم کی طرف نسبت کر دی جو تفاسیر سے لاعلمی کی علامت ہے: والخطاب لکوا احداً وللبی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد به غیر لان قدوة القوم ومقدمهم

یخطاب لشیء فیقوم خطابہ مقام خطابه جمیعاً فکانہ قیل لا یخبر لکھ

وان الرسول علیہ السلام کان غیر مفضوہ بحالہ
(مدارک) ہر آدمی کو خطاب ہے یعنی اے سننے والے۔ یا خطاب تو نبی کریم کو ہے لیکن مراد آپ خود نہیں بلکہ آپ کے پیرو ہیں اس لیے کہ آپ قوم کے پیشوا و مقتدا ہیں لہذا مقتدا کو خطاب تمام کو خطاب ہے گویا یہ کہا گیا ہے تمہیں دھوکا نہ دے کیونکہ نبی کریم کو کفار کا تجارت کرنا اور مال و دولت دھوکا نہیں دے سکتا الخطاب للنبی

صلی اللہ علیہ وسلم والمراد منہ امت وکثیر ما یخطب سید القوم بشیء و یزاد اتباعه فیقوم اتباعه مقام خطابه (روح المعانی) نبی کریم صلی

اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہے اور مراد آپ کی امت ہے۔ اکثر طور پر قوم کے سردار کو خطاب کیا جاتا ہے اور مراد اس کے تابعین ہوتے ہیں۔ لہذا یہی مناسب ہوگا جس سے یہ سمجھا جاسکے کہ یہ خطاب نبی کریم کی امت کو ہے۔ اگر یہ ترجمہ کیا جائے اے سننے والے تجھ کو دھوکا نہ دے پھر یہ واضح ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ ترجمہ کیا جائے ”تجھ کو دھوکا نہ دے“

تو اس سے یہ مقصد تو واضح نہیں ہوتا البتہ لوگوں کو گمراہ کرنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو سمجھنے سے برگشتہ کرنا آسان ہے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ (پہ)

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ (محمود الحسن)

اللہ پر توبہ کی قبولیت کا حق ہے (مودودی)

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے۔ (عبد الماجد)

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ (اشرف علی)

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ (شاہ عبدالقادر)

وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ نے اپنے فضل سے لازم کر لیا۔ (علی حضرت)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ ایسا ترجمہ جو ہم کا ازالہ بھی کر رہا ہے

وہ ہم یہ ہوتا ہے کہ اللہ پر کوئی چیز لازم نہیں تو کیسے توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور۔ یہ

ترجمہ صحیح ہوا جب کہ کسی چیز کو ضرور کرنا واجب کے مترادف ہے۔ اللہ پر کوئی چیز واجب

نہیں۔ اسی وہم کا ازالہ جلالین میں کیا گیا۔ اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے: إِنَّمَا

التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ أَيُّ التَّوْبَةِ الَّتِي كَتَبَ عَلَى نَفْسِهِ قَبْلَ مَا بَعَثَ فِيهِ رُسُلَهُ وَهِيَ تَوْبَةُ

جس کو اللہ نے اپنے فضل سے لازم کر لیا و لَيْسَ الْمَرْادُ بِهِ الْوَجُوبُ

إِذَا لَاحِظَ غُلَى الْمَثَلُ شَيْءٌ وَلَكِنَّهُ تَاكِيدٌ لِلْوَعْدِ لِيَعْلَمَ أَنَّهُ يَكُونُ لَهُ مَالَهُ كَالْوَعْدِ

الَّذِي لَا يَتَقَرَّرُ (مدارك) اور اس سے مراد وجوب نہیں جب کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز

لازم نہیں لیکن البتہ وعدہ کی تاکید ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کو پورا فرماتا ہے جب

وہ اپنے وعدہ کا تخلف نہیں فرماتا تو یہ واجب کی طرح ہوا جس کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔

یعنی ہی مقصد کے مطابق ہے کہ وہ اپنے فضل سے اپنے آپ پر توبہ کو لازم کیے ہوئے

ہے ورنہ حقیقتہً اس پر کچھ لازم نہیں۔ لہذا توبہ کو ضرور قبول کرنا لازم پر دال ہے اور

لزموم سے اللہ تعالیٰ پاک ہے۔

فَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ جَاءُوكَ الْيَتِيمَ (پہ)

کاش کہ جس وقت اپنی جانوں پر زیادتی کر بیٹھے تھے آپ کے پاس آجاتے پھر

اللہ سے مغفرت چاہتے اور رسول بھی ان کے حق میں مغفرت چاہتے تو یہ ضرور اللہ کو

توبہ قبول کرنے والا مہربان پالتے۔ (عبد الماجد)

اگر انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا کہ جب یہ اپنے نفس پر ظلم کر بیٹھے تھے تو

تھکے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی کی

درخواست کرتا تو یقیناً اللہ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پالتے (مودودی)۔

اگر وہ لوگ جس وقت انھوں نے اپنا برا کیا تھا آتے تیرے پاس اللہ سے معافی

چاہتے اور رسول بھی ان کو بخشتا تو البتہ اللہ کو پالتے معاف کر دیتا مہربان محمود الحسن

اور اگر جس وقت وہ اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر

ہو جاتے تو پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے اور رسول بھی ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے

معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پالتے۔

(اشرف علی)

اور اگر جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کر کے تیرے محبوب تمہارے حضور حاضر ہوں اور

پھر اللہ سے معافی چاہیں اور رسول ان کی شفاعت فرمائیں تو ضرور اللہ کو بہت توبہ قبول

کرنے والا مہربان پائیں۔ (علی حضرت)

ان تراجم میں پہلا فرق توبہ ہے کہ ”آتے تیرے پاس“ اور اسی طرح یہ الفاظ ”رسول“

بھی ان کو بخشتا تھا ان الفاظ کو اردو محاورہ کے مطابق دیکھیں۔ پھر ان کے مقابل

”اے محبوب تیرے حضور حاضر ہوں“ اسی طرح یہ الفاظ رسول ان کی شفاعت فرماتے۔ اس

ترجمہ کو بھی اردو محاورہ کے مطابق دیکھیں یہ سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئے گی کہ

کون سا ترجمہ ادب و احترام کے مطابق ہے یا کون سا نہیں۔

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ ائمه کرام کے ترجمہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ حکم عام ہے۔ نبی کریم کی ظاہری حیات میں بھی یہ حکم تھا اور اب بعد از وصال بھی حکم یہ ہی ہے لیکن دوسرے ترجمہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ حکم آپ کی ظاہری حیات سے متعلق تھا۔ حالانکہ یہ درست نہیں زیادہ طور پر وہ اس دلیل پر انحصار کرتے ہیں لا تشدد الرجال الا الى ثلاث مساجد مسجد الحرام والمسجد الاقصیٰ ومسجدی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مساجد کے بغیر کہیں اور رختِ سفر باندھنے سے روکا ہے۔ وہ تین مسجدیں مسجد حرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی ہے۔ اس حدیث پاک سے دلیل یہ پیش کی جاسکتی ہے کہ یہاں سے ثابت ہوا کہ زیارت قبور صالحین بھی منع ہے حالانکہ یہ اسناد لال صحیح نہیں کیونکہ اس حدیث کے ماتحت مسلم شریف کی شرح میں علامہ نووی نے فرمایا: والصحيح عند اصحابنا وهو الذي اختاره امام الحرمين والمحققون انه لا يحرم ولا يكره ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے جس کو امام الحرمین اور محققین حضرات نے بھی پسند کیا ہے کہ یہ نہ حرم ہے اور نہ مکروہ ہے۔ اسی طرح مرقاة شرح مشکوٰۃ میں بھی ہے: فی الشرح المسلم للنووی قال ابو محمد یحرم شد الرجال الى غیر الثلاثة وهو غلط فی الصحیاء ذهب بعض العلماء الى الاشدلال علی المنع من الرحلة لزیارة المشاهدة وقبور العلماء والصالحین وما تبین لی ان الامر لیس كذلك بل لزیارة ما موسر بہا الخیر الا فرجی وھا انما وردت فیما عن الشدیدین الثلاثة من المسجد لقتالہما ولما المشاهدة فہذا تساوی بل ببرکۃ زیارتہا علی قدر درجاتہم عند اللہ ہل یمنع ذالک القائل عن شد الرجال بقبور الانبیاء کابر اھیم وموسىٰ ویحیٰ والمنع من ذالک فی غایتہ الاحالة والاولیاء فی معناہم فلا یبعد ان یشد ذالک من اغراض الرحلة کما ان زیارة العلماء فی الحیوۃ یعنی علامہ نووی نے ایک قول ابو محمد کا تین مساجد کے بغیر سفر کرنا حرام ہے نقل کر کے اس پر خود کہا کہ یہ غلط ہے۔ احیاء العلوم میں بھی ہے کہ بعض علماء نے تبرک مقامات اور علماء و صالحین کی قبور کی طرف زیارت کے لیے سفر کرنے

کو منع کیا ہے لیکن یہاں بھی علامہ غزالی نے خود ہی بیان کیا ہے مجھے چوتھا چلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح صحیح نہیں کیونکہ قبور کی زیارت کرنا تو خود حدیث پاک سے ثابت ہے کہ نبی کریم نے فرمایا لا یغند دھا غیر دار قبور کی زیارت کیا کرو لیکن یہاں بھی مطلب یہ ہے کہ تمام مساجد برابر ہیں۔ اگر کسی مسجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے جاتا ہے تو ان تین مساجد کی طرف جانے کسی اور کی طرف نہ جائے۔ اس تحقیق پر لا تشدد الرجال الى المسجد الا الحی ثلاث الخ معنی ہوگا یعنی تم مساجد کی طرف زیادتی ثواب کی غرض سے سوائے ان تین کے نہ جاؤ پھر فرماتے ہیں کہ یہ حکم متبرک مقامات کا نہیں بلکہ ان کی زیارت میں عجب درجات برکت ہے۔ اسی طرح انبیائے کرام جیسے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کی قبور کی زیارت سے منع کرنا بہت ناممکن ہے۔ اولیائے کرام کا بھی یہی حکم ہے جس طرح علماء کی زندگی میں ان کی طرف جانا کسی نہ کسی مقصد پر مشتمل ہوتا ہے اسی طرح اولیائے کرام کی قبور کی زیارت کرنے میں بھی کوئی غرض ہو سکتی ہے۔

اب اس بیان کے بعد بخوبی واضح ہوگا جب ابراہیم علیہ السلام، انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی قبور کی زیارت باعث برکت ہے تو سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار پر انوار کی زیارت بھی باعث شفاعت ہے نبی کریم کے مزار پر انوار پر شفاعت کی غرض سے حاضر ہو کر التجا کرنا اور نبی کریم کا شفاعت کرنے کے بعد مخفرت کی خوشخبری دینا مدارک سے ثابت ہے قبیل جاعلانی بعد دفنہ علیہ السلام فرجی بنفسہ علی قبور وحنامت تنابہ علی ساسہ وقال یا رسول اللہ قلت فسمعنا وکان فیما اترک علیک ولوا انہم اذ ظلموا انفسہا الا یتہ وقد ظلمت لفسی وجئتک استغفر اللہ ذی واستغفر لی من ربی فنودی من قبورہ قد غفر لک (مدارک) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دفن ہونے کے بعد ایک اعرابی آیا اور قبر اطہر سے بیٹھ کر قبر انور کی خاک سر پر ڈالتے ہوئے نہایت حالت زار سے عرض کر رہا ہے، یا رسول اللہ! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا آپ نے اللہ کا نازل کردہ ارشاد فرمایا، ہم نے تمنا و لو انہم اذ ظلموا انفسہم پوری آیت اعرابی نے تلاوت کرنے کے بعد عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے اپنی

جان پر ظلم کیا اور میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں میں خود تو اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر رہا ہوں آپ بھی رب سے میرے لیے استغفار (شفاعت) فرمائیں۔ قبر اظہر سے آواز آتی انھیں بخش دیا گیا۔ صاحب مدارک کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی قابلِ تعریف ہے جس میں نبی کریم کا شفاعت کرنا آج بھی ایسے ہی ثابت ہے جیسے ظاہری حیات میں ثابت تھا۔

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۖ

اور بیابھی عورتوں میں سے مگر جن کے مالک ہوئے ہیں وہ اپنے ہاتھ تھامے۔

(شاہ رفیع الدین)

اور شوہر والی عورتیں بھی (مگر پر حرام ہیں) مگر وہ جو اسیر ہو کر لونڈیوں کے طور پر تھامے قبضے میں آجائیں۔ (مولوی فتح محمد)

اور نکاح بندہ بھی عورتیں مگر جن کو مالک ہو جاویں تھامے ہاتھ۔ (شاہ عبد القادر) اور وہ عورتیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر جو کہ تمھاری مملوک ہو جاویں۔ (اشرف علی)۔ اور حرام ہیں شوہر والی عورتیں مگر کافروں کی عورتیں جو تمھاری ملک میں آجائیں۔ (اعلیٰ حضرت)

اسی مقام ان عورتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن سے تعلقات ازدواجی حرام ہیں اسی کے ضمن میں والمحصنات من النساء کو ذکر کیا اور اس سے مملکت ایمانکھ کو مستثنیٰ کیا۔ مدارک میں اسی طرح ذکر کیا گیا ہے الامام مملکت ایمانکھ۔ بالسبب ونزوحہا فی دار الحرب والمعنف وحریم علیہم نکاح المنکوحات ای اللاتی لہن ازواج الامام مملکت وھن بسببھن واخراجھن بدواف واجھن لوقوع الفرقة بتباین الدارین لا بالسبب ففحل الغنائم بملک الیمین بعد الاستبراء یعنی الامام مملکت ایمانکھ سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کو قید کر کے لایا جائے اور ان کے خاوند دار حرب میں رہ

جائیں ان میں دار حرب اور دار اسلام کے تباین کی وجہ سے فرقت واقع ہوگی صرف قید ہونے سے نہیں کیونکہ وہ وضع حمل کے بعد مال غنیمت کے طور پر ملک یمین کی وجہ سے حلال ہو جائیں گی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس فقہی ضابطہ کو واضح کر رہا ہے۔ جب کہ دوسرے تراجم وضاحت بیان سے قاصر ہیں۔ کیونکہ یہاں شوہر والی عورتوں کی حلت اور شوہر والی عورتوں کی حرمت کا بیان ہے۔ یعنی کافروں کی عورتیں جن کے خاوند دار حرب میں رہ گئے ہوں وہ تباین دارین کی وجہ سے مسلمانوں پر حلال ہو جائیں گی۔ دوسرے تراجم میں مطلقاً لونڈیوں کا ذکر ہے ان میں خاندنوں والی ہوں اتھ ہوں اس کا پتا نہیں چلتا۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ

(پہ ۱۱)

جو پہنچے تم کو کوئی بھلائی سو اللہ کی طرف سے ہے اور جو پہنچے تم کو کوئی بُرائی سو تیرے نفس کی طرف سے۔ (محمود الحسن)

جو تجھ کو بھلائی پہنچے سو اللہ کی طرف سے اور جو تجھ کو بُرائی پہنچے سو تیرے نفس کی طرف سے۔ (شاہ عبد القادر)

جو پہنچتی ہے تجھ کو بھلائی پس خدا کی طرف سے ہے اور جو پہنچتی ہے تجھ کو بُرائی پس جان تیری سے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)

اے سنتے والے! تجھے جو بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو بُرائی پہنچے وہ تیری اپنی طرف سے ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق یہ ثابت ہے کہ یہاں خطاب عام انسانوں کو ہے نبی کریم کو نہیں۔ اسی لیے آپ نے ”اے سنتے والے“ الفاظ زیادہ کیے۔ لیکن دیگر تراجم میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے، حالانکہ یہ درست نہیں: مَا أَصَابَكَ إِلَّا الْإِنْسَانُ مِنْ حَسَنَةٍ خَيْرٌ مِنَ اللَّهِ أَتَكَ فَضْلًا مِنْ

وما اصابك من سيئة بلية فمن نفسك انتك حيث انتكبت ما يستوجبها من الذنوب (جلالین) اے انسان جو تجھے بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو تجھے مصیبت پہنچے وہ تیرے اپنے گناہوں کے ارتکاب کی وجہ سے ہے۔ یا انسان خطا باعاما قال الزجاج المخاطب النبی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد انی (مدارک) اے انسان یعنی یہاں خطاب عام ہے۔ اور زجاج نے کہا خطاب نبی کریم کو ہے لیکن آپ کے غیر مراد ہیں۔ سو وحی عن قتادة عام لكل من يقف عليه الا للنبی صلی اللہ علیہ وسلم (شرح المعانی) یہ خطاب عام ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں حقیقت بھی یہ ہے کہ معاذ اللہ نبی کریم کی طرف گناہ کی نسبت اور گناہ کی وجہ سے مصیبت کا آنا یہ ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے تفاسیر میں خطاب عام ہے یعنی ہر انسان یہ مفہوم اسی وقت ادا ہو گا جب کہ ”اے سننے والے“ اے مخاطب کسے یا شد۔ اس قسم کے الفاظ زیادہ کیے جائیں۔

اَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ (پہ ۱۰۲)

کہ کچھ کم کرو نمازیں سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اگر نمازیں اختصار کر دو۔ (مودودی)۔

کہ نمازیں کمی کر دیا کرو۔ (عبد الماجد)۔

کہ تم نماز کو کم کر دو۔ (اشرف علی)۔

کہ کچھ کم کرو نماز میں سے۔ (شاہ عبد القادر)۔

نماز کو کم کر کے پڑھو۔ (فتح محمد)۔

یہ کہ کوتاہ کرو تم نماز سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

کہ بعض نمازیں قصر سے پڑھو۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں مسافر کی نماز قصر کرنے کا ذکر ہے۔ مسافر نماز کو قصر نہیں کر سکتا کیونکہ نمازیں تین قسم کی ہیں۔ ثلاثی۔ رباعی۔ ثنائی دو رکعت والی نماز جیسے فجر کی نماز

ثلاثی تین رکعت والی نماز جیسے مغرب۔ رباعی چار رکعت والی نماز جیسے ظہر، عصر، عشاء۔ قصر صرف رباعی نماز ہوتی ہے ثلاثی اور ثلاثی نہیں ہوتیں۔ اب اگر یہ ترجمہ ہو کہ ”کچھ کم کرو نمازیں سے“ اس میں یہ وہم ہو سکتا ہے کہ شاید ہر نماز کو قصر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ ترجمہ کیا جائے کہ ”بعض نمازیں قصر سے پڑھو“ تو یہ وہم نہیں ہو سکتا بلکہ ترجمہ سے ہی واضح ہے کہ بعض نمازیں قصر ہوں گی بعض نہیں۔ یہ ہی تفاسیر کی رائے بھی ہے: من اعلاذ مسکعات الصلوة فتصلی الرباعیہ مسکعتین (مدارک) یعنی تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نماز کی رکعات کی تعداد کم کرو یعنی تم چار رکعت والی نماز کو دو رکعتیں پڑھو بان نحدوہا من اربع الی اثنتین (جلالین) یعنی تم چار رکعت والی نماز کو دو کی طرف لوٹاؤ۔ لہذا اس مقصد کو اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بہت زیادہ واضح کر رہا ہے جب کہ دوسری جگہ غلط مفہوم بتایا میں ممکن ہے مولانا مودودی صاحب کے ترجمہ میں اگر امر کی یہ صریح غلطی ہے کہ ان کا معنی اگر کیا حالانکہ یہ غلط ہے۔ ہاں البتہ ان کا معنی اگر ہے۔ شاید ان کے دیکھنے میں غلطی ہو گئی ہو۔

اِنَّ الْمُنَافِقِينَ يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ (پہ ۱۰۳)

منافق (ان چالوں سے اپنے نزدیک) خدا کو دھوکا دیتے ہیں اور اس کو

کیا دھوکا دیں گے) وہ ان کو دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔ (محمود الحسن)۔

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکے بازی کر رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت اللہ

ہی نے انہیں دھوکا میں ڈال رکھا ہے۔ (مودودی)

اور منافق جو ہیں دعا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دعا دے گا۔

شاہ عبد القادر

تحقیق منافق فریب دیتے ہیں اللہ کو اور وہ فریب دینے والا ہے ان کو۔

(شاہ رفیع الدین)

بے شک منافق لوگ اپنے گمان میں اللہ کو فریب دیا چاہتے ہیں اور وہی ان کو غافل

کر کے مارے گا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اللہ کو دھوکا، فریب دینا، اس سے دغا بازی کرنا ممکن نہیں۔ اسی طرح اللہ کسی کو دغا دے، فریب کرے یا دھوکا دے یہ بھی درست نہیں: اِی یَفْعَلُوْنَ مَا یَفْعَلُوْنَ
المخادع فیظہرون الایمان ویضمون نقیضہم (روح المعانی)
یعنی وہ اپنے خیال میں فریب کاری کرتے ہیں جیسا کہ مکار، فریب کار، دغا باز کا کام ہوتا ہے کہ وہ ایمان کو ظاہر کرتے ہیں اور دل میں کفر رکھتے ہیں۔ وہ اپنے خیال میں فریب دیتے ہیں کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو مخفی رکھنا ممکن نہیں:

وہو خادعہما ای فاعل بہم ما یفعل الغالب فی الخداع حیث
ترکہ فی الدنیا معصومی الدما والاعمال واعلمہم فی الاخرة
الذات الاسرار (روح المعانی) اللہ تعالیٰ ان کو غافل کر کے مارے گا یعنی ان
سے ایسا معاملہ کرے گا جو مخدعیت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ان کے جان اور مال
مسلمانوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہتے ہیں کہ ان سے کافروں کی طرح جنگ کر کے
ان کے مال کو غنیمت نہیں بنایا جاتا۔ انہیں قتل نہیں کیا جاتا لیکن قیامت میں ان
کو سب سے زیادہ عذاب ہوگا جہنم کے سب سے نچلے درجہ میں رکھا جائے گا:

بأظہارہم خلاف ما یظنہون من الکفر لیدفعوا عنہم احکامہ الدنیویۃ (جلالین)
وہ باطن میں کفر رکھتے تھے اور ظاہر ایمان دار تاکہ دنیا میں کافروں والے احکام ان
سے دور رہیں۔ یہ بھی وہ اپنے گمان میں ایسا کرتے تھے ورنہ حقیقتاً ایسا کرنا ممکن
نہیں تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کو چھپانا ممکن نہیں وہو خادعہما
بحاویہم علی خداعہم (جلالین) وہ ان کو خداع کی پیرا دے گا۔ تفسیر کے بیان سے
یہ مخفی نہ رہے کہ اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں یا اللہ دھوکا دیتا ہے۔ یہ تراجم صریح
غلطی پر مبنی ہیں اور تفسیر سے مکمل لاعلمی کی علامت ہے۔

فَکُلُوْا مِمَّا اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ (پہلے)

سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے (محمد الحسن)

وہ جس جانور کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو بھی تم کھا سکتے ہو۔ (مودودی)۔

سو کھاؤ اس میں سے کہ رکھ پھڑپھڑیں تمہارے واسطے (شاہ عبدالقادر)۔

سو کھاؤ اس (شکار) کو جسے (شکاری جانور تمہارے لیے پکڑ رکھیں)۔ (عبدالماجد)

تو جو شکار وہ تمہارے لیے پکڑ رکھیں اس کو کھالیا کرو۔ (فتح محمد)

پس کھاؤ اس چیز سے کہ پکڑ رکھیں اوپر تمہارے (شاہ رفیع الدین)

تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لیے پکڑیں اس کو کھاؤ (اشرف علی)

تو کھاؤ اس میں سے جو مار کر تمہارے لیے رہنے دیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں شکاری جانوروں جیسے کتا اور درندے وغیرہ شکاری پرندے ان کا ذکر کیا جا

رہا ہے کہ جو جانور سکھائے جائیں وہ سیکھ جائیں ان کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھ کر

چھوڑ دیا۔ اگر ان کے شکار کرنے میں کوئی جانور مر بھی جائے ذبح نہ کیا جائے پھر بھی حلال ہے

یہ مقصد صرف اس سے کہ پکڑ رکھیں تمہارے واسطے حاصل نہیں جیسا اعلیٰ حضرت کے ترجمے سے

واضح ہے: وان قتلته بان لم یاکل منہ بخلاف غیث المعلمۃ فلا یحل صیدہ

وعلامتہا ان تسترسل اذا سلسلت وتتنجزا اذا جریت وتمسک

الصید ولا تاكل منہ واول ما یعرف بہ ذلک ثلاث مرات فان اكلت

منہ فلا یس ممالک علی صاحبہا فلا یحل اکلہ (جلالین) یعنی شکاری جانور دوسرے کو

قتل کر دے اور خود اس سے نہ کھائے۔ وہ سیکھا ہوا جانور ہے بخلاف اس کے جو سیکھا ہوا

نہیں ہے اس کا شکار کھانا حلال نہیں۔ وہ علامات جن سے پتا چل جائے کہ یہ جانور سیکھا

ہوا ہے اور یہ نہیں وہ یہ ہیں کہ جانور کو جب شکار کے لیے چھوڑا جائے وہ شکار کی طرف

چلا جائے جب روکا جائے وہ رک جائے اور جو شکار کرے اسی طرح رہنے دے خود اس

سے نہ کھائے۔ یہ کم از کم تین مرتبہ اس کی آزمائش کی جائے۔ اگر تین مرتبہ ان شرائط پر پورا

اُترے تو سمجھا جائے کہ اب یہ سیکھ گیا ہے۔ اگر خود جانور نے اس سے کھالیا اور مالک کے

لیے اسے نہ رکھا تو سمجھیں کہ ابھی وہ نہیں سیکھا لہذا اس سے نہ کھایا جائے لیکن یہ حکم

اسی جانور کا ہے جو شکار کے حال میں مر گیا لیکن اگر اسے زندہ پالیا اور ذبح کر لیا اس۔

کے لیے شکاری جانور کا یہ سمجھا ہوا ہونا یا نہ ہونا کوئی شرط نہیں۔ لہذا اس کا تمھارے لیے پکڑ رکھنا زندہ کو بھی شامل ہے جو یہاں مراد ہی نہیں لیکن بخلاف اس کے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی مقصد کو ظاہر کرتا ہے جو مراد ہے جو مار کر تمھارے لیے رہنے دیں اسے کھاؤ یہی مراد ہے۔ اس فقہی باریکی سے دوسرے حضرات بے خبر رہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ (پ ۶)

اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو (مولانا محمود الحسن)۔
اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب تم نماز کے لیے اٹھو۔ (مودودی)
اے ایمان والو جب تم نماز کو اٹھو (عبد الماجد)
اے ایمان والو جب تم اٹھو نماز کو (شاہ عبدالقادر)۔
اے لوگو جو ایمان لائے ہو جب کھڑے ہو تم واسطے نماز کے (شاہ رفیع الدین)
اے ایمان والو جب نماز کو کھڑا ہونا چاہو۔ (اعلیٰ حضرت)۔
اس آیت میں وضو کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے کہ جب تم نماز میں کھڑے ہونے کا ارادہ کرو تو وضو کرو کیونکہ نماز میں کھڑے ہو کر تو وضو نہیں کیا جائے گا۔ یہ مقصد اسی وقت سامنے آئے گا جب ترجمہ کیا جائے گا۔ جب نماز کو کھڑا ہونا چاہو۔ لیکن اگر یہ ترجمہ کیا جائے جب تم اٹھو نماز کو اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ نماز میں کھڑے ہو کر وضو کیا جائے گا۔ اسی وجہ کے پیش نظر مفسرین کرام نے بھی محذوف الفاظ کو نکالا ہے اذ اقمتم ای اقمتم القیام الی الصلوٰۃ (جلالین) یعنی جب تم نماز میں کھڑے ہونے کا ارادہ کرو۔ ای اقمتم القیام الی الصلوٰۃ لکھنؤ فاخرات القرآن ای اذا اردت ان تقرا القرآن فحضر عین اعادة الفعل بالفعل لان الفعل سبب عن الازادة فاقیم السبب مقام السبب للملا یستقیمت بینهما طلبا للایجاز (مدارک) جب تم نماز میں کھڑے ہونے کا ارادہ کرو جس طرح دوسرے مقام پر فاخرات القرآن وہاں بھی یہی مراد ہے

کہ جب تم قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو تو تعوذ پڑھو۔ ارادہ فعل کو فعل سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ فعل مسبب ہے ارادہ سبب ہے۔ اختصار کے پیش نظر دونوں کے تعلق کی وجہ سے مسبب کو سبب کی جگہ رکھا۔

وَاتَّكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِينَ (پ ۶)

اور دیا تم کو جو کچھ کہ نہ دیا کسی کو عالموں سے (شاہ رفیع الدین)۔
اور تم کو اتنا عنایت کیا کہ اہل عالم میں سے کسی کو نہیں دیا (فتح محمد)۔
اور دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں۔ (محمود الحسن)
اور تم کو وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا (مودودی)
اور تمہیں وہ دیا جو دنیا جہان میں کسی قوم کو بھی نہیں دیا گیا۔ (عبد المجید)
اور تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیں۔ (اشرف علی)
اور دیا تم کو جو نہیں دیا کسی کو جہان میں۔ (شاہ عبدالقادر)
اور تمہیں وہ دیا جو آج سارے جہان میں کسی کو نہ دیا۔ (اعلیٰ حضرت)
حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلایا ہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو اس نے تم میں انبیائے کرام بنائے اور تمہیں وہ دیا جو آج سارے جہان میں کسی کو نہ دیا۔

اگر لفظ آج کی زیادتی نہ کی جائے تو سمجھ آتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کی فضیلت تمام جہانوں پر بیان فرمائی۔ اس میں تو قوم موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلی تمام امتوں پر لازم آئے گی۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ اسی کو روح المعانی میں اس طرح پیش کیا گیا: العالمین للعہد والمراد عالمی زمانہم اور استغراق والتفضیل من وجہ لا یستلزم التفضیل من جمیع الوجہ فانہ قد یکون للمفضل مالیس للفاضل وعلی التقیین

لَا يُلْزِمُ تَفْضِيلُهُمْ عَلَى هَذِهِ الْأُمَّةِ مُحَمَّدِيَّةً عَلَى نَبِيِّهَا
أَفْضَلُ الصَّلَاةِ وَكَمَلُ التَّحِيَّةِ وَإِتِّعَاءُ مَا لِحَيَاتِ أَحَدٍ
وَأَنْ لِحَيَاتِهِمْ مِنْهُ التَّفْضِيلُ لَكِنْ الْمَتَابُ دَرَسُ
اسْتِعْمَالِهِ ذَلِكَ وَلِذَا أَوَّلُ مَا أَوَّلُ

العالمین پر الف لام عہدی ہے جس کا مقصد ہے ہمیں اپنے زمانے میں (آج)
جو دیا گیا ہے وہ کسی کو نہیں دیا گیا۔ الف لام استغراقی بھی ہو سکتا ہے مطلب یہ ہو گا کہ
ہمیں تمام جہان والوں پر بعض وجوہ سے فضیلت دی گئی ہے کیونکہ کبھی مفضول میں
بعض لحاظ پر وہ کمال پایا جاتا ہے جو فاضل میں نہیں ہوتا۔ بہر حال دونوں تقدیریں
میں امت موسیٰ علیہ السلام کو امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر فضیلت لازم نہیں آتی۔
روح المعانی کی اس تفسیر کے بعد واضح ہوا کہ پہلی صورت میں ترجمہ وہی بہتر ہے
جو علامہ نے کیا ہے البتہ دوسری صورت میں یہ ترجمہ ہو سکتا ہے اور کچھ دیا تم کو
جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں لیکن لفظ آج کی قید کی زیادتی کے بغیر اور اسی طرح
لفظ کچھ یا بعض کی زیادتی کے بغیر ترجمہ مناسب نہیں۔

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ ثَمَّ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ (پ ۱۱)

اور حق جو تمہارے پاس آچکا ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ
کرنا۔ (فتح محمد)

ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر بیدھار راستہ جو تیرے پاس آیا (محمود الحسن)
اور ان لوگوں کی خواہشوں پر عمل نہ کیجیے اس سچائی سے الگ ہو کر جو آپ کے
پاس آچکی ہے۔ (عبد الماجد)

اور سوچھی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی خواہشوں پر عملدرآمد
نہ کیجیے۔ (اشرف علی)

اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر حق راہ جو تیرے پاس آئی (شاہ عبدالقادر)
اے سننے والے! ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اپنے پاس آیا ہوا حق چھوڑ کر۔
(اعلیٰ حضرت)

یہ خطاب بھی عام مسلمانوں کو ہے کیونکہ نبی کریم تو محصوم ہیں۔ آپ کا حق راہ کو
چھوڑنا متصور نہیں۔ لہذا مطلقاً بغیر "اے سننے والے" کی زیادتی کے یا با بعض المحال کے
ترجمہ درست نہیں۔ تفسیر کبیر میں اسی ترجمہ کی تائید ہے کہ خطاب نبی کریم اور مراد آپ
کی امت ہے: وقیل الخطاب للملاد غیروہ اور یہی حال اس آگے
دوسری آیت میں بھی ہے۔

إِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ يَٰعِيسَىٰ بْنِ مَرْيَمَ هَلْ نَسْتَطِيعُ رَبَّكَ الْاٰمِيَّةُ
(پ ۱۲)

کہا حواریوں نے اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تیرا رب کر سکتا ہے کہ انا اے ہم پر خوان
بھرا ہوا آسمان سے (مولانا محمود الحسن)۔
جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تیرے رب سے ہو سکے کہ انا اے
ہم پر خوان بھرا آسمان سے (شاہ عبدالقادر)۔

حواریوں نے عرض کیا کہ اے عیسیٰ ابن مریم آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں
کہ ہم پر آسمان سے کچھ نازل فرمائیں (مولانا اشرف علی)۔

حواریوں نے کہا اے عیسیٰ ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا
ایک خوان اتار سکتا ہے (مولانا مودودی)۔

(وہ قصہ بھی یاد کرو) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تمہارا پروردگار
ایسا کر سکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے (طعام کا) خوان نازل کرے۔ (فتح محمد)
جس وقت کہا حواریوں نے اے عیسیٰ بیٹے مریم کے آیا کر سکتا ہے پروردگار
تیرا یہ کہ انا اے اوپر ہمارے خوان آسمان سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

حواریوں نے کہا اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ کا رب ایسا کرے گا کہ ہم پر آسمان سے ایک نوحان اُتارے (علیٰ حضرت)

اس مقام پر دیگر مترجمین نے یہ ترجمہ کیا کہ کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے لیکن علیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے کیا آپ کا رب ایسا کرے گا؟ تراجم میں فرق واضح ہے کہ یہ سوال کرنا کہ کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے؟ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ سوال کرنے والے کے دل میں شک ہو کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے یا نہیں۔ پھر وہ شخص کہے گا کیا اللہ ایسا کر سکتا ہے لیکن اگر اللہ تعالیٰ پر ایمان ہو تو یہ سوال کرنا ممکن نہیں۔ البتہ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگرچہ ہر طرح کی قدرت حاصل ہے جو چاہے وہ کر سکتا ہے لیکن کیا ہماری التجا پر یہ کام کرے گا یا نہیں۔ یہاں سوال قدرت کے متعلق نہیں کہ اسے قدرت حاصل ہے یا نہیں بلکہ سوال مشیت کے بارے میں ہے کہ اس کام میں اس کی مشیت بھی ہے یا نہیں۔ یہ سوال جائز ہے۔

اب یہ خیال کیا جائے کہ یہ سوال کرنے والے حواریین ہیں۔ وہ حواریین کون ہیں؟ ہذا اول من امن بعیسیٰ علیہ السلام (صاوی) وہ عیسیٰ علیہ السلام پر سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔ ان کے ایمان پر خود قرآن پاک شاہد ہے: **قَالَ الْمَرْءُ یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بَاَنَا مُسْلِمُونَ** حواریوں نے کہا ہم اللہ کے دین کے مدگار، ہم اللہ پر ایمان لائے اور اے عیسیٰ علیہ السلام ہمارے ایمان لانے پر آپ گواہ رہیں۔

جب حواریین اپنے ایمان کا برملا اقرار کر رہے ہیں اور اپنے ایمان پر عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنا رہے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اللہ کی استطاعت میں شک کریں۔ اسی شک اور اس کا ازالہ اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی صحت اور دوسرے حضرات کی بظاہر الفاظ سے غلطی کی وجہ، تفاسیر سے دیکھیں۔ جلالین میں ہے: **هَلْ یَسْتَطِیعُ اِیْ یَفْعَلُ رَبُّکَ** کیا تمہارا رب کرے گا۔ یہ معنی نہیں کہ تمہارا رب کر سکے گا؟ جلالین کے اسی مقام پر تفسیر صاوی میں ہے: **اِیْ یَفْعَلُ رَبُّکَ** فاعل

اللازم وهو الاستطاعت واد الملزوم وهو الفعل و دفع بذلک ما یقال ان الحواریین مومنین فکیف یشکون فی قدرة اللہ تعالیٰ یعنی ہل یستطیع کی تفسیر یفعل سے کیوں کی گئی۔ اس لیے کہ یہاں مجاز مرسل ہے کہ اطلاق استطاعت کا ہے جو لازم ہے اور مراد ملزوم ہے اور وہ فعل ہے کیونکہ جہاں فعل ہو گا وہاں استطاعت لازم ہوگی۔ یہ مجاز کا استعمال کرنا ذکر لازم اور ملزوم مراد لینا اس وجہ سے ہے کہ یہاں ایک سوال کو مندرج کرنا ہے کیونکہ سوال یہ ہوتا ہے کہ حواریین تو ایمان والے تھے انھوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کیسے شک کرتے ہوئے یہ سوال کیا۔ تو اس کا جواب واضح طور پر سمجھ آچکا ہے کہ یہاں استطاعت اپنے لغوی معنی میں استعمال ہی نہیں بلکہ مجازی طور پر یفعل کے معنی میں استعمال ہے جس کا معنی یہی ہوگا کیا تمہارا رب کرے گا۔ عام مترجمین ہل یستطیع کے لفظ سے غلطی میں مبتلا ہو گئے کیونکہ ہل یستطیع کا لغوی معنی بلاشبہ یہ ہے کہ وہ کر سکے گا وہ کر سکتا ہے لیکن قرآن پاک کے رموز سے یہ بے خبری کی علامت ہے کیونکہ قرآن پاک میں تشابہات بھی ہیں اور مجازات و کنایات بھی۔ اس کے عکس علیٰ حضرت کا ترجمہ اس شک کو مندرج کر رہا ہے اور جو بیان کرنا مقصود تھا اُسے ہی ظاہر کر رہا ہے۔ یہ کمال اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ ترجمہ کی نظر تفاسیر پر ہو، پھر ترجمہ کرے۔ روح المعانی میں بھی اسی طرح ہے: ان معنی ہل یستطیع ہل یفعل کما نقول للقادر علی القیام ہل یستطیع ان تقوم یعنی ہل یستطیع کا معنی کیا کرے گا۔ جس طرح قیام پر قدرت رکھنے والے کو کہا جائے کیا تو کھڑا ہوگا؟

وَالْمَوْتِ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ (پ ۴)

اور مردوں کو زندہ کرے گا۔ (مجمود الحسن)۔

یہ ہے مَرَدے تو انھیں تو اللہ بس قبروں ہی سے اٹھائے گا (مودودی)

اور مردوں کو اللہ جل کر کھڑا کرے گا۔ (عبدالماجد)

اور مردوں کو اللہ تعالیٰ زندہ کر کے اٹھادیں گے۔ (مولانا اشرف علی)

اور مردوں کو اٹھا دے گا اللہ (شاہ عبدالقادر)۔

اور مردوں کو تو خدا (قیامت ہی کو) اٹھائے گا (فتح محمد)۔

اور مُردے جلاوے گا اللہ۔ (شاہ رفیع الدین)

ان مردہ دلوں کو اللہ اٹھائے گا۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر ذکر کیا جا رہا ہے کہ اے محبوب آپ کی دعوت کو وہ قبول کرتے ہیں جو سوچ و سمجھ کے مالک ہیں۔ آپ کی بات کو غور و فکر سے سنتے ہیں (اور کفار آپ کی بات کو تسلیم نہیں کریں گے) ان مردہ دلوں (کفار کو اللہ اٹھائے گا۔ اسی کی طرف انھوں نے ٹوٹنا ہے۔ یہاں الموتی سے مراد کفار ہیں نہ کہ مطلقاً مرے کیونکہ مردہ کا اطلاق نفوت شدہ پر ہوتا ہے وہ عام ہے مومن و کافر سب کو شامل ہے۔ اسی وجہ سے اگر ترجمہ کیا جائے ”مردوں کو اللہ زندہ کرے گا“ قرآن پاک کا حقیقی مفہوم سمجھ نہیں آتا۔ یہی سمجھا جائے گا کہ یہاں صرف قیامت اور تمام نفوت شدہ کو زندہ کرنے کا ذکر ہے حالانکہ یہ مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود کفار کو اٹھانا مراد ہے جب یہ ترجمہ کیا جائے کہ ان ”مردہ دلوں کو اللہ اٹھائے گا“ اب مقصود واضح ہو گا کہ مردہ دل تو کفار ہی ہیں وہی مراد ہونگے جب کہ قرآن پاک نے اس مقام پر کفار کے اٹھانے کا ہی ذکر کیا ہے تو وہی ترجمہ مقبول ہو گا جو مقصد کے مطابق ہو: والموتی ای الکفار شبہ عدم السما ع (جلالین) یعنی موتی سے مراد کفار ہیں۔ ان کو مردہ سے تشبیہ دی گئی ہے کہ یہ دعوت حق کو قبول نہیں کرتے: والموتی مبتلا ما ی الکفار (مدارک) موتی ترکیبی لحاظ سے مبتدا واقع ہو رہا ہے اور اس سے مراد کفار ہیں والموتی ای الکفار (روح المعانی) موتی سے مراد کفار ہیں و فی اطلاق الموتی علی الکفار استعارۃ تبعیۃ مبینیۃ علی تشبیہ کفرہم و جعلہم بالموت (روح المعانی) لفظ موتی کا کفار پر اطلاق استعارہ تبعیہ ہے کیونکہ ان کے کفر و جہالت کو موت سے

تثبیہ دی گئی ہے۔

وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (٢٤٥)

اور نہ مہن جالوئی عینب کی بات (محمود الحسن)۔

نہ میں عذاب کا علم رکھتا ہوں۔ (موردی)۔

اور نہ میں غیب جانتا ہوں۔ (عبدالماجد)

اور نہ میں جانوں غیب کی بات (شاہ عبدالقادر)۔

اور نہ (یہ کہ) میں غیب جانتا ہوں (فتح محمد)

اور نہ میں جانتا ہوں غنیب کو (شاہ رفیع الدین)۔

اور نہ یہ کہوں کہ میں آپ غیب جان لیتا ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر آنحضرت کے ترجمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نفی قول ہے یعنی اسے
کی نفی ہے کہ میں نہیں کہتا اور ذاتی طور پر علم غیب کی نفی ہے نہ کہ عطائی کی۔ لیکن
اس کے برعکس دوسرے تراجم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مطلقاً غیب کی نفی ہو رہی ہے،
حالانکہ یہ درست نہیں۔ یہاں قول کی نفی ہے۔ اس پر مدارک میں یہ تفسیر ہے: ولا
اعلم الغیب النصب عطف علی محل عندی خزائن اللہ لاذ
من جملة المقول کا نہ قال لا اقول لکہ هذا القول ولا هذا القول
ولا اقول لکم انی ملک ای لا ادعی ما یستبعد
فی الحقول ان یکون بشر من ملک خزائن اللہ و
علم الغیوب ودعوی المملکیۃ وانما ادعی ما کان
لکثیر من البشر وهو النبوة لا اعلم الغیب جملہ محل
نصب میں ہے کیونکہ اس کا عطف عندی خزائن اللہ کے محل پر ہے اور وہ بھی محل نصب
ہے کیونکہ وہ جملہ قول کا مقولہ ہے۔ لہذا مقصد یہ ہوا کہ تمام معطوف اور معطوف علیہ
مقولہ میں کہ میں یہ کہتا ہوں اور نہ یہ۔ ولا اقول لکم انی ملک کی تفسیر میں بھی

یہ بیان کرتے ہیں کہ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا جو انسانی عقل سے بعید ہو کہ ایک بشر کے پاس اللہ کے خزانے ہوں اور علم غیب رکھتا ہو اور فرشتہ ہونے کا دعویٰ دار ہو بلکہ میں وہ دعویٰ کرتا ہوں جو پہلے بھی کثیر بشیر حضرات نے دعویٰ ثبوت کیا ہے۔ اس سے پتا چلا کہ یہاں قول اور دعویٰ کی نفی ہے نہ کہ علم غیب کی۔

دوسری وجہ فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ذاتی غیب کی نفی ہے نہ کہ عطائی کی۔ اس پر تفسیر تمل کو لو کنت اعلم الغیب آپ کی تفسیر میں دیکھیں۔ خود واضح ہو گا کہ مطلقاً غیب کی نفی نہیں ہو سکتی لفائن ان يقول قد اخبر صلی اللہ علیہ وسلم عن المخیبات وقد جاءت احادیث فی الصحیح بذلک وهو اعظم من معجزاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فلیف الجمع بینہ و بین قولہ ولو کنت اعلم الغیب لا استکثرت من الخیب واجب ان یحتمل ان یكون قالہ علی سبیل التواضع والادب المعنی لا اعلم الغیب الا ان یطعن فی اللہ علیہ ویقدروا لح اگر کوئی اعتراض کرے کہ نبی کریم نے تو بہت غیبی خبریں دی ہیں اور صحیح احادیث میں اس کا ذکر ہے حالانکہ علم غیب نبی کریم کا عظیم معجزہ ہے تو ان احادیث اور قرآن پاک کی اس آیت کریمہ ولو کنت اعلم الغیب لا استکثرت من الخیب میں مطابقت کیسے ہوگی۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ نبی کریم نے معجز و انکساری کے طور پر یہ کہا ہے اور از روئے ادب کے کہ میں خود غیب نہیں جانتا جب تک مجھے اللہ اس پر مطلع نہ فرمائے اور قدرت تو دے۔ روح المعانی میں بھی نفی قول ہی ہے: ولا اعلم الغیب عطف علی محل عندی خواص اللہ فیہ منقول۔ ولا اعلم الغیب کا عطف عندی خزان اللہ کے محل پر ہے اور یہ اقول کا مقول ہے۔

اب تفسیر کے واضح بیانات سے یہ مقصد بخوبی صاف ہوتا ہے کہ مطلقاً علم غیب کی نفی نہیں بلکہ از خود غیب کے جاننے کی نفی ہے اور ترجمہ بھی اسی وقت صحیح ہو گا جس سے یہ پتا چلے کہ یہاں ذاتی طور پر غیب کے جاننے کی نفی ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی

مقصد عظیم پر دال ہے جس سے دیگر تراجم خالی ہیں۔

فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ (پ ۳۳)

پس ہو جائے گا تو بے انصافوں میں۔ (مولانا محمود الحسن)۔

آپ کا شمار بے انصافوں میں ہو جائے گا۔ (عبدالمجید)

تو آپ نامناسب کام کرنے والوں میں ہو جائیں گے۔ (اشرف علی)۔

پھر ہوئے بے انصافوں میں (شاہ عبد القادر)

تو ظالموں میں ہو جاؤ گے۔ (فتح محمد)

پس ہو جائے تو ظالموں میں سے (شاہ رفیع الدین)۔

تو یہ کام انصاف سے بعید ہے (اعلیٰ حضرت)۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ جب کفار نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ جو غریب صحابہ ہیں جن کا لباس صاف نہیں ان کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں پھر ہم آپ کے پاس بیٹھ کر آپ سے بات کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محبوب آپ ان لوگوں کو جو صبح و شام رب کو پکارتے ہیں ان کو اپنی مجلس سے نہ اٹھائیں وہ اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔ تم پر ان کا کوئی حساب نہیں اور ان پر تمہارے حساب سے کچھ نہیں۔ پھر اگر آپ ان کو دور کریں تو یہ کام انصاف سے بعید ہے۔ اب اس مقام پر نبی کریم کی طرف نسبت بے انصافی کی کرنا اسی وقت صحیح ہو گا جب آپ سے اس کا وقوع ممکن ہو جب کہ صحابہ کرام کو مجلس سے اٹھانے کا کفار کا مطالبہ تسلیم ہی نہ ہوا تو بے انصافی کا ترتیب بھی نہ ہوا کیونکہ انبیاء کرام کی ہمت کے ہی منافی ہے۔ جب یہ ترجمہ کیا جائے "پس ہو جائے گا تو بے انصافوں میں"۔ یہ ادب و احترام اور مقام سید الانبیاء کے منافی ہے۔ لیکن "یہ کام انصاف سے بعید ہے" یہ ادب و احترام پر مبنی ہے۔ لیکن اس پر کو تو اٹھانے کے مطابق معترضین کا تبصرہ اعلیٰ حضرت کے خلاف مشاہدہ ہو۔ لکھتے ہیں "اس جگہ کام انصاف سے بعید کا ترجمہ

عربی لغت سے بالکل نابلد ہونے کی روشن دلیل ہے۔ اس ترجمہ کی حقیقت توضیح ہو چکی ہے کہ یہاں نبی کریم کی شان کے مطابق ہے البتہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لغوی ترجمہ نہیں بامحاورہ ترجمہ ہے تو کیا لغوی ترجمہ کرنا لازم ہے؟ تو بامحاورہ تراجم عربی لغت سے نابلد ہونے کی دلیل ہوں گے۔ اس قاعدہ کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد کا ترجمہ تو بالکل عربی سے ناواقف پیر مثنی ہو گا بلکہ جناب کے ممدوح شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب بھی اس نزد میں آئیں گے۔ آئیے اپنا قاعدہ ذرا شیخ الہند صاحب پر جاری کریں کہ وہ بھی بامحاورہ ترجمہ کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک مثال بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں ورنہ کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں:-

قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ

اس کا ترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب نے کیا ہے ”ابھی گزر چکا ہے تمھارے سامنے ایک نمونہ“۔ کون سا یہ ترجمہ لغوی ہے؟ جب یہ ترجمہ بامحاورہ جائز ہے تو نبی کریم کے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت نے بامحاورہ ترجمہ کیا ہے تو اس پر اعتراض یقیناً دلیل ہے کہ شان مصطفیٰ کا عیاں ہونا پسند نہیں میرے ایک دوست ایک ہی کسوٹی پر سب کو پرکھیں۔ ایک ہی ضابطہ پر کہیں اعتراض کہیں مدح یہ عقلمندوں کی شان نہیں۔ اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید تفسیر کبیر کر رہی ہے: ان الظلم عبارة عن وضع الشيء في غير موضعه والمعنى ان اولئك الصنعاء الفقراء كانوا يستحقون التعظيم من الرسول عليه السلام فاذا طرحهم عن ذلك المجلس كان ذلك ظلما۔ ظلم کا معنی کسی چیز کو اس کے محل کے غیر میں رکھنا مقصد یہ ہے کہ ضعیف و فقراء نبی کریم کی طرف سے مستحق تعظیم ہیں اگر ان کو مجلس سے اٹھایا گیا تو یہ اٹھانا انصاف سے دور ہو گا مجلس سے اٹھانا کام ہی تو ہے۔ اب اس ترجمہ میں کون سا استحالہ باقی رہ گیا ہے کہ یہ کام انصاف سے بعید ہے۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ
حَتَّى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ ۚ (پہ ۱۱۷)

اے نبی جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینی کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمھیں بھلائے میں ڈال دے تو تمھیں جس وقت غلطی کا احساس ہو جائے اس کے بعد پھر ظالموں کے پاس نہ بیٹھو۔ (مموددی)

اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کر یہاں تک کہ مشغول ہو جاویں کسی اور بات میں اور اگر بھلائے تجھ کو شیطان تو مت بیٹھ یاد آ جانے کے بعد ظالموں کے سامنے (ممود الحسن)

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری نشانیوں کو مشغلہ بناتے ہیں تو ان سے کنار کش ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں، اور اگر شیطان تجھے بھلا دے تو یاد آ جانے کے بعد (ایسے) ظالم کے پاس مت بیٹھ۔ (عبدالماحد دریا بادی)

اور اے سننے والے! جب تو انھیں دیکھے جو ہماری آیتوں میں پڑتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لے جب تک اور بات میں پڑیں اور جو کہیں تجھے شیطان بھلا دے تو یاد آنے پر ظالموں کے پاس مت بیٹھ۔ (اعلیٰ حضرت)

اس آیت کریمہ میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں نسبت عام سننے والے کی طرف ہے نبی کریم کی طرف نہیں لیکن دوسرے تراجم میں نسبت نبی کریم کی طرف ہے۔ آیت کریمہ کے معنوم کو دیکھنے کے بعد خود ہی صاحب ایمان آدمی سمجھتا ہے کہ یہ حکم نبی کریم کو نہیں بلکہ یہ عام آدمی کو خطاب ہے کیونکہ نبی کریم پر شیطان کا تسلط ممکن نہیں۔ و ذہب بعض المحققين ان الخطاب هنا وفيما قبل لسيد المخاطبين

عليه الصلوة والسلام والمراد غيره وقيل لغيره ابتداء اي اذا امرت
ايها السامع وان انشأت ايها السامع - (روح المعاني) محققين اس
طرف گئے ہیں کہ داماینسینک الشیطان اور اذا رایت الذین میں خطاب نبی
کریم کو ہے لیکن مراد آپ کے غیر ہیں۔ اور کچھ حضرات نے کہا ہے کہ یہ خطاب ابتدائی
طور پر ہی خیر و دل کو ہے نبی کریم کو نہیں معنی ہی یہ ہے کہ اے سنتے والے جب تو انہیں
دیکھے، اے سنتے والے جب تجھے شیطان بھلائے : واذا رایت قیل انہ خطاب
للنبي صلى الله عليه وسلم والمراد غيره وقيل الخطاب لغيره اي اذا
سمعت ايها السامع الذين يخوضون في آيتنا - (کبیر) یہ خطاب نبی
کریم کو ہے اور مراد آپ کے غیر ہیں۔ بعضوں نے کہا ہے کہ خطاب ہی خیر کو ہے۔
اے سنتے والے جب تو دیکھے ان کو ہماری آیات میں پڑے ہوئے (استہزاء کرتے
ہوئے)۔

قُلْ اَنْتُمْ عِوَانٌ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا (۱۱۸)

کہو کیا ہم خدا کے سوا ایسی چیزوں کو پکاریں جو نہ ہمارا بھلا کر سکیں اور نہ بُرا۔
(فتح محمد)

تو کہہ کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا جو نہ بھلا کرے ہمارا نہ بُرا (شاہ عبد القادر)
تو کہہ کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا ان کو جو نہ نفع پہنچا سکیں ہم کو اور نہ نقصان۔
(مولانا محمود الحسن)۔

اے نبی ان سے پوچھو کیا ہم اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع دے
سکتے ہیں نہ نقصان۔ (مودودی)۔

آپ کہہ دیجیے کیا ہم مسلمان) اللہ کے سوا ایسے کو پکاریں جو نہ ہم کو نفع پہنچا
سکے اور نہ ہم کو نقصان۔ (عبد الماجد)۔

تو فرماؤ کیا ہم اللہ کے سوا اس کو پوچھیں جو ہمارا نہ بھلا کرے نہ بُرا (علی حضرت)

عام طور پر اس قسم کی آیات انبیائے کرام اور اولیائے کرام کے حق میں پیش کی جاتی ہیں کہ
اُن سے استمداد ناجائز ہے یہ تو نفع و نقصان کے مالک ہی نہیں حالانکہ بتوں کے حق میں
نازل شدہ آیات کو اولیائے کرام کے حق میں پیش کرنا دشمنی تہیں۔ اُن کو جو کو معنی
پکارنا لینا کیسے صحیح ہے۔ یہاں تو معنی عبادت کا ہے نہ کہ پکارتے کار۔ قل لا یجی
یکم حتی یقول لا ینفع عبد الرحمن وکان یدعو الیہ الی عبادۃ الاولیاء
اندعوا انعبد من دون الله الضار النافع ما لا ینفعنا
ما لا ینقد علی نفعنا ان دعونا ولا یضرنا ان ترکنا۔ (مارک)
حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد الرحمن جب ایمان نہیں لاتے تھے اپنے
والدِ مکرم کو بھی بت پرستی کی دعوت دیتے تھے تو اس وقت یہ حکم ہوا کہ تم کہو
کہ کیا ہم اس اللہ کو نفع و نقصان کا مالک ہے، کے غیر کی عبادت کریں جن کی عبادت
کرنا نفع نہیں اور ان کی عبادت کو چھوڑنا نقصان نہیں۔ تو ہم ان کی عبادت کر لیں
کریں۔ اندعوا انعبد من دون الله ما لا ینفعنا بعبادته ولا یضرنا
بتکبوا وهو الاضناہ (جلالین) کیا ہم اللہ کے غیر کی عبادت کریں جن کی
عبادت نفع نہیں دیتی اور جن کی عبادت کو چھوڑنا نقصان نہیں پہنچاتا۔ وہ اللہ
کے غیر کیا ہیں؟ وہ صرت ہیں۔ اعلم ان المقصود من هذه الآية الرد علی
عبدا الاضناہ وہی مؤکدة لقوله تعالیٰ قبل ذلك (قل انی نہیت
ان اعبد الذین تدعون من دون الله فقال اندعوا من دون
الله ای انعبد من دون الله النافع الضار ما لا ینقد علی نفعنا
ولا علی ضررنا) (کبیر)
اس آیت سے بتوں کی عبادت کرنے والوں کا رد مقصود ہے اور یہ آیت
پہلی آیت قل انی نہیت الخ کی تاکید ہے کیونکہ وہاں بھی تدعون معنی تعبد و ان
ہے اور اعبد صراحتہ معنی عبادت کے موجود ہے پس اسی وجہ سے کہا کہ ہم
اللہ کو نفع و نقصان کا مالک ہے اس کے غیر کی عبادت کریں جو نفع و ضرر پر قادر نہیں

ای نعبد متجانین عبادۃ اللہ الجامع لجميع صفات الوہیۃ الٰہی من
جملتها القدسۃ علی النفع والضرر ما لا یقدس علی نفعنا ان
عبدناہ ولا علی ضررنا اذا ترکناہ (روح المعانی) کیا ہم اس اللہ کی عبادت
کے تجا و ذکر میں جو تمام صفات الوہیت کا مالک ہے اور اس کی قدرت میں نفع
و نقصان کا مالک ہونا بھی ہے۔ اس کی عبادت کریں جن کی عبادت میں نفع نہیں
اور ان کی عبادت کو چھوڑنے میں نقصان نہیں یعنی یہ نہیں ہو سکتا۔
ان تمام تفاسیر کی عبادت سے واضح ہوا کہ اندھ کو کا معنی عبادت ہے نہ کہ
مطلقاً پکارنا یا دُعا کرنا جیسا کہ اپنے مقصد کو ثابت کرنے کے لیے ناکام کوشش
کی گئی ہے۔

فَلَمَّا جَنَّ عَلَیْهِ اللَّیْلُ رَأٰی کَوْکَبًا قَالَ هٰذَا مَرِیٌّ
فَلَمَّا رَأٰی الْقَمَرَ بَارِغًا قَالَ هٰذَا رِیٌّ

فَلَمَّا رَأٰی الشَّمْسَ بَارِغَةً قَالَ هٰذَا رِیٌّ هٰذَا اَکْبَرُہ
(پ ۵۸)

تو یوں ہوا کہ جب رات ابراہیم پر چھا گئی، انھوں نے ایک تار کو دیکھا بولے
یہی میرا پروردگار ہے۔ پھر جب چاند کو دیکھا چمکتے ہوئے تو بولے یہی میرا پروردگار
ہے۔ پھر جب سورج کو چمکتے ہوئے دیکھا تو بولے یہی میرا پروردگار ہے۔ (تفسیر المصطفیٰ)
پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے، دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا یہ ہے
میرا رب۔ پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے میرا رب۔ پھر جب دیکھا سورج
چمکتا ہوا، بولا یہ ہے میرا رب سب سے بڑا۔ (مولانا محمود الحسن)
پھر جب اندھیری آئی اس پر رات دیکھا ایک تار بولا یہ ہے رب میرا۔
پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا۔ پھر جب دیکھا سورج چمکتا

بولا یہ ہے رب میرا یہ رب سب سے بڑا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انھوں نے ایک ستارہ دیکھا۔ آپ
نے فرمایا کہ یہ میرا رب ہے۔ پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرا رب
ہے۔ پھر جب آفتاب کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ میرا رب ہے۔ (اشرف علی)۔
چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک تار دیکھا کہا یہ میرا
رب ہے۔ پھر چاند چمکتا نظر آیا تو کہا یہ ہے میرا رب، پھر جب سورج کو روشن
دیکھا تو کہا یہ ہے میرا رب۔ (مودودی)۔

یعنی جب رات نے ان کو پردہ تاریکی سے (ڈھانپ لیا تو) آسمان میں
ایک ستارہ نظر پڑا۔ کہنے لگے، یہ میرا پروردگار ہے۔ پھر جب سورج کو کوکبہ گارہا ہے
تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔ (فتح محمد جالندھری)۔
پھر جب ان پر رات کا اندھیرا آیا ایک تار دیکھا بولے اسے میرا رب ٹھہرتے
ہو۔ پھر جب چاند چمکتا دیکھا بولے اسے میرا رب بناتے ہو۔ پھر جب سورج چمکتا
دیکھا بولے اسے میرا رب کہتے ہو یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)
یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ اور قوم پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر دلائل
قائم کرنے کا ذکر ہے کیونکہ ان آیات سے پہلے بت پرستوں کو تبلیغ کرنے کا ذکر ہے
کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ آذر کو فرمایا، کیا تم بتوں کو خدا مانتے ہو؟ اسی
بت پرستی کی وجہ سے میں تمہیں اور تمہاری قوم کو صریح گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ ان
بتوں کے خدا نہ بن سکتے مگر قوم کو اس طرح سمجھایا کہ تم نے ایسے خدا بنا رکھے ہیں
جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی نفع و نقصان کے مالک ہیں۔

اس مقام پر ستارہ پرستوں، چاند پرستوں، سورج پرستوں کے ذکر کرنے کا ذکر ہے
اور ان پر جو دلائل قائم ہوئے وہ مذکور ہیں۔ جب رات چھا گئی تو ابراہیم علیہ السلام
نے ستارہ کو دیکھ کر ستارہ پرستوں کو کہا کہ کیا یہ میرا رب ٹھہرتے ہو۔ جب ستارہ چھپ
گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں چھپنے والوں کو پسند نہیں کرتا مطلب یہ تھا کہ میں ایسے کو

خدا ماننا پسند نہیں کرتا اس لیے کہ یہ تو خود حادث ہے اس کا کوئی محدث ہونا ضروری ہے۔ اس طرح جب چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو چاند پرستوں کو فرمایا کہ کیا ان کو میرا خدا بتاتے ہو۔ جب وہ بھی چھپ گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر اللہ کا فضل شامل حال نہ ہوتا اور اس نے مجھے ہدایت نہ عطا کی ہوتی تو میں بھی انہی گمراہوں میں ہوتا۔

اس مقام پر لیڈن لم یھدی سبھی لا کونین من القوم الضالین کے ترجمہ میں بھی مترجمین کی کشتی بچکوتے کھائی نظر آتی ہے۔ کیونکہ یہ کلام تعریض پر مبنی ہے کہ چاند کی پوجا کرنے والے تم گمراہ ہو مجھے تو اللہ نے ہدایت سے نوازا ہے اور یا فرض محال کے بغیر یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اگر اللہ نے مجھے ہدایت پر تائید نہ رکھا تو میں گمراہ ہو جاؤں گا۔ وہ نبی کیسے نبی ہو سکتا ہے جس پر رب کی ہدایت ثابت نہ رہے۔ اسی وجہ سے اس مقام کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اعظمت کا ترجمہ شان خلیل اللہ کے مطابق ہے کہ اگر مجھے میرا رب ہدایت نہ کرتا تو میں بھی ابھی گمراہوں میں ہوتا، لیکن برخلاف اس کے اگر ایسا ترجمہ کیا جائے "بولا اگر نہ راہ دے مجھ کو رب میرا تو بے شک میں رہوں بہکتے لوگوں میں" تو یقیناً وہم ہوگا کہ نبی حالت نبوت میں بھی بہک سکتا ہے۔ اور اس سے رب کی ہدایت دور ہو سکتی ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔

اسی طرح جب آپ نے سورج کو روشن دیکھا تو سورج پرستوں کو کہا اسے میرا رب کہتے ہو، یہ تو ان سب سے بڑا ہے۔ جب سورج بھی چھپ گیا تو آپ نے فرمایا اے قوم! میں تمہارے شرکاء فعل سے بری ہوں۔

اب اس تمہید کے بعد توجہ فرمائیں ترجمہ کرنے کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ناواقف کو سمجھ آجائے یہ مقصد تو نہیں ہونا کہ عام آدمی قرآن پاک کے ترجمہ کو پڑھ کر قرآن دانی کا دعویٰ کرے سمجھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تارہ کو بھی کہا یہ ہے رب میرا، چاند کو بھی کہا یہ ہے رب میرا، سورج کو بھی کہا یہ ہے رب میرا سب سے بڑا۔ حالانکہ اس طرح کا اقرار تو شرک ہے۔ جمیع انبیائے کرام شرک سے پاک ہیں۔ اسی لیے جلالین، مدارک، روح المعانی، کبیر نے بھی زعم کے الفاظ کو مقدر مانا ہے کہ تم اپنے خیال میں ان کو

میرا رب کہتے ہو۔ تفسیر کبیر میں یقولون کو بھی مقدر مانا گیا ہے۔ معنی یہ ہوگا۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہے میرا رب۔ اس سے واضح ہوگا کہ ترجمہ اعظمت

کا تفسیر کے مطابق ہے۔ باقی تراجم میں تو نسبت ہی براہ راست ابراہیم علیہ السلام کی طرف کر دی حالانکہ یہ سراسر باطل ہے کیونکہ ابراہیم علیہ السلام تو اپنی قوم سے یہ کلام کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک جانتے تھے۔ آپ کا اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی جانتا، اس پر علامہ رازی نے کئی دلائل قائم کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک اختصار کے پیش نظر پیش کر رہا ہوں :- ان ابراہیم علیہ السلام کان قد عرف ربہ قبل هذه الواقعة بالدلیل والدلیل علی صحتہ ما ذکرناہ اخیر عنہ

قال قبل هذه الواقعة لا بعید آثر (اتخذ اصناما للہ الخ) اسماء وقولہ

فی ضلال مبیل (ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے یہ کلام جو فرما رہے ہیں اس واقعہ سے پہلے اپنے رب کو جانتے تھے کیونکہ آپ نے اپنے آپ اور قوم کو پہلی ہی بت پرستی سے روکا اور فرمایا کہ تم بت پرستی کر رہے ہو میں تمہیں اوتھما ہی قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود رب کو پہچانتے ہوں۔ ان هذه الواقعة انما وقعت بعد ان اسماہ اسئلہ ملکوت

السموات والارض حتی رآی من فوق العرش والکرمی وما تختہما الی تحت الثری ومن کان منصب فی الدین کذلک وعلمہ بالملک

کذلک کیف یلیق بہ ان یعقل الہیۃ الکواکب یہ واقعہ بعد میں درپیش

آیا اور جو پہلی آیت کریمہ میں ہے۔ وکذلک نری ابراہیم ملکوت

السموات والارض وہ پہلے کا ہے۔ آپ کو جب اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی بادشاہی

کا دیدار کرایا اور علم دیا یہاں تک کہ آپ نے عرش و کرسی سے اوپر اور نیچے تحت الثری

تک دیکھا جس کا دین میں مینصب ہوا اور اللہ کا اس کو اس طرح علم حاصل ہو، اس کی

شان کے لائق یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تاروں کے خدا ہونے کا عقیدہ کر لے۔

انہ تعالیٰ قال فی صفتہ ابراہیم علیہ السلام (ادعاء سبہ بقلب سلیم) وقل

مراتب القلب السليم ان يكون سليما عن الكفر فاينما مدحة وقال ولقد
اتينا ابراهيم من قبل من اول ضمان الفكرة وقوله وكنائب
عالمين اى بطهارته وكمالہ ونظيره قوله تعالى الله اعلم حيث
يجعل من سالتہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان میں یہ فرمایا ہے:
اذ جاء ربہ بقلب سليم جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سلامتی دل کے ساتھ
رب کے پاس پیش ہوئے یعنی غیور دل کو دل میں جگہ نہ دی بلکہ خالص دل کو رب کی طرف
متوجہ کیا قلب سليم کا کم سے کم یہ رتبہ ہے کہ وہ کفر سے سلامتی میں ہو اور اسی طرح آپ
کو اللہ تعالیٰ نے ابتدائی سوچ میں ہی رشد و ہدایت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے طہارت
وکمال کو جانتا ہے اور اللہ اسے ہی رسول بناتا ہے جو اس منصب کا اہل ہوتا ہے
ان آیات سے پتا چلا کہ آپ رب کو پہلے ہی جانتے تھے۔ یہ کلام ان لوگوں سے
ان کو ہدایت پر لانے کے لیے تھی۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت اب روز روشن کی طرح
عیاں ہوئی کہ آپ نے تبارہ یا چاند یا سورج کے رب ہونے کا اقرار نہیں کیا جیسا دوسرے
تراجم سے ظاہر ہے بلکہ آپ نے انھیں کہا تم اپنے زعمِ باطل میں انکو میرا رب کہتے ہو، یہ
رب کیسے؟ یہ تو خود کسی کے تالیخ ہیں۔

وَكَلَّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ (پ ۶)

ان سب کو جہان کے لوگوں پر فضیلت بخشی تھی۔ (فتح محمد)۔
اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر۔ (مولانا محمود الحسن)۔
اور ہر ایک کو تمام جہان والوں پر ہم نے فضیلت دی۔ (مولانا اشرف علی)۔
ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت دی۔ (مودودی)۔
اور (ان میں سے) ہر ایک کو ہم نے جہان والوں پر فضیلت دی تھی۔ (عبدالمجید)
اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر (شاہ عبد القادر)
اور ہم نے ہر ایک کو اس کے وقت میں سب پر فضیلت دی (علی احمد)

یہاں چند انبیائے کرام کا ذکر کیا گیا ہے۔ ابراہیم، اسحق، یعقوب، نوح، داؤد،
سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمعیل، المسیح،
یونس، لوط علیہم السلام۔ ان کے متعلق یہی ذکر و فضلنا علی العالمین کا ذکر
ہے۔ اب اگر یہ ترجمہ کیا جائے، ان میں سے ہر ایک کو سب کو تمام جہان والوں پر
فضیلت دی۔ اس طرح تو نبی کریم پر بھی فضیلت لازم آئے گی اور خود ان انبیائے کرام
میں سے ہر ایک کو دوسرے پر فضیلت لازم آئے گی۔ حالانکہ یہ مراد نہیں بلکہ مراد یہ
ہے کہ یہ حضرات اپنے اپنے زمانہ میں فضیلت کے مالک تھے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ روح المعانی سے مطابقت رکھتا ہے۔ روح المعانی میں ہے:
وَكَلَّا اى كل واحد من هؤلاء المذكورين لا بعضهم دون بعضهم فضلنا
بالنسبة على العالمين اى عالمي عصرهم ان میں سے ہر ایک کو
اپنے زمانے میں فضیلت دی گئی ہے۔

بہر حال مراد یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنے اپنے زمانہ میں فضیلت دی گئی۔

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (پ ۶)

تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا۔ (فتح محمد)۔
سو تو مت ہوشک کر نیوالوں میں ہے۔ (محمود الحسن)۔
تحقیق سو تو مت ہوشک لانے والا۔ (شاہ عبد القادر)۔
سو آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں۔ (اشرف علی)۔
لہذا تم شک کرنے والوں میں شامل نہ ہوں۔ (مودودی)۔
سو آپ شک کرنے والوں میں نہ ہو جائیں۔ (عبدالمجید)۔
پس مت ہوشک لانے والوں سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
تو اسے سننے والے! تو ہرگز شک والوں میں نہ ہو۔ (اعلیٰ حضرت)
یہاں بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی یعنی عبد اللہ بن سلام

اور ان کے اصحاب جانتے ہیں کہ بیشک یہ آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا گیا ہے تو اے سننے والے! تو ہرگز شک والوں میں نہ ہو۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں "اے سننے والے" الفاظ کا اضافہ ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو نہیں بلکہ عام مخاطب کو ہے لیکن باقی مترجمین کے تراجم سے پتا چلتا ہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے حالانکہ یہ درست نہیں۔ فلا تكون من الممتريين الشاكين فيه ايها السامع (مدارك) اے سننے والے اس میں ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہو فلا تكون خطاب لكل واحد والمعنى ان لما ظهرت الدلائل فلا ينبغي ان يمتري فيه احد قيل هذا الخطاب وان كان في الظاهر للرسول الا ان المراد منه امت (كبير) یہ خطاب ہر ایک کو ہے۔ معنی یہ ہے کہ جب دلائل ظاہر ہو چکے ہیں کسی ایک کو شک نہیں کرنا چاہیے۔

اور ایک قول یہ کہا گیا ہے۔ اگرچہ ظاہر خطاب نبی کریم کو ہے لیکن مراد آپ کی امت : ويحتمل ان يكون الخطاب في الحقيقة للامته على طريق التعريض وان كان له عليه الصلوة والسلام صورة (روح المعاني) اگرچہ ظاہر خطاب نبی کریم کو ہے لیکن حقیقتہً بطریق تعريض خطاب امت کو ہے۔ ان تفاسیر کی رائے سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مطابقت رکھتا ہے۔ شان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاسدار ہے۔ باقی ارباب تراجم بصیرت سے خالی۔

وَإِنْ تَطْعَمُ أَكْثَرُ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ ۚ (پہ ۴)

اور اگر تو کھانا مانے گا اکثر ان لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھ کو بہکا دیں گے۔ (مجموع الحسن)

اور اگر تو کھانا مانے گا اکثر لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تجھ کو بھلا دیں اللہ کی راہ سے (شاہ عبدالقادر)

اکثر لوگ جو زمین پر آباد ہیں (گمراہ ہیں) اگر تم ان کا کھانا مان لو گے تو وہ تمھیں

خدا کا راستہ بھلا دیں گے۔ (فتح محمد)

• اور دنیا میں زیادہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کھانا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کر دیں گے۔ (مولانا اشرف علی)

• اور اے نبی! اگر تم ان لوگوں کے اکثریت کے کہنے پر چلو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمھیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔ (مودودی)

• اور جو (لوگ) زمین پر آباد ہیں ان میں سے اکثر کا کھانا اگر آپ ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا کر رہیں۔ (عبدالماجد)

• اور اے سننے والے! زمین میں اکثر وہ ہیں کہ تو ان کے کہنے پر چلے تو تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں۔ (اعلیٰ حضرت)

یہاں اکثر سے مراد کفار ہیں : وان تطعم اكثر من في الاسفل اي الكفار لانهم الاكثرون مراد کفار ہیں کیونکہ وہ اکثر تھے۔ یہاں خطاب اگر نبی کریم کو ہے جیسے عام تراجم اس پر صراحت دال ہیں تو مطلب یہ ہو گا کہ لے نبی کریم اگر تم کافروں کی اطاعت کر گے تو راہ راست سے بھٹک جاؤ گے۔ (الحیاء باللہ)

یہاں خطاب نبی کریم کو نہیں بلکہ عام مخاطب کو ہے کیونکہ نبی کریم کا کافروں کی تابعداری کرنا اور دین سے بھٹک جانا ممکن نہیں بلکہ خطاب عام مخاطب کو ہے جیسا کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ظاہر ہے کیونکہ آپ نے ترجمہ میں "اے سننے والے" ذکر کیا ہے۔ اور اس خطاب کو عام رکھنے میں اعلیٰ حضرت منفرد نہیں بلکہ علامہ رازی تفسیر کبیر میں اسی کو ذکر کرتے ہیں : اعلم انه تعالى مما اجاب عن شبهات الكفار شريين بالنسبة لصحة نبوة محمد صلى الله عليه وسلم بين ان بعد نزول الشبهة وظهور الحجة لا ينبغي ان يلتفت العاقل الى كلمات الجهال ولا ينبغي ان يتشوش بسبب كلماتهم الفاسدة فقال وان تطعم اكثر من الارض يضللوك عن سبيل الله جب اللہ تعالیٰ نے کفار کے شبہات کو زائل کیا اور نبی کریم کی نبوت کی حقانیت

کو بیان فرمایا تو ان کے شبہات کے زوال اور دلائل کے ظہور کے بعد بیان کیا کہ کسی عقل کے مناسب نہیں کہ وہ جاہلوں کی باتوں کی طرف توجہ کرے اور نہ ہی کسی کو ان کے کلماتِ فاسدہ سے پریشان ہونا مناسب ہے۔ تو فرمایا: **وَأَن تَطْمَئِنَّ** **فِي الْأَهْضِ** **يَصْلُوهُ** **سَبِيلُ اللَّهِ** یعنی اے سننے والے عقل کے ہوتے ہوئے اگر تو نے کفار کی بات کو مان لیا تو راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔ اس تفسیر کو جو علامہ رازی نے کہیں پیش فرمائی یا علحضرت نے ترجیح کیا ہے اس کو ہر صاحبِ ایمان تسلیم کر چکا لیکن مطلقاً ایسا ترجمہ جس میں خطاب عام بھی نہ ہو اور بالفرض پر بھی مبنی نہ ہوئے عقل کیے قبول کرے۔ اور مولانا مودودی صاحب نے تو اسے ہی ترجمہ کر کے نسبتِ نبی کریم کی طرف کر کے ظلمِ عظیم کیا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ كَذَبُوا بِآيَاتِنَا (پ: ۱۰)

اور نہ چل ان کی خوشی پر جنہوں نے جھٹلایا ہمارے حکموں کو (مولانا محمود الحسن) اور نہ چل ان کی خوشی پر جنہوں نے جھٹلایا ہمارے حکم (شاہ عبد القادر) اور ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا اتباع مت کرنا جو ہماری آیتوں کی تکذ کرتے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)۔

اور ہرگز ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلنا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے۔ (مودودی)۔

اور نہ ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی کیجیے جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (عبدالمجاہد) اور نہ ان لوگوں کی خواہش پر پیروی کرنا جو ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں (فتح محمد) تو تو اے سننے والے ان کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلتا۔ (علحضرت)

یہاں بھی حسبِ سابق علحضرت کے ترجمہ میں ”تو اے سننے والے“ ان الفاظ کا ذکر ہے لیکن باقی تراجم اس سے خالی ہیں۔ باقی تراجم میں نسبتِ نبی کریم کی طرف ہے۔ نبی کریم کا کافروں کی تابعداری کرنا کیسے مقصود ہے جبکہ انبیاء کے کرامِ محصوم ہیں حقیقت یہی ہے

کہ اس سے مراد نبی کریم نہیں بلکہ آپ کی امت ہے۔ والخطاب قیل لکل من یصلح لہ وقیل لیسید المخطبین والمراد امتہ (روح المعانی) یا تو خطاب ہر اس شخص کو ہے جو خطاب کا اہل ہے یا خطاب تو سید الانبیاء کو ہے لیکن مراد آپ کی امت ہی ہے بہر حال دونوں صورتوں میں ترجمہ اے سننے والے الفاظ کا لانا ضروری ہوا تاکہ یہ اشتباہ ہی نہ رہے کہ یہ خطاب نبی کریم کو ہے اور آپ کی شان کے لائق نہیں جب کہ آپ کی قسم کے گناہ کے مرتکب نہیں ہو سکتے تو کیسے ممکن ہے آپ کو کفار کی خواہشات کی تابعداری کرنا۔

قَدْ أَفْرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا إِنَّ عِدَّتَنَا فِي مِلَّتِكَ مُبْعَدٌ
إِذْ نَجَّيْنَا اللَّهَ مِنْهَا (پ: ۱۱)

بے شک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ۔ (محمود الحسن)

ہم تو اللہ پر جھوٹا تہمت لگانے والے ہوئے اگر ہم تمہارے مذہب میں آجائیں (عبدالمجاہد)

اگر ہم اس کے بعد کہ خدا ہمیں اس سے نجات بخش چکا ہے تمہارے مذہب میں لوٹ جائیں تو بے شک ہم نے خدا پر جھوٹا افترا باندھا۔ (فتح محمد)۔ ہم نے جھوٹ باندھا اللہ پر اگر پھر آویں تمہارے دین میں جب اللہ ہم کو خلا کر چکا اس سے۔ (شاہ عبد القادر)۔

ضرور ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے اگر تمہارے دین میں آجائیں بعد اس کے کہ اللہ نے ہمیں اس سے بچایا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے سرداروں نے جب ان سے کہا ہم تمہیں اور تمہارے ساتھ ایمان لانے والوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے یا اپنی تبلیغ جھوٹ کر ہمارے دین کی طرف آجاؤ۔ ان کے قول کا جواب حضرت شعیب علیہ السلام نے اس طرح

دیکھ جب اللہ نے ہمیں تمہارے دین باطل سے بچایا ہے۔ اس کے بعد پھر بھی اگر تم تمہارے دین کی طرف لوٹے تو اللہ پر جھوٹ باندھیں گے۔

اگر یہاں یہ ترجمہ کیا جائے کہ ہم نے ہمنان باندھا یا جھوٹ باندھا اس کا معنی کا تعلق زمانہ ماضی سے ہے۔ حالانکہ یہ حکم ان عدائی ملت کے پر حلق ہے جس کا تعلق زمانہ استقبال سے ہے ان القوم لما قالوا ذلک اجاب شعيب عليه السلام عن كلامهم بوجهين الاول قوله (او لو كنا کارهين) الهمزة للاستفهام والوارد والاحال تقدیرہ اتعید ونبی فی ملتکم فی حال کو اہتنام مع کوئنا کارهين الثاني قوله قد افترينا علی الله کذبا ان عدنا فی ملتکم بعداذننا الله منها والجواب الاول مجری مجری الرمز فی ان لا یعود الی ملتکم وهذا الجواب الثاني تصریح بانه لا یفعل ذلک فقال انزلنا فعلنا ذلک فقد افترينا علی (کبیر) جب قوم نے شعيب عليه السلام کو اپنے دین کی طرف آنے کے لیے کہا آپ نے ان کو دو طرح سے جواب دیا۔ ایک جواب او لو كنا کارهين سے جس میں ہم نے استغنام اور و ا و حالیہ ہے جس کا معنی یہ ہوا کہ کیا ہم تمہارے دین کی طرف توٹیں ایسے حال میں جب کہ ہم اسے ناپسند کرتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ہم تو تمہارے دین کو ناپسند کرتے ہیں۔ دوسرا جواب دیا قد افترينا سے گویا پہلا جواب کنا یتہ تھا کہ ہم تمہارے دین کی طرف نہیں آ سکتے۔ دوسرا جواب صراحت ہے کہ ہم تمہارے دین کی طرف نہیں آ سکتے کیونکہ اگر تمہارے دین کو پسند کریں اور اختیار کریں تو یہ اللہ پر جھوٹ ہو گا۔ ہم اللہ پر جھوٹ نہیں باندھتے۔ لہذا تمہارے دین کو بھی نہیں اختیار کرتے۔

تفسیر کبیر کی اس تفسیر کے بعد سمجھنا آسان ہوا کہ یہاں مسمی شرط و جزا کا ہے۔ زمانہ استقبال کے لحاظ سے ہی ترجمہ صحیح ہے۔ ایسا ترجمہ جو ماضی سے متعلق اس سے وہم ہوتا ہے کہ شاید ایسا واقع ہوا حالانکہ نبی سے کافروں کے دین کو اختیار کرنا محال ہے۔

سَحَرُوا عَيْنَ النَّاسِ (پ ۱۴)

باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو۔ (محمود الحسن)۔

باندھ دیں لوگوں کی آنکھیں۔ (شاہ عبد القادر)۔

لوگوں کی نظر بند کر دی۔ (اشرف علی)۔

لوگوں کی نگاہوں پر جادو کر دیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

فرعون نے جو جادوگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے بلائے تھے انھوں نے جب اپنی رسیاں اور لاشعیاں زمین پر ڈال دیں، لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا جس سے وہ سمجھنے لگے کہ یہ سناں ہیں حالانکہ جادو میں کسی چیز کی حقیقت نہیں بدلتی، صرف دوسرے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا جاتا ہے جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ چیز حقیقتاً بدل گئی حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔

عام طور پر اللہ عز و جل کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ظلال جگہ پر ترجمہ لغوی اعتبار سے درست نہیں۔ معترضین کی یہاں کیوں آنکھیں بند ہو گئی ہیں جبکہ سحر کا معنی آنکھ باندھنا نظر بند کرنا لغوی معنی نہیں بلکہ لغوی جادو ہے وہی مراد بھی ہے سَحَرُوا عَيْنَ النَّاسِ صرفوہا عن حقيقة ادراکھا (جلالین) ان جادو گروں نے لوگوں کی نظروں کو حقیقتِ ادراک سے پھیرا کہ وہ کسی چیز کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے، واجتہبہ القائلون بان السحر محض التوہیہ قال القاضي لو كان السحر حقاً لكانوا قد سحروا

قلوبهم لا عينهم فثبت ان المراد انهم تخيلوا احوالاً عجيبية مع ان الامس في حقيقة ما كانوا على وفق ما تخيلوه قال الواحدی بل المراد سحروا اعین الناس ای قلبوہا عن صحة ادراکها بسبب تلك التوہیات (کبیر) سحر صرف بناوٹ، ملمع سازی ہے اسی وجہ سے قاضی نے کہا ہے اگر سحر حقیقت پر مبنی ہوتا تو جادو گروں کے دلوں پر اثر کرتے نہ کہ آنکھوں پر۔ بظاہر احوال عجیبہ کا تاثر دیا نہ کہ حقیقتاً۔ واحدی نے کہا ہے وہ اپنی ملمع سازی کی وجہ سے کسی چیز کی حقیقت

کے ادراک سے پھر دیتے تھے۔ واضح ہوا کہ لوگ دیکھ رہے تھے نہ انکی آنکھیں بند تھیں نہ نظریں البتہ ان کی آنکھوں پر جادو کیا گیا وہ حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے اور یہی معنی جو حقیقت میں مفقود ہے اور تفاسیر کے مطابق ہے وہ اعلیٰ حضرت کا ہے۔

وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ (پ ۶)

اور مت چلنا مستوں کی راہ۔ (محمود الحسن)۔

اور فساد یوں کی راہ کو دخل نہ دینا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت مہدی علیہ السلام جب طور پر تورایت لینے کے لیے گئے اور اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنی قوم میں چھوڑ کر گئے اور ان کو جو نصیحت کی اسی کا یہ بھی ایک حصہ ہے: وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ وَمِنْ دَعَايَ مَنْ هَدَىٰ إِلَى الْإِفْسَادِ فَلَا تَتَّبِعْ وَلَا تَطْعَمْ (ادراک) جو تمہیں فساد پھیلانے کی طرف بلائے اس کی تابعداری و اطاعت نہ کرنا یعنی فساد یوں کی راہ کو دخل نہ دینا۔ یہ معنی تو تفسیر کے مطابق اور لغت کے مطابق ہے لیکن مفسدین کا معنی مستوں کو نہی لغت کے مطابق ہے۔

إِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ (پ ۶)

بے شک میرا دواؤں پکا ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔ شاہ عبد القادر)۔

میری چال کا کوئی تور نہیں۔ (مودودی)۔

تحقیق مکر میرا مضبوط ہے۔ (شاریع الدین)۔

بے شک میری خفیہ تدبیر بہت پکی ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

ذکر یہ کیا جا رہا ہے کہ جو لوگ ہماری آیات کی تکذیب کرتے ہیں ہم لوگوں کو آہستہ آہستہ اس مقام میں داخل کریں گے جو ان کے لیے مقام ہلاکت ہوگا اس لحاظ سے کہ وہ جانتے نہیں ہوں گے ان کو یہ مہلت دینا یہ میری بہت خفیہ تدبیر ہے ان کا شدید مواخذہ ہوگا:

أَخَذِي شَدِيدَ سَعَاكِ كَيْدِ الْإِنْسَانِ شَبِيهَ بِالْكَيْدِ مِنْ حَيْثُ إِنَّهُ فِي الظَّاهِرِ

احسان فی الحقیقتہ خذلان (ادراک) معنی یہ ہے کہ میری پکڑ سخت ہوگی چونکہ ظاہر مہلت دینے میں احسان اور حقیقت میں رسوائی، اسی وجہ سے اس کو کید سے ثابت و مشاکلت ہے لہذا اس گرفت کو کید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہاں حقیقتاً کید معنی دواؤں نہیں بلکہ معنی پکڑ اور خفیہ تدبیر کے ہے اور یہی معنی شان ربوبیت کے مناسب ہے۔ افسوس کہ توحید کے علمبردار و وحدہ لا شریک لہ ذات کی شان سے بھی یہ خبر ہے جب کہ وہ ذات جملہ عیوب سے پاک ہے اس کی طرف دواؤں کی نسبت کا کیا معنی۔ اسی طرح دالکد کی لاپٹ میں بھی مترجمین نے ٹھوکریں کھائی ہیں۔

وَيَسْكُرُونَ وَيَسْكُرُ اللَّهُ وَابْنُ خَيْرِ الْمَكْرِينَ (پ ۶)

اور وہ بھی دوا کرتے تھے اور اللہ بھی دوا کرتا تھا اور اللہ کا دواؤں سب سے بہتر ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور وہ بھی فریب کرتے تھے اور اللہ بھی فریب کرتا تھا اور اللہ کا فریب سب سے بہتر ہے۔ (شاہ عبد القادر)۔

وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا۔ (مودودی)۔

ادھر تو وہ چال چل رہے تھے، اور ادھر خدا چال چل رہا تھا اور خدا سب سے

بہتر چال چلنے والا ہے۔ (فتح محمد)۔

اور مکر کرتے تھے وہ اور مکر کرتا تھا اللہ اور اللہ نیک مکر کرنے والا ہے۔ (شاہ

رفیع الدین)۔

اور وہ اپنا سا مکر کرتے تھے اور اللہ اپنی خفیہ تدبیر فرماتا تھا اور اللہ کی خفیہ تدبیر

سب سے بہتر ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اگرچہ اس قسم کی بحث پارہ تین میں گزر گئی تاہم زیادتی وضاحت کے لیے اعادہ کیا جا رہا ہے۔ اللہ کی طرف دواؤں کی نسبت کرنا یا فریب کی اور نیز ترجمہ کرنا کہ اللہ بھی دوا کرتا تھا

یابہ کہنا کہ اللہ بھی فریب کرتا تھا یہ معانی یقیناً تفسیر کے خلاف ہیں چنانچہ میں اسی طرح ہے : **وَمِمَّا كَرِهَ اللَّهُ مُبْدًى بَعْضِهِمْ بَعْضًا يَوْمَ يَكْفِي الْمُنَافِقِينَ حُجْرٌ وَاحِدٌ** اوجی الیک ماد بروہ و امرک بالخوج اسی طرح صاوی کی عبارت اس طرح ہے : **جواب عما یقال ان حقیقتہ المکر محالہ علی امثلہ تعالیٰ لانه الاحتمال علی الشئی من اجل حصول العجز عنه واجیب ایضاً ان المراد بمکر امثلہ معاملتہ لہم معاملتہ الماکر حیث خیب سعیم و ضعیف املم و المراد جازا ہم علی مکرہم فسی الجنائک لاند فی مقابلتہ اللہ تعالیٰ کے مکر سے مراد تدبیر ہے۔ یہ اصل میں ایک سوال کا جواب ہے۔ وہ یہ کہ مکر نسبت حقیقتاً رب کی طرف محال ہے کیونکہ کسی چیز پر جلد و مکر اس سے عاجزی کی وجہ سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا عاجز ہونا محال ہے۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں مکر سے مراد ان سے مکر والوں کی طرح معاملہ کرنا کہ ان کی کوشش کو رسوا کیا ان کی امیدوں کو ضائع کیا۔ یا مکر سے مراد ہے انکو ہزا دینا۔ ہزائے مکر کو مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔**

قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا ۝۱۳۴

آپ کہ دیجیے کہ میں اپنی ہی ذات کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا۔ (عبدالماجد)۔

اے نبی ان سے کہو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔ (مودودی)۔

تو کہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے اور نہ بُرے کا (مولنا محمود الحسن) کہ دو کہ میں اپنے فائدے اور نقصان کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا۔ (فتح محمد)۔ آپ کہ دیجیے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا (اشرف علی)۔

تم قرآن میں اپنی جان کے بھلے اور بُرے کا خود مختار نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہاں آپ خود مختار اور سرفروغ ہیں اس قسم کی آیت میں "ذاتی" کی زیادتی ہے یہ غلطی ہے، حالانکہ قرآن پاک میں **إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ** الفاظ مبارکہ خود ہی اس معنی پر دال ہیں کہ ذاتی طور پر آپ مالک نہیں لیکن عطائے الہی سے آپ کو ملکیت حاصل ہے۔ اعلیٰ حضرت کے معنی کے قریب مولانا اشرف علی صاحب کا معنی بھی نظر آتا ہے کیونکہ آپ نے "میں خود" الفاظ زیادہ رکھے ہیں۔ اب یہ کہا جائے کہ میں خود مختار نہیں یا میں ذاتی طور پر اختیار نہیں رکھتا یا میں خود اختیار نہیں رکھتا، تمام کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض کرنا اور مولانا اشرف علی صاحب کے ترجمہ پر اعتراض نہ کرنا انصاف سے بعید ہے میرا بھی یہی معنی ہے تفسیر روح المعانی میں ہے : **الامثالہ** ای الوقت مشیئہ سبحانہ بان یمکنی من ذلک فانی حیث یتذمک بعمشئہ یعنی میں اپنی جان کے نفع و نقصان کا مالک نہیں سوائے اللہ تعالیٰ کی مشیت کے جب وہ مجھے اس کی قدرت عطا کرے تو اس وقت میں اس کی مشیت سے مالک ہوتا ہوں۔ اب یہاں سے واضح ہوا کہ نفی ذاتی ملکیت کی ہے نہ کہ عطائی کی بلکہ عطائی کا ثبوت خود قرآن پاک نے پیش کیا ہے۔ اس پر اعتراض کیا اور پریشان ہونے کی کیا وجہ! اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے : **المراد لا املک لنفسی من الضر والنفع الا قدساً** ماشاء اللہ ان یقدس علیہ یمکنی منہ والمقصود من هذا الکلام بیان انہ لا یقدس علی شی الا اذا قدس اللہ علیہ مراد یہ ہے کہ میں خود بغیر مشیت ایزدی او اس کی قدرت کے عطا کے نفع و ضرر کا مالک نہیں مقصود اس کلام سے یہ ہے کہ بغیر اللہ تعالیٰ کے قدرت عطا کرنے کے میں کسی چیز پر قادر نہیں۔ اس سے بھی یہ مقصد واضح ہوا کہ نبی کریم خود مختار نہیں ذاتی طور پر نفع و نقصان کے مالک نہیں لیکن جب اللہ تعالیٰ آپ کو قادر کرتے تو آپ کو قدرت و ملکیت حاصل ہوتی ہے

بَرَاءَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (پانچ)

جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول سے ان مشرکوں کو جن سے تم کو عہد تھا (شاہ عبدالقادر)

اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے بیزاری ہے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا۔ (انشرف علی)۔

صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمہارا عہد ہوا تھا۔ (محمود الحسن)۔

۴۔ (اے اہل اسلام اب) خدا اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا بیزاری (اور جنگ کی تیاری) ہے (فتح محمد)۔

اعلانِ برأت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدہ کیے تھے۔ (مودودی)

دست برداری ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکین (کے عہد) سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا (عبدالماجد)۔

بیزاری کا حکم سنانا ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں کو جن سے تمہارا معاہدہ ہوا تھا۔ اور وہ قائم نہ رہے۔ (اعلیٰ حضرت)

الطحطرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے کیونکہ بیزاری کا حکم ان مشرکوں سے دیا گیا جنہوں نے وعدے کو توڑا وہ اپنے وعدہ پر قائم نہ رہے کیونکہ بعض وعدے پر قائم بھی رہے تھے۔

اس پر خود آنے والی آیت ہے: **الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ** ثلثہ

ينقضونكم شيئا استثناءً **دال** ہے کہ تمام نقض عہد کے مرکب نہیں ہوئے تفسیر کبیر میں ہے: **قال النجاشي** انما عائد الى قوله **(برأة)** وللتقدير

برأة من الله وسر سول الى المشركين المعاهدين **الذين** لا ينقضون العهد **زجاج** نے کہا ہے کہ اس استثناء کا تعلق برأة سے ہے۔

جمل کلام یہ ہے کہ بیزاری کا حکم ان مشرکین سے ہے جنہوں نے وعدہ کیا اور پھر توڑا، سوائے ان کے جنہوں نے وعدہ نہیں توڑا۔

اب اس بیان کے بعد واضح ہوا کہ بیزاری کا حکم عام نہیں بلکہ ان سے ہے جنہوں نے وعدہ کو توڑا۔ انکو چار ماہ کی مہلت دی گئی اور فرمایا کہ اس کے بعد اگر تم وعدہ پر قائم نہ رہے

تو ہمارے اور تمہارے درمیان ملوث فیصل ہوگی۔ تفسیر مدارک کی عبارت اور زیادہ وضاحت کرتی ہے، وہ یہ ہے: **وسمى انهم عاهدوا المشركين من اهل مكة**

وغیرہم من الحراب فنكثوا الا اناسا منهم وهم بنو خمرہ وبنو کنانہ بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کا مشرکین مکہ وغیرہ سے معاہدہ ہوا تھا لیکن مشرکین نے وعدہ

کو توڑ دیا سو اے چند کے۔ وہ وعدہ کو نہ توڑنے والے بنو خمرہ اور بنو کنانہ تھے۔ اب واضح ہوا کہ الطحطرت کا ترجمہ صحیح مقصد کو واضح کر رہا ہے کیونکہ مقصود ہی یہ بیان کرنا ہے کہ

ان مشرکین سے بیزاری کا حکم ہے جنہوں نے وعدہ کو توڑا۔

خیال ہے کہ یہاں نقض عہد کی وجہ سے بیزاری ہے جو مقید ہے مطلقاً مشرکین سے بوجہ شرک بیزاری کا ذکر دوسری جگہ ہے تفسیر کبیر میں ہے: **لنقاس ان يقول**

لا فرق بين قوله برأة من الله وسر سوله الى الذين عاهدتم من المشركين وبين قوله ان الله برى من المشركين وسر سوله

في الفائدة في هذا التكرار یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں بظاہر فرق نظر نہیں آتا کیونکہ دونوں جگہ میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بیزاری کا حکم ہے۔ تو پھر تکرار کا کیا فائدہ؟

اس سوال کے جواب میں کئی وجوہ سے ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے: **والوجه الثالث في الفرق** انہ تعالیٰ فی الکلام الاول اظهر البرأة عن

المشركين الذين عاهدوا ونقضوا العهد وفي هذه الآية اظهر البرأة عن المشركين من غير ان وصفهم بوصف معين تنبيها على ان

الموجب لهذه البرأة كفرهم وشركهم ودون آیتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں ان مشرکین سے اظہار بیزاری ہے جنہوں نے وعدہ کیا اور پھر توڑ دیا اور دوسری آیت میں مطلقاً مشرکین سے بوجہ کفر و شرک بیزاری کا اظہار ہے جو کسی خاص وصف سے متصف نہیں۔

اذا اخرج الذين كفروا (پنا)

جس وقت نکالا تھا اس کو کافروں نے (مولانا محمود الحسن)۔

جس وقت اس کو نکالا کافروں نے (شاہ عبد القادر)۔

جب آپ کو کافروں نے جلا وطن کر دیا تھا۔ (مولانا اشرف علی)۔

جب کافروں نے اسے نکال دیا تھا۔ (مودودی)۔

جب ان کو کافروں نے گھروں سے نکال دیا۔ (فتح محمد)۔

جبکہ ان کو کافروں نے وطن سے نکال دیا تھا۔ (عبد الماجد)۔

جب کافروں کی شرارت سے انہیں باہر تشریف لے جانا ہوا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر نبی کریم کے واقعہ ہجرت کا ذکر ہے۔ ایک ہی بات کو ذکر کرنے کے انداز میں نمایاں فرق ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ادب احترام کی کرنیں روشن ہیں۔ کیسا خوب ترجمہ ہے کہ ”جب کافروں کی شرارت سے انہیں باہر جانا ہوا“ لیکن اس کے برعکس یہ ترجمہ اس کو کافروں نے نکالا، کس طرح ادب احترام کے کوسوں دور ہے؟ اور اردو محاورہ سے بے خبری کیونکہ اردو میں ادب اور غیر ادب کا لحاظ الفاظ ہی سے سمجھ میں آتا ہے۔ جب تک دل میں محبت مصطفیٰ نہ پائی جائے اس وقت تک یہ لحاظ کرنا کہ ایسے الفاظ استعمال کیے جائیں جن میں تعظیم مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پائی جائے ممکن نہیں۔

فَتَبَطَّلَهُمْ (پڑھا)

سورہ کو دیا ان کو۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اس لیے ان کو توفیق نہیں دی۔ (اشرف علی)۔

تو ان کو ہلنے چلنے ہی نہ دیا۔ (فتح محمد)۔

تو ان میں کاہلی بھردی (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے یہاں پر غزوہ تبوک کا ذکر ہے کہ (منافقین) جن کا اللہ اور قیامت پر ایمان نہیں اور ان کے دل دین میں شک کرتے ہیں اور وہ اپنے شک میں متردد ہیں وہی غزوہ تبوک سے پیچھے رہنے کی اجازت طلب کرتے ہیں

اگر وہ نکلنے کا ارادہ رکھتے تو اس کی تیاری بھی کرتے یعنی آلات جنگ اور زور و تیار کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کا نکلنا ناپسند ہوا تو ان میں سستی کو بھردیا۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ”تو ان میں کاہلی بھردی“ تفاسیر کے مطابق ہے: فَتَبَطَّلَهُمْ كَسَلَهُمْ (جلالین) ان کو سست کیا۔ فَتَبَطَّلَهُمْ كَسَلَهُمْ وضعف وغیرہ (مدارک) پس ان میں کاہلی کو بھردیا اور انکی رغبت کو ضعیف کیا۔ اگرچہ کاہلی کو روکنا مستلزم ہے لیکن حقیقت مقصود یہی ہے کہ ان میں کاہلی کو بھردیا اور وہ بوجہ کاہلی کے غزوہ تبوک میں حاضری سے رُکے

فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللَّهُ مِنْهُمْ (پڑھا)

سو ان سے یہ تمسخر کرتے ہیں، اللہ ان سے تمسخر کرتا ہے۔ (عبد الماجد)۔

اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جن کے پاس (راہ خدا میں دینے کے لیے) اس کے سوا کچھ نہیں ہے جو وہ اپنے اوپر شجقت برداشت کر کے دیتے ہیں۔ اللہ ان مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے۔ (مودودی)۔

پھر ان پر ٹھٹھے کرتے ہیں اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے (محمود الحسن)

تو ان سے ہنستے ہیں تو ان سے ہنسی کی سزا دے گا۔ (اعلیٰ حضرت)

اس جگہ پر منافقین کا ذکر ہو رہا ہے جب کہ مسلمانوں نے آیت صدقہ کے نزول کے بعد اپنی اپنی طاقت کے مطابق مال پیش کیا تو جن مسلمانوں نے زیادہ مال پیش کیا انکا منافقین نے استہزاء کیا کہ یہ ریاکار ہیں، اور جن غریب نے مختصر مال پیش کیا ان کا تمسخر اڑا یا کہ یہ مختور سامان لے آئے منافقوں نے تو حقیقتاً مسلمانوں سے ہنسی کی یعنی ان کا ٹھٹھا کیا۔ لیکن

لے مولانا اشرف علی صاحب اور مولانا فتح محمد صاحب کے ترجمہ میں نفعی کا معنی کس حرف نفی کا ہے۔ کیا کوئی حرف نفی پوشیدہ ہے جب یہ نہیں تو نفعی کا ترجمہ تمنا ہے اپنے اہول کے مطابق باطل یہ کیونکہ کسی عربی لفظ کا معنی نہیں۔ ان تراجم کی غلطی پر قلم کو جنبش نہ آئی صرف اعلیٰ حضرت کے ترجمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو محبوب کہنے میں اتنی پریشانی کیوں آئی ہے؟

اللہ تعالیٰ ان کو بھٹھا کی جزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا بھٹھا کرتا اس کی شان کے خلاف ہے۔ اعلیٰ
جہت کے ترجمہ پر ہی تفاسیر وال ہیں جا راہم علی سخریتھ (مدارک) ان کو اللہ
تعالیٰ ان کے سحر کی جزا دیگا۔ جلالین میں بھی اسی طرح عبارت ہے البتہ اس عبارت پر
حاشیہ یہ ہے: قولہ جا راہم نفس سخریتہ تعالیٰ بذلک لتزلیہم عنہا
اللہ تعالیٰ کی سحریت کی تفسیر جزا سے کی گئی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بھٹھا کرنے سے پاک ہے۔
الخصرت کے ترجمہ میں بھی فوقیت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان الوہیت کا لحاظ کیا گیا ہے۔
افسوس کہ توحید کے علم دار رب تعالیٰ کی شان کو مد نظر رکھ کر ترجمہ نہ کر سکے اور نہ سمجھ سکے
کہ اس طرح کا ترجمہ عام اردو خوان کو کتنی ہی دشواریوں میں ڈالے گا۔ ترجمہ کرنے کا مقصد تو
یہ ہے کہ آسانی پیدا کی جائے نہ کہ مشکل میں پھنسانا۔

سَوَّاءُ اللَّهِ فَتَسْبِيحُهُمْ (پ ۱۴۰)

یہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں بھلا دیا۔ (موردی)۔
انہوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ان کو بھلا دیا (فتح محمد)۔
بھول گئے خدا کو پس بھول گیا ان کو اللہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔
بھول گئے اللہ کو سو وہ بھول گیا ان کو۔ (ممود الحسن)۔
وہ اللہ کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ دیا۔ (الخصرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے: ”وہ اللہ کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ نے انہیں چھوڑ
دیا“ جب کہ دیگر مترجمین نے یہ تراجم کیے کہ وہ اللہ کو بھول گئے تو اللہ ان کو بھول گیا
حالانکہ یہ ترجمہ غلط ہے۔ یہ معتبر ہی نہیں کیونکہ یہاں مجاز مرسل ہے ذکر ملزوم کا ہے نہ
لازم ہے۔ دونوں جگہ پر معنی بھولنے والا غلط ہے کیونکہ انسان کو بھولنے پر مواخذ نہیں
اور اللہ تعالیٰ کا بھول جانا بھی محال ہے وہ خدا ہی کیا جو بھول جائے تفسیر کبیر میں اس
طرح پیش کیا گیا ہے: سَوَّاءُ اللَّهِ فَتَسْبِيحُهُمْ واعلم ان هذا الكلام لا يجرى
اجراہ علی ظاہرہ لانا لو حملناہ علی النسیان علی الحقیقۃ فما استفاد

علیہ ذمالان النسیان لیس فی وسع البشر وایضا فی حق اللہ تعالیٰ
محال فلا بد من التاویل وهو من وجهین الاول معناه انہم ترکوا
امرہ حتی صار بمنزلۃ النسی فجا راہم بان صیرہم بمنزلۃ النسی
من ثوابہ ورحمتہ وجاء هذا علی اوجہ الکلام کقولہ وجزا سیئۃ
سیئۃ مثلہا الثانی النسیان عند الذکر فلما ترکوا ذکر اللہ بالعبادۃ
والثناء علی اللہ ترک اللہ ذکرہم بالرحمتہ والافسان وانما حسن جعل
النسیان لانیۃ عن ترک الذکر لان من نسی شیئاً لم یذکرہ فجعل اسم الملزوم
کنایۃ عن اللانہم جلیتے بے شک اس کلام کو ظاہر پر جاری کرنا ممکن نہیں اس
لیے کہ اگر ہم حقیقتاً نسیان کا معنی لیں تو وہ لوگ مذمت کے مستحق نہیں ہو سکتے کیونکہ نسیان انسان
کی طاقت میں نہیں اس طرح اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی نسیان کا اطلاق محال ہے کیونکہ
وہ تو بھولنے سے پاک ہے۔ اس لیے یہاں تاویل ضروری ہے وہ تاویل دو طرح ہے۔
پہلی تاویل یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے امر کو چھوڑا یہاں تک کہ یہ منیرل بھولنے
کے ہے۔ رب تعالیٰ کا ان کو جزا دینا یہ رحمت سے بھلانے کے مترادف ہے۔ یہ کلام اسی
طرح ہے جیسے دوسرے مقام پر رب تعالیٰ نے جزا سیئۃ کو سیئۃ سے تعبیر فرمایا۔ دوسری
تاویل یہ ہے کہ نسیان ضد ہے ذکر کی جب انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی
ثناء کو چھوڑا تو رب تعالیٰ نے ان کو اپنی رحمت و احسان سے یاد کرنا چھوڑا۔ یہاں نسیان
کا معنی ترک ذکر ہی اچھا ہے۔ ملزوم کو لازم سے کنایہ بنایا گیا ہے۔

علامہ رازی کے اس بیان کے بعد کوئی شخص بھی جو صاحب علم و دانش ہے اور
ضد و عداوت سے دور ہے اور انصاف کی نظر سے دیکھتا ہو وہ یقیناً اعلیٰ حضرت کے ترجمہ
کو ہی فوقیت دیگا اور دیگر تراجم میں مترجمین کی بھول اور تفاسیر کے اقوال سے عدم توجہ
کو سمجھ جائے گا۔ افسوس کہ توحید کے دعوے دار خدا کی شان کو بھی سمجھنے سے قاصر
رہے۔

السَّائِحُونَ (پہلے)

یعنی رہنے والے۔ (مولانا محمود الحسن، شاہ عبدالقادر)۔

اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے (مودودی)۔

راہ میں پھرنے والے (شاہ رفیع الدین) روزے والے (علی حضرت)

اس مقام پر بھی علی حضرت کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کیونکہ یہی معنی راجح ہے۔

جلالین میں ہے: السَّائِحُونَ الصَّائِمُونَ جلالین کے حاشیہ پر بحوالہ خطیب اس طرح ہے السَّائِحُونَ واختلف في المراد منهم فقال ابن مسعود وابن عباس هم الصَّائِمُونَ قال ابن عباس رضي الله عنه ما ذكر في القرآن من السَّيَاحَةِ فهو الصوم وقال صلى الله عليه وسلم سَيَاحٌ امْتَقِ الصَّوْمَ وقال عثمان بن مظعون الجهاد في سبيل الله سَيَاحَةٌ وَقَالَ

عطاء السَّائِحُونَ هم طلاب العلم يعني السَّائِحُونَ سے مراد روزہ دار ہیں۔ اگرچہ اس کی مراد میں اختلاف کیا گیا ہے لیکن حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول بھی یہی ہے کہ السَّائِحُونَ سے مراد روزہ دار ہیں بلکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں جس جگہ بھی سیاحت کو استعمال کیا گیا ہے وہ بمعنی روزہ کے ہی ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ میری امت کا سیاح روزہ ہے۔ البتہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے سیاحت سے مراد جہاد فی سبیل اللہ لیا ہے اور حضرت عطاء نے السَّائِحُونَ سے مراد علم کے طلباء لیے ہیں تاہم زیادہ راجح قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا یہی ہے۔

تفسیر کبیر میں السَّائِحُونَ کا معنی روزہ دار کرنا اچھا کہا گیا ہے اور اسی معنی کے حسن پر دلائل قائم کئے گئے ہیں تفسیر کبیر میں اس طرح آتا ہے: السَّائِحُونَ فِيهِ اَفْوَالُ

القول الاول قال عامر المفسرين هم الصَّائِمُونَ وقال ابن عباس كل ما ذكر في القرآن من السَّيَاحَةِ فهو الصَّيَامُ وقال النبي صلى الله عليه وسلم

والسلام سياحة امتي الصيام وعن الحسن ان هذا صوم الفرض وقيل هم الذين يديمون الصيام وفي المعنى الذي لا يجد حسرتا نفسيا لسايم بالصائم وجهان الاول قال الامم هري قيل للصائم سائم لان الذي يسيم في الامم متعبد الزاد مع كان ممسكا عن الاكل والصائم يمسك عن الاكل فلهذه المشابهة يسمى الصائم سائحا الثاني ان اصل السياحة الاستمرار على الذهاب في الارض كالماء الذي يسيم والصائم يستمر على فعل الطاعة وترك المشتبه وهو الاكل والشرب والجماع ^{والوقاع} وعندى فيه وجه آخر وهو ان الانسان اذا امتنع من الاكل والشرب والوقاع وسد على نفسه ابواب الشهوات اتفتحت عليه ابواب الحكمة وتجلت له انوار عالم المجدول ولذلك قال عليه الصلوة والسلام من اخلص الله اربعين صباحا ظهرت ينابيع الحكمة من قلبه على لسانه فيصير من السَّائِحِينَ في عالم جلال الله المستقلين من مقام الحن مقام ومن درجة الى درجة فيحصل له سياحة في عالم الروحانيات السَّائِحُونَ میں کئی اقوال ہیں۔ عام مفسرین کے نزدیک روزے والے ہیں۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا، قرآن پاک میں جس جگہ بھی سیاحت ذکر ہے اس سے مراد روزہ ہی ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں اس سے مراد فرضی روزہ ہے اور بعضوں نے کہا اس سے مراد ہمیشہ روزہ میں ہونا ہے۔ سائح کی تفسیر روزہ سے کرنے میں دو طریقے سے حسن پایا جاتا ہے ایک یہ کہ ازہر ہی فرماتے ہیں روزہ دار کو سائح کہا گیا ہے اس لیے کہ جو شخص زمین میں عاجزانہ طور پر متوکل ہو کر چلے، اس کے پاس زاد راہ نہ ہو، کھانے پینے سے رکنا ہے اس کو سائح کہتے ہیں۔ روزہ دار بھی چونکہ کھانے پینے سے اپنے آپ کو روک کر رکھتا ہے اسی مشابہت کے پیش نظر اس کو سائح کہتے ہیں۔

دوسری وجہ حسن یہ ہے کہ اصل سیاحت کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر ہمیشہ چلنا جس

طرح پانی ہمیشہ چلتا ہے چونکہ روزہ دار بھی فعل طاعت پر ہمیشگی کرتا ہے کیونکہ وہ خواہ
یعنی کھانے پینے، جماع سے دور رہتا ہے اس لیے روزہ دار کو سناج کہا گیا ہے۔
علامہ رازی فرماتے ہیں، میرے نزدیک ایک وجہ اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ انسان جب
کھانے پینے اور جماع سے رک جاتا ہے تو گویا وہ اپنے نفس پر خواہشات کے دروازے بند کر
دیتا ہے جب وہ خواہشات کے دروازے بند کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر حکمت کے دروازے
کھول دیتا ہے اور اس پر عالم جلال کی تجلیات منور ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے نبی کریمؐ نے
فرمایا، جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کی خاطر اپنے آپ کو چالیس صبح وقف کرتا ہے اس
کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے ظاہر ہوتے ہیں پس وہ شخص صاحبین سے ہو
جاتا ہے۔ صاحبین وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم جلال میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل
ہوتے ہیں اور ایک درجہ سے دوسرے درجہ پر منتقل ہوتے ہیں پس اس شخص کو عالم ارواح میں
سیاحت کا مقام حاصل ہوتا ہے اسی وجہ سے روزہ دار کو سناج کہا گیا ہے کہ وہ بھی اسی
طرح ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتا ہے جس طرح سناج ایک مقام سے دوسرے
مقام پر منتقل ہوتا ہے۔

اب اندازہ کیا جائے کہ سناج کا معنی رونے والے کتنا اچھا تفسیر کے مطابق ہے
اور اس کے حسین ہونے پر کس طرح دلائل قائم کئے گئے ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ (پ ۶)

پھر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا۔ (مودودی)۔

پھر قائم ہوا اوپر عرش کے۔ (شاہ رفیع الدین)۔

پھر قائم ہوا عرش پر۔ (مولانا محمود الحسن)۔ (شاہ عبدالقادر)۔

پھر عرش پر قائم ہوا (مولانا اشرف علی)۔

پھر تخت (شاہی) پر قائم ہوا۔ (فتح محمد)۔

پھر عرش پر استواء فرمایا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ آیت کریمہ اصل میں متشابہات کی اس قسم سے ہے جن کا بظاہر معنی معلوم ہوتا ہے
لیکن مقصد حقیقی معلوم نہیں ہوتا اس لیے جو معنی بظاہر معلوم ہوتا ہے اس کو پیش کرنا عام
آدمی کو الجھن میں ڈالنے کے مترادف ہے اس لیے کہ جب علمی نکات سے بے خبر انسان
فقط اردو ترجمہ کا سہارا لیتے ہوئے علمیت کا دعوے دار پڑھے گا وہ یقیناً یہی سمجھے گا
کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر قیام فرمایا حالانکہ یہ درست نہیں۔ آئیے انحضرت کے ترجمہ کو
تفاسیر کے آئینہ میں دیکھیں جلالین میں ہے: استواء یلیق بہ استواء فرمایا جو اس
کی شان کے لائق ہے۔ اس پر حاشیہ اس طرح ہے: استواء یلیق بہ ہذہ طریقۃ
السلف الغرضین وطریقۃ الخلف المتولین ان المراد بالاستواء الاستیلاء
والتصرف وفي الکرخی فی استواء یلیق بہ یشیر بہ الی ان الاستواء
علی العرش صفتہ سبحانہ بلا کیف ومعناہ انہ سبحانہ استولی علی
العرش علی الوجہ الذی عنہ منزہا عن التکلیف والارستقار
والیضا ظاہر الایۃ یدل علی انہ تعالیٰ انما استوی علی العرش
بعد خلق السموات والارض لان کلمۃ تشرع للتراخی وذلک یدل
علی انہ تعالیٰ کان قبل العرش غنیاً عن العرش فلما خلق العرش
امتنع ان ینقلب حقیقۃ وذاکہ عن الاستغناء الی الحاجۃ فوجب ان
یبقی بعد خلق العرش غنیاً عن العرش ومن کان کذلک امتنع
ان یکون مستقراً علی العرش فنبت بما ذکر انہ لا یمکن حمل
ہذہ الایۃ علی ظاہر ہا بل انما ہذا البیان جلالتہ ملک
وجلالتہ سلطانہ بعد بیان عظمتہ شانہ ووسعتہ

قدستہ بما مرض خلق ہاتیک الاجرام العظام ۱۲ ج

استواء جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے یہ قول سلف صاحبین کا ہے جو اس قسم
کی آیات کا علم اللہ ہی کی طرف تفویض کرتے ہیں اور متاخرین جو آیات کی تاویل کرتے ہیں
ان کے نزدیک استواء سے مراد غلبہ اور تصرف ہے۔ اور کرخی میں ہے کہ استواء جو اس کے

لائق ہے اس سے مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ کا استوار عرش پر بلا کیف ہے بمقصد اس کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عرش پر استوار اس طرح ہے کہ وہ اس پر ٹھکن ہونے اور قرار پکڑنے سے پاک ہے۔ اور ظاہر آیت اس پر بھی دال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استوار عرش پر زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا اس لیے کہ کلمہ تم تراخی کے لیے آتا ہے اور یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تخلیق عرش سے قبل عرش سے بے پرواہ تھا جب عرش کی تخلیق ہوئی تو اس کے بعد بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بے پرواہی رہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا حاجت سے بے پرواہ ہونے کی حقیقت کا انقلاب منع ہے پس ضروری ہے کہ تخلیق عرش کے بعد بھی اللہ تعالیٰ عرش سے بے پرواہ ہی رہے۔

اس سے واضح ہوا کہ آیت کریمہ کو ظاہر پر کھنا ممکن نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ملک و سلطنت کا بیان ہے جب کہ پہلے اس کی عظمت شان اور وسعت قدرت کا بیان ہے۔ اب اس سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے کہ قیام محنتی کرنا درست نہیں بلکہ استوار ہو اس کی شان کے لائق ہے یہی مناسب ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے: ان ہذا یرہم کو نہ تعالیٰ مستقر اعلیٰ العرش یہاں وہم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش پر قیام فرمایا، اس کے جواب میں اگرچہ بسیط کلام کی گنتی لیکن لب لباب یہ ہے: ہذا الایۃ لا یمکن حملہا علی الظاہر یہ آیت ظاہر پر محمول نہیں ہو سکتی کہ معنی لیا جائے کہ عرش پر قیام پکڑا یا قیام کیا۔

قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا (پ ۶)

کہ دے اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے جیلے (مولانا محمود الحسن)۔

تو کہ اللہ سب سے جلد بنا سکتا ہے جیلے۔ (شاہ عبد القادر)۔

کہ دو خدا بہت جلد جیلے کرنے والا ہے۔ (فتح محمد)۔

اللہ بہت کرنے والا ہے مکر۔ (شاہ رفیع الدین)۔

ان سے کہو اللہ اپنی چال میں تم سے زیادہ تیز ہے۔ (مودودی)۔

فرما دو اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے جلد ہو جاتی ہے۔ (الحضرت)

اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق مکر۔ جیلے نہیں۔ اسی وجہ سے مفسرین نے اس کو مجاز پر محمول کیا ہے۔ جلالین نے مکر کی تفسیر مجازات سے کی ہے یعنی جڑائے مکر کو مکر سے تعبیر کیا ہے۔ روح البیان میں ہے اسرع مکر ای اجل عقوبۃ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جڑا جلدی دی جاتی ہے۔ اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے قل اللہ اسرع مکرًا فالعنی ان ہولاء الذخائر لما قابلوا نعمۃ اللہ بالمکر۔ فالتلک سبحانہ وتعالیٰ قابل مکرہم بمکر اشد من ذلک وہومن وجہین الاول ما اعد لهم یوم القیمۃ من العذاب الشدید وفي الدنیا من الفضيحة والخزی والنکال۔ والثانی ان رسل اللہ یکتبون مکرہم ویحفظونہ وتعرض علیہم مافی لبواطنہم الخبیثۃ یوم القیمۃ ویكون ذلک سببا للفضيحة التامة والخزی والنکال۔ نحوذ باللہ تعالیٰ منہ یعنی کفار نے جب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مکر سے مقابلہ کیا پس اللہ تعالیٰ نے ان کے مکر کا شدید طور پر مقابلہ کیا۔ اللہ کی طرف مکر کی نسبت دو وجہ سے ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے قیامت میں شدید عذاب تیار کیا ہے اور دنیا میں رسوائی اور ذلت، عذاب ان کے لیے تیار کیا ہے۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کے ملائکہ ان کے مکر کو صحف میں لکھ کر محفوظ کر لیتے ہیں اور قیامت کے دن ان کی خباثت باطنی کو ان پر پیش کر دیا جائے گا اور یہ ان کے لیے کامل ذلت و رسوائی ہوگی۔ اللہ کی پناہ اس سے!

اب اس تقریر کے بعد واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ مکر نہیں فرماتا بلکہ اس کی خفیہ تدبیر ہے کہ ان کو عذاب دیگا، قیامت کے دن ان کو رسوا کرے گا۔ اب دیکھا جائے گا کہ ینیر جمہ بہتر ہے کہ اللہ جلدی جیلے کرتا ہے یا یہ معنی درست ہے کہ اللہ کی خفیہ تدبیر سب سے جلدی ہو جاتی ہے؟ یقیناً وہی معنی درست ہے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہے۔ اللہ تعالیٰ جب مکر و فریب سے پاک ہو تو اس کو مکار کہنا، جیلے باز، چال چلنے والا کہنا

کسی طرح بھی درست نہیں۔

وَاجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً (پ ۹)

اور اپنے مکانوں کو قبۂ طہر الو۔ (مودودی)۔

اور بناو اپنے گھر قبلہ رو - (مولانا محمود الحسن)۔

اور بناو اپنے گھر قبلہ کی طرف۔ (شاہ عبدالقادر)۔

اور کمر و گھوڑوں انہوں کو رو بہ قتلہ۔ (شاہ رفیع الدین)۔

اور اپنے گھروں کو نماز کی جگہ کرو۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو حکم ہے، قوم کو کہو کہ مصر میں تم مکانات بناؤ اور گھروں کو نمازی جگہ بناؤ۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے، ”گھروں کو نمازی جگہ بناؤ“ اور دوسرے تراجم میں گھروں کو قبلہ کی طرف بناؤ۔ لیکن اسی مقام پر بھی تفاسیر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر دال ہیں جلالین میں ہے: واجعلوا بیوتکم قبلۃ

مصلیٰ تصلون فیہ لتامنوا من الخوف وکان فرعون منعہم من الصلوۃ
اپنے گھروں کو نماز کی جگہ بناؤ اور ان میں نماز ادا کرو تاکہ تم خوف سے امن میں رہو کیونکہ
فرعون ان کو نماز سے روکتا تھا۔ تفسیر کبیر میں اگرچہ تین قول بیان کئے گئے ہیں لیکن اس
کے بعد ان کی اپنی بحث اسی قول کو راجح کر رہی ہے : من الناس من قال المیاجن
البیوت المساجد بعض نے کہا ہے کہ بیوت سے مراد مساجد ہیں۔ پھر آگے اسی قول
کی وضاحت کرتے ہوئے یہ فرمایا والمراد من قوله واجعلوا بیوتکم قبلاً ای اجعلوا
بیوتکم مساجد تستقبلنہا لاجل الصلوۃ تم اپنے گھروں کو مسجدیں (نماز کی جگہ) بناؤ۔
نماز کے لئے ان کی طرف متوجہ ہو۔

اس کے بعد اس واقعہ کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ذکر المفسرون

في كيفية هذه الواقعة وجوها ثلاثة الاول ان موسى عليه السلام ومن معه كانوا في اول امرهم مأمورين بان

یصلوا فی بیوتهم خفیة من الکفرة ثم یظهر علیهم فیؤذوهم
ویفتنونهم عن دینهم كما کان المؤمنین علی هذه الحالة فی
اول الاسلام فی مکه والثانی قیل لما تعالی لما ارسل
مرسی الیهم امر فرعون بتخریب مساجد علی السرائیل
ومنعه من الصلوة فامرهم ان یردوا تعالیا ان یتخذوا
مساجد فی بیوتهم ویصلوا فیها فامرهم فرعون -
الثالث ان تعالی لما ارسل موسی الیهم امرهم ان یردوا
تلك العداوة الشدیة امر الله موسی واهله ان
وقومهم بان یخذوا المساجد علی غم الاعداء
وتکفل تعالی ان یردوا علیهم
عن شر الاعداء - مفسرین نے اس کو کنایت میں
تین وجوہ بیان کی ہیں :-

پہلی ان میں سے یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام **الرحمن** سے متوجہ ہو کر **کو اول وقت میں** یہ حکم تھا کہ وہ اپنے گھروں میں کافروں سے خفی ہو کر **اداکاری کریں** تاکہ وہ **غلاب** گریزاً نہ پہنچائیں اور دین کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا نہ کریں۔ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کو ایسے ہی تھا جس طرح مسلمانوں کو اول اسلام میں مکہ کے مکرمین سے حکم تھا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے قوم کی طرف مبعوث فرمایا تو فرعون نے مساجد کو برباد کرنے کا حکم دیا اور ان کو نماز سے منع کیا تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مساجد گھروں میں بنانے کا حکم دیا کہ وہ قیامت کے دن ان کی وجہ سے ان میں نماز ادا کریں۔

تفسیر اقول یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرمایا تو فرعون نے عداوت شدید کا اظہار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو بار بار علیہ السلام اور ان کی قوم کو حکم دیا کہ وہ مساجد بنائیں تاکہ ان میں ذیل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی

حفاظت فرمائے گا اور دشمن کے شر سے بچائے گا۔

اب تینوں وجوہ سمجھنے کے بعد یہ بات سمجھنی مشکل نہیں رہی کہ گھروں کو نماز کی جگہ بنانے کا حکم دیا۔ صرف گھروں کو قبلہ رو بنانے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہوتا کہ ان میں نماز بھی ادا کی جائے۔ علحضرت کے ترجمہ میں یہی کمال ہے کہ آپ نے کسی مقام پر بھی تفسیر کے راجح قول کو نہیں چھوڑا بلکہ راجح قول کے مطابق ہی ترجمہ کیا۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَوْمَ

- اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے (فتح محمد)
- زمین پر چلنے والا کوئی جانور ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو (مودودی)
- اور کوئی نہیں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اسکی روزی (مولانا محمود الحسن)
- اور کوئی نہیں پاؤں چلنے والا زمین پر مگر اللہ پر ہے اس کی روزی (شاہ عبدالقادر)
- اور کوئی جاندار زمین پر ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمہ اس کا رزق نہ ہو (عبدالماجد)
- اور کوئی جاندار زمین پر چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ (اشرف علی)

- اور زمین پر چلنے والا کوئی ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ کرم بر نہ ہو۔ (علحضرت)

یہاں علحضرت کے ترجمہ میں ذمہ کرم کے الفاظ ہیں۔ باقی تراجم میں اللہ پر یا اللہ کے ذمہ۔ علحضرت کے ترجمہ میں لفظ کرم کی زیادتی ہے۔ وہ کیوں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس لیے کہ یہاں ایک سوال ہوتا ہے تو اس کا جواب دیا گیا ہے۔ تفسیر نے سوال و جواب سے جس مسئلہ کو حل کیا ہے اسنی کو علحضرت نے لفظ کرم زیادہ کر کے حل فرما دیا۔ تفسیر کبیر میں ہے: تعلق بعضهم بانه يجب على الله تعالى لبعض الاشياء بهذه الآية وقال ان كلمته على للوجوب وهذا يدل على ان الاموال البرزخية الى الدابة واجب على الله وجوابه انه واجب بحسب الوعد

والفضل والاحسان یعنی بعض حضرات نے اسی آیت سے استدلال پیش کیا ہے کہ بعض چیزیں اللہ پر واجب ہیں کیونکہ انھوں نے یہ کہا ہے کہ لفظ علی وجوب کے لیے آتا ہے اور یہ دلالت کرتا ہے کہ ہر جان دار کو رزق پہنچانا اللہ پر واجب ہے۔

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے وعدہ کے مطابق فضل و احسان سے اپنے ذمہ لیا ہے نہ کہ اس پر کوئی چیز اضطراراً واجب ہے۔ اسی وجہ سے مدارک نے بھی تفضلاً وجوباً سے تفسیر کی ہے کہ اللہ نے اپنے فضل کی وجہ سے اپنے ذمہ ہر جان دار کی روزی کو لیا ہے نہ کہ بوجہ واجب ہونے کے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں۔ تفسیر روح المعانی میں بھی تقریباً اسی طرح بیان کیا گیا جس طرح کبیر میں ہے اگرچہ الفاظ مختلف ہیں۔

اب تفسیر نے جس مسئلہ کو سوال و جواب کی صورت میں پیش کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں بلکہ اس نے اپنے فضل کی وجہ سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اسی مسئلہ کو علحضرت نے لفظ کرم زیادہ کر کے حل فرما دیا کہ یہاں علی وجوب کے لیے نہیں بلکہ اللہ نے اپنے کرم کی وجہ سے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اسی طرح ۱۵۱ ع میں دکان حقا علینا نصرت المؤمنین کے ترجمہ میں بھی مترجمین نے غلطی کی۔

فَإِنَّا نَسْخَرُهُمْ كَمَا نَسْخَرُكُمْ (پ ۱۶)

- تو ہم ہنستے ہیں تم سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 - تو ہم تم پر ہنستے ہیں۔ (اشرف علی)
 - تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں۔ (مودودی)
 - ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں (عبدالماجد)
 - ایک وقت ہم تم پر ہنسیں گے۔ (علحضرت)
- یہاں علحضرت کے ترجمہ میں ہے ”ہم تم پر ہنس گے“ اور باقی تراجم میں ہے ہم ہنستے ہیں یا ہنس رہے ہیں۔ علحضرت کے ترجمہ میں استقبال کا ذکر ہے۔ باقیوں میں

حال حضرت نوح علیہ السلام کے کشتی بنانے کا ذکر ہو رہا ہے کہ نوح علیہ السلام کشتی بنا رہے تھے اور آپ کی قوم آپ کا تمسخر اڑا رہی تھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ایک وقت ہم تم پر نہیں گئے خود قرآن پاک کے سیاق و سباق سے بھی یہی سمجھ آتا ہے اور تفسیر کار جہان بھی اسی طرف ہے۔ جلالین میں اذ نخبوننا وغرقتم جب ہم نجات پائیں گے اور تم غرق ہو گے۔ ان کا ہنسا کشتی بنانے کے وقت تھا اور آپ کا ان کے غرق سے متعلق تھا: فاننا نسخر منكم عند سؤیة الهلاك كما تسخرون منا عند سؤیة الفلك ہم تم پر نہیں گئے تمہاری ہلاکت کو دیکھ کر جیسے تم ہم پر نہیں ہنستے ہو کشتی کو دیکھ کر۔

روح المعانی میں ہے: ان تسخروا منا فی الدنیا فاننا نسخر منكم فی الآخرة وغیبل فی الدنیا عند الخرق و فی الآخرة عند الحرق یعنی اگر تم ہم پر دنیا میں ہنس رہے ہو تو ہم تم پر آخرت میں نہیں گئے۔ یا ہم تم پر دنیا میں ہنسیں گے جب تم غرق ہو گے اور آخرت میں نہیں گئے جب تم آگ میں جاو گے۔ تفسیر کبیر میں اگرچہ تین قول ہیں لیکن زیادہ تر پہلا قول ہی باقی تفسیر کے مطابق ہے اور قرآن پاک کے سیاق و سباق کے مطابق ہے۔ وغیہ وجہ الاول التقدیر ان تسخروا منا فی هذه الساعة فاننا نسخر منكم سخریة مثل سخریتكم اذا وقع علیكم الخرق فی الدنیا والخری فی الآخرة اس میں کئی وجہیں ہیں (تین وجہیں ہیں) پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر تم اس وقت ہم سے ہنستے ہو تو ہم تم سے ہنسیں گے تمہاری ہنسی کی طرح جب تم دن میں غرق ہو گے اور آخرت میں رسوا ہو گے۔ زیادہ طور اسی ترجمہ کو مناسب سمجھا گیا ہے اور یہ قول ہی راجح ہے۔

قَالَ يَقَوْمُ هَؤُلَاءِ بَنَانِي هُنَّ أَظْهَرُ لَكُمْ (پ ۱۲)

ان سے کہو بھائیو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں یہ تمہارے لیے پاکیزہ ہیں (مودودی)

کہا اے قوم میری یہ بیٹیاں میری وہ بہت پاکیزہ واسطے تمہارے۔ (شہ رقیع الدین)۔

بولو، اے قوم یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں یہ پاک ہیں تم کو ان سے (محمود الحسن) (شہ عبدالقادر)۔

لوط فرمانے لگے کہ اے میری قوم یہ میری بیٹیاں موجود ہیں وہ تمہارے لئے خاصی ہیں۔ (اشرف علی)۔

بولے اے میری قوم یہ میری بیٹیاں (بھی تو موجود ہیں) یہ تمہارے حق میں پاکیزہ ہیں۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔

کہا اے قوم یہ میری قوم کی بیٹیاں ہیں یہ تمہارے لیے ستھری ہیں (آنحضرت) اس مقام پر لوط علیہ السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے جب کہ آپ کے پاس فرشتے آئے جو ان کی قوم کو عذاب دینے کے لیے آئے تھے لیکن وہ خوبصورت حسین شکلوں میں آئے تھے اور آپ کی قوم کو لواطت کی عادت تھی جب ان کی قوم کو پنا چلا کہ لوط علیہ السلام کے پاس حسین ترین لڑکے آئے ہوئے ہیں وہ دوڑتے ہوئے اپنے بڑے ارادے لے کر آئے تو لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم یہ میرے مہمان ہیں تم مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو بلکہ یہ میری قوم کی بیٹیاں دلتامی عورتیں تمہارے لیے ستھری ہیں یعنی ان سے مجاہدت کرنا تمہارے لیے حلال ہے۔

آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ میری اپنی اصلی بیٹیاں (محاذ اللہ) تمام کے لیے پاک ہیں۔ اس مقام پر آنحضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے اور اللہ کے نبی کی شان کے لائق ہے جب کہ دیگر تراجم سے یہ پنا چلتا ہے کہ لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے متعلق کہا۔ اگرچہ ایک یہ قول ملتا ہے کہ آپ نے اپنی بیٹیوں کے متعلق کہا کہ تمہان سے نکاح کر لو لیکن یہ قول مختلف کتبوں کی وجہ سے مرجوح ہو گیا۔ آپ کی بیٹیاں دو تھیں بنات جمع سے دو بیٹیاں پوری قوم کے لیے کیسے کیا صرف اس قوم کے دوسرا مراد تھتے یا کہ پوری قوم؟ کیا کافروں سے نکاح جائز تھا؟ تفسیر روح المعانی میں ہے: اخرج ابو الشیخ

عن ابن عباس وابن ابی حاتم عن ابن جبر و مجاهد وابن ابی الدنبا وابن
عساکر عن السدی ان المراد ببناۃ علیہ السلام نساء امتہ
والاشارة بمہولہ و ملتقزیلہن منزلتہ لما حضر عنده واضافتہن
الیہ لان کل نبی اب لامتہ و فی قرآۃ امین مسعود رضی اللہ
عہ النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم و ہواب لہم و ازواجہ
امہاتہم و قرأ ابی سرحی اللہ عنہ مثل ذلك لکنہ قدم و ازواجہ امہاتہم علی ہر
اب لہم ابو الشیخ نے ابن عباس سے بیان کیا ابن ابی حاتم سے ابن جبر سے اور مجاہد نے
اور ابن ابی الدنبا نے اور ابن عساکر نے سدی سے روایت کیا ہے کہ یہاں لوط علیہ السلام
نے جو بنات کا ذکر کیا ہے اس سے مراد آپ نے اپنی قوم کی عورتیں لی ہیں ہولاء سے
اشارہ ان کو بمنزل حاضر کے سمجھ کر کیا اور ان کی اضافت اپنی طرف کی اور بتائی کہ اس
سے مراد یہ ہے کہ ہر نبی اپنی امت کے باپ کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ حضرت ابن مسعود
کی قرأت میں ہے : النبی اولی بالمؤمنین من انفسہم و ہواب لہم
وازواجہ امہاتہم تبی مومنوں کے ان کی جان سے زیادہ مالک ہیں کیونکہ وہ ان کے
باپ ہیں اور ان کی بی بیائیں ان کی مائیں ہیں حضرت ابی کی قرأت میں بھی اسی طرح ہے
لیکن اس میں و ازواجہ امہاتہم پہلے ہے اور ہواب لہم بعد میں ہے ۔
اعلیٰ حضرت نے جو ترجمہ کیا ہے علامہ رازی نے اس کو ہی پسند کیا ہے اور اپنے
مختار پر دلائل قائم کیے ہیں تفسیر کبیر کی عبارات ملاحظہ ہو :

قال یقوم ہولاء بناتی ہن اطہر لکم خفیہ قولون قال
قتادہ المراد بنات لصلبہ و قال مجاہد و سعید بن جبیر المراد
نساء امتہ لانہن فی انفسہن بنات ولہن اضافۃ الیہ بالتابعۃ
و قبول الدعویۃ قال اہل النحویۃ کفی فی حسن الاضافۃ ادلی
سبب لانہ کان نبیا لہم فکان کالاب لہم قال تعالیٰ و ازواجہ
امہاتہم و ہواب لہم و هذا القول عندی ہو المختار و یدل علیہ

وجہ الاول ان اقدام الانسان علی عرض بناتہ علی العواشب
والفجاس امر متعبد لایلیق باہل المروۃ فکیف باکابر الانبیاء
الثانی و ہوانہ قال ہولاء بناتی ہن اطہر لکم فبناتہ اللواتی من صلبہ
لا تکفی للجمع العظیم اما نساً امتہ ففیہن کفایۃ للکل - الثالث - انہ
صحت الروایۃ انہ کان لہ بنتان و ہما زینتا و زعورا و اطلاق لفظ
البنات علی البناتین لایجوز لما ثبت ان اقل الجمع ثلاثہ

یعنی حضرت لوط علیہ السلام کی اس کلام ہولاء بناتی ہن اطہر لکم
میں دو قول ہیں۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد آپ کی اپنی حقیقی بیٹیاں مراد ہیں لیکن مجاہد
اور سعید بن جبیر نے کہا ہے کہ اس سے مراد آپ کی امت کی عورتیں مراد ہیں اس لیے کہ
وہ آپ کی بیٹیاں ہی تھیں۔ ان کو اپنی طرف قبول دعوت اور متابعت کی وجہ سے منسوب
کیا۔ اس لیے کہ نخلوں کا ضابطہ یہ ہے کہ حسن اضافت میں ادنیٰ مناسبت کافی ہے اس
لیے کہ آپ ان کے نبی تھے اور نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے کیونکہ قرآن پاک میں آتا ہے :
وازواجہ امہاتہم نبی کی بی بیائیں ان کی مائیں ہیں لہذا نبی ان کے باپ ہوئے۔
علامہ رازی فرماتے ہیں، یہی قول میرے نزدیک مختار ہے۔ اس قول کے مختار ہونے

پر کئی وجوہ دال ہیں :-

پہلی وجہ یہ ہے کہ انسان کا اپنی بیٹیوں کو وراثتوں اور فاسقوں فاجروں پر
پیش کرنا یہ بہت بعید ہے۔ اہل مروت کے لائق نہیں۔ اکابر انبیاء یہ کام کیسے کر سکتے
ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ہولاء بناتی
ہن اطہر لکم یہی اپنی حقیقی بیٹیاں اتنی عظیم جماعت کو کافی نہیں ہو سکتی تھیں۔
الکتبہ امت کی عورتیں ان تمام کو کافی ہو سکتی تھیں۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ صحیح روایت ہے کہ آپ کی دو بیٹیاں ہیں، ایک کا نام زینتا
دوسری کا نام زعورا ہے لفظ بنات کا اطلاق (بالحقیقت) دو بیٹیوں پر صحیح نہیں کیونکہ
جمع کے کم از کم تین فرد ہوتے ہیں۔

اب علامہ رازی کی اس تفسیر کے بعد اور اپنے مختار قول پر دلائل قائم کرنے کے بعد
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت بہت روشن ہو گئی اور پتا چلا کہ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کتنے وقت
 تفسیر کے اقوال اور ان میں راجح اور مرجوح اقوال کو ذہن میں رکھا اور راجح قول کو پیش
 کیا۔ اسی وجہ سے آپ کی بصیرت اور دقت نظر قابلِ صد ستائش ہے۔
 اسی طرح مترجمین نے حق لاء بنائی ان کسٹم فاعلین پ ۱۴ ع
 میں بھی غلطی کی۔

إِنَّ آبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (پ ۱۴ ع)

- بے شک ہمارے باپ تو بالکل بہک گئے ہیں۔ (عبدالماجد)۔
- کچھ شک نہیں کہ ابابصر غلطی پر ہیں۔ (فتح محمد)۔
- تحقیق باپ ہمارا البتہ سچ غلطی ظاہر کے ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
- البتہ ہمارا باپ صریح خطا پر ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- البتہ ہمارا باپ خطا میں ہے صریح (شاہ عبدالقادر)۔
- واقعی ہمارے باپ کھلی غلطی میں ہیں (انشر علی)۔
- سچی بات یہ ہے کہ ہمارے آبا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ (مودودی)۔
- بے شک ہمارے باپ صراحتاً ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں (اعلیٰ حضرت)۔
- حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب یہ کہا کہ ہمارے باپ یوسف علیہ
 السلام اور ان کے بھائی سے زیادہ محبت کرتے ہیں حالانکہ ہم طاقت والے ہیں حضرت
 یعقوب علیہ السلام کے زیادہ محبت کرنے کو انھوں نے ان ابدالغی ضلال مبین
 سے تعبیر کیا۔

اعلیٰ حضرت نے ادبِ احترام پر مبنی ترجمہ کیا کہ ہمارے باپ انکی محبت میں ڈوبے
 ہوئے ہیں ہماری طرف توجہ کم کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے مترجمین نے ترجمہ میں خطا
 اور غلطی کی نسبت کی ہے کہ ہمارے باپ خطا پر ہیں غلطی پر ہیں، بہک گئے ہیں۔ بظاہر یہ

یہ نسبت درست نہیں۔ اسی وجہ سے تفسیر کبیر میں اس کو اعتراض و جواب کی پیش درج کیا
 گیا ہے۔ (السوال الثالث)۔ انهم نسبوا اباہم الى الضلال المبين وذلك
 مبالغه في الذم والطعن ومن بالغ في الطعن في الرسول كفر لا سيما اذا
 كان الطاعن ولدا فان حق الابوة يوجب مزيد التعظيم والاحترام
 والجواب المراد منه الضلال عن رعاية المصالح في الدنيا
 لا المبعد عن طريق الرشاد والصواب۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کے لڑکوں نے اپنے باپ کو ضل مبین کی
 طرف کیسے منسوب کیا۔ یہ تو مذمت اور طعن میں مبالغہ ہے اور جو شخص اللہ کے رسول میں
 طعن میں مبالغہ کرے وہ کافر ہے (حالانکہ وہ مومن تھے) پھر باپ ہونے کا حق اور
 زیادہ تعظیم کا سبب ہوتا ہے اولاد کس طرح طعن زن ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ راہِ راست اور حق سے دُوری کو ضل سے تعبیر نہیں کیا۔
 اب مطلب واضح ہوا کہ ان کا مقصد یہی تھا کہ ہمارے باپ ان کی محبت میں ڈوبے ہوئے
 ہیں اور ہماری طرف توجہ کم کرتے ہیں۔ ایک ہی مقصد کو دو مختلف طریقوں سے پیش
 کیا گیا کیونکہ ایک ترجمہ ادبِ احترام پر دال ہے اور دوسرے تراجم میں اس مقصدِ عظیم کا
 خیال نہیں کیا گیا اور ایسے تراجم کئے گئے ہیں جو صراحتاً بے ادبی پر دال ہیں۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّآیْ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (پ ۱۴ ع)

اور البتہ عورت نے فکر کیا اس کا افساس نے فکر کیا عورت کا۔ اگر نہ ہوتا یہ کہ
 دیکھتے قدت رب اپنے کی۔ (مولانا محمود الحسن)۔

اور اس عورت نے ان کا قصد کیا اور انھوں نے اس کا قصد کیا اگر وہ اپنے
 پروہگار کی نشانی نہ دیکھتے (فتح محمد)۔

اور تحقیق قصد کیا اس عورت نے ساتھ یوسف کے اور قصد کیا یوسف نے
 ساتھ اس کے اگر نہ دیکھ لیتا دلیل اپنے رب کی۔ (شاہ رفیع الدین)

اور البتہ عورت نے فکر کی اس کی اور اس نے فکر کی عورت کی اگر نہ ہوتا یہ کہ دیکھی قدرت اپنے رب کی۔ (شاہ عبد القادر)۔

• اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ خیال ہو چلا تھا۔ (مولانا اشرف علی)۔

• اور اس (عورت) کے دل میں ان کا خیال جم ہی رہا تھا اور انھیں بھی اس (عورت) کا خیال ہو چلا تھا اور اگر اپنے پروردگار کی دلیل کو نہ دیکھ لیا ہوتا (عبدلہ)۔
• بے شک عورت نے اس کا ارادہ کیا اور وہ بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے جب کہ ان کو عزیز مصر کی عورت نے کمرے میں بند کر کے دروازے بند کر دیے اور اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا ارادہ کیا لیکن یوسف علیہ السلام نے معاذ اللہ کہہ کر اس سے براہ کا اظہار کیا اور دل میں کسی قسم کا بُری خواہشات کا ارادہ نہ کیا۔ یہی مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے کہ آپ اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے تو اس عورت کا ارادہ کرتے لیکن آپ نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی لہذا کوئی ارادہ نہ کیا۔ لیکن بخلاف اس کے باقی تراجم میں یہ بات موجود نہیں جو اللہ کے نبی کی شان پر دال ہو بلکہ باقی تراجم سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح عورت کی فکر تھی اسی طرح آپ نے بھی فکر کی۔ عورت کی فکر تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی خواہشات نفسانیہ کو ناجائز طریقہ سے پورا کرنا چاہتی تھی۔ اگر معاذ اللہ آپ نے بھی اس عورت کی فکر تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ نے بھی ناجائز طور پر خواہشات کو پورا کرنے کی فکر کی۔ یہ شان نبی کے لائق نہیں۔ اسی طرح یہ بھی نبی کی شان سے دور ہے کہ نبی نے کچھ کچھ بُرائی کا خیال کیا ہو یا ارادہ کیا ہو جب کہ عورت نے مکمل طور پر اپنا خیال جمائے رکھا ہو۔ کچھ کچھ بُرائی کا خیال بھی عصمتِ انبیائے کرام کے منافی ہے۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں اقوالِ مفسرینِ کرام دیکھیں تفسیرِ جمل میں ہے: وفي السمين لولا سوية برهان سبه فهم بها لكنه امتنع

هم بهما لوجود سوية برهان سبه فلم يثبت من هه النية كقولك لولا سوية لولا كومتك فالحنان الاكرام امتنع لوجود سوية وبهذا ينخلص

ان الاشكال الذي يورد هنا وهو كيف يليق بمنى ان يهم بالمرأة اور سمين میں آتا ہے: اگر آپ اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو اس عورت کا خیال کرتے لیکن آپ نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی تھی تو اس کے پائے جانے کی وجہ سے آپ سے اس عورت کا ارادہ دور ہی رہا۔ آپ نے خیال تک نہ کیا جیسا کوئی کہے لولا سمد لا كومتك اسی مثال میں معنی یہ ہو گا کہ اگر اہم نہیں پایا گیا بوجہ زید کے پائے جانے کے یعنی زید کے موجود ہونے کی وجہ سے متکلم نے مخاطب کی تعظیم و تکریم نہیں کی۔ پس کہتے ہیں کہ اسی اشکال سے وہ اشکال مندرج ہو گیا جو وارد ہوتا تھا کہ نبی کی شان کے کس طرح لائق ہے کہ وہ ایک عورت سے برائی کا ارادہ کرے۔

اب اس تقریر سے واضح ہے کہ نبی نے ارادہ کیا ہی نہیں کیونکہ پہلے رب کی دلیل دیکھ لی تفسیرِ کبیر میں ہے: ان يوسف عليه السلام كان بريئاً عن العمل الباطل والهم المحرم وهذا قول المحققين عن المفسرين والمنكبين ووجه نقول وعنه نذب. واعلم ان الدلائل الدالة على وجوب عصمة الانبياء عليهم السلام كثيرة۔ بے شک حضرت یوسف

علیہ السلام برے اعمال اور ناپاک ارادوں سے پاک ہیں۔ یہی قول محققین مفسرینِ کرام اور منکبین کا ہے۔ اور علامہ رازی کہتے ہیں کہ ہم بھی اس کے قائل ہیں اور اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو مندرج کرتے ہیں اس لیے کہ انبیائے کرام کی پاک دہنی پر کثیر دلائل موجود ہیں تفسیرِ کبیر میں یہ بھی آتا ہے: ومثل هذا المعصية لو نسبت الى اخس خلق الله تعالى وابعدهم عن كل خير لاستشكل منه فكيف يجوز اسنادها الى الرسول عليه الصلوة والسلام المويّد بالمحجرات القاهرة الباهرة۔

ایسی معصیت کو یعنی زنا کا ارادہ کرنا اگر اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے کسی بہت

بڑے فاسق کی طرف منسوب کیا جائے اور اسی طرح ایسے شخص کی طرف اس قسم کی برائی کو منسوب کیا جائے تو وہ بھی شرم محسوس کرے تو ایک جلیل القدر رسول جن کو عظیم الشان معجزات عطا کیے گئے ہوں ان کی طرف اس قسم کے گناہ کو کیسے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ اس سے آگے اور تفصیل بیان فرماتے ہوئے یہ تحریر کرتے ہیں واعلم ان الذين لهم تعلق بهذه الواقعة يوسف عليه السلام، وتلك المرأة وزوجها والنسوة والشهود وسمب العالمين شهد ببرائته عن الذنب وابلّيس اقرب براءته ايضا عن المحصنة - واذ كان الامر كذلك فحينئذ لم يبق للمسلم توقف في هذا الباب بے شک جن کا اس واقعہ سے تعلق ہے یوسف علیہ السلام اور وہ عورت اور اس کا خاوند اور عورتیں اور گواہ اور اللہ رب العالمین (ان تمام) نے آپ کے متعلق شہادت دی ہے کہ آپ گناہوں سے بری ہیں یہاں تک کہ شیطان نے بھی آپ کی برأت کی شہادت دی ہے جب اس طرح آپ کی برأت پر اتنی گواہیاں موجود ہیں تو مسلمان کو اس میں توقف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں: اما بيان ان يوسف عليه السلام ادعى البرائة عن الذنب فهو قوله عليه السلام هي ما ودنتني عن نفسي وقوله عليه السلام رب السبع احب الي مما يدعونني اليه حضرت يوسف علیہ السلام نے خود اپنے آپ کو گناہوں سے بری ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا کہ (اس عورت) نے خواہش کی کہ میں اپنی حفاظت نہ کروں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ اے میرے رب مجھے قید خانہ زیادہ پسند ہے اس کام سے (برائی سے) جس کی طرف مجھے یہ بلاتی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے یہ ارشادات آپ کی پاکدامنی پر دلالت ہیں واما بيان ان المرأة اعترفت بذلك فلا ريبا قالت للنسوة ولقد ساءدتني عن نفسي فاستعصموا ايضا قالت الآن حصص الحق انما وادنتني عن نفسي وانه لم يصب الصادقين اس عورت نے خود حضرت یوسف علیہ السلام کے بری ہونے کا اعتراف کیا جبکہ اس نے عورتوں کے سامنے اعتراف کیا کہ میں نے اسے اپنی طرف مائل کرنا

چاہا لیکن اس نے اپنے آپ کو بچا لیا۔ اسی طرح اس نے یہ بھی کہا اب بات کھل گئی کہ میں نے ان کو اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن بے شک وہ سچے ہیں۔ عورت کی اس گواہی کے بعد واضح ہوا کہ اس نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو بری الذمہ قرار دیا: واما بيان ان تنوح المرأة اقر بذلك فهو قوله انه من كيدك ان كيدك عن عظيم يوسف اعرض عن هذا واستغفر لذنبك اس عورت کے زنج نے یہ کہا یہ تم عورتوں کا مکر ہے بے شک عورتوں کا مکر بہت بڑا ہوتا ہے۔ اے یوسف تم اس کا خیال نہ کرو اور اے عورت تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ یہ یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی پر اس عورت کے خاوند کی گواہی ہے۔ واما الشهود فقوله تعالى وشهد شاهد من اهله ان كان قميصه قد من قبل فصدقت وهو من الكاذبين الخ یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے بل غل اور عوام کام کے ارادہ سے بری ہونے پر گواہ کی گواہی ثابت ہے کیونکہ شیر خوار بچہ کی یہ شہادت ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض آگے سے پھٹی ہے تو عورت سچی ہے اور وہ غلطی پر ہیں اور اگر آپ کی قمیض پیچھے سے پھٹی ہے تو آپ سچے ہیں اور عورت جھوٹی ہے۔ آپ کی قمیض تو پیچھے سے ہی پھٹی ہوئی تھی لہذا آپ کی برأت پر گواہی ثابت ہو گئی۔ گواہ بھی وہ جو اسی عورت کے خاوندان سے ہے اور ابھی شیر خوار بھی ہے اسی وجہ سے اس عورت کے خاوند نے عورت کو مکار کہا جس کا پہلے ذکر ہو چکا۔ واما شهادة الله تعالى بذلك فقوله كذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصين - فقد شهد الله تعالى في هذه الآية على طهارته اربع موآت اولها قوله لنصرف عنه السوء والفحشاء واللام للتأكيد والمبالغة والثاني قوله والفحشاء اي ذلك الذي لنصرف عنه السوء والفحشاء - والثالث قوله انه من عبادنا مع انه تعالى وعباد الرحمن الذين يمشون على الارض هونا واذ خاطبهم الجاهلون قالوا سلما والاربع قوله المخلصين وفيه قوله ثان ناسمة باسم الفاعل واخرى

باسم المفعول فوسماده باسم الفاعل يدل على كونه اتيا بالطاعات
والغفريات مع صفة الاخلاص ووسماده باسم المفعول يدل على ان
الله تعالى استخلصه لنفسه واصطفاه لحضرتہ۔ وعلى كلا الوجهين
فانه من ادل الالفاظ على كون منزلها عما اضاعوا
البيہ

یوسف علیہ السلام کے بری ہونے کی شہادت دی۔ ہم اس طرح ان سے برائی اور بے حیائی
کو دور رکھیں۔ بیشک وہ ہمارے مخلص بندوں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف
علیہ السلام کے پاک ہونے کی جو شہادت اس آیت میں دی ہے وہ چار مرتبہ ہے۔ پہلی
ان میں سے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لنصرف عنه السوء۔ یہاں لام تاکید
اور مبالغہ کے لیے آتا ہے۔ آپ سے برائی کا دور رہنا یقین ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والغفشاء ذکر کیا یعنی کذلک لنصرف
عنه السوء والغفشاء جب اللہ تعالیٰ نے بے حیائی کو دور رکھنا اپنے ذمہ کر لیا ہے
تو آپ برائی کا ارتکاب یا اس کا خیال کرنا ناممکن ہو گیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا انه من عبادنا کہ وہ
میرے خاص بندوں سے ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندوں کی تعریف اس طرح فرمائی
”اللہ کے وہ بندے جو زمین پر آرام سے چلتے ہیں جب ان سے جاہل کوئی بات کرتے ہیں
تو وہ کہتے ہیں پس سلام۔“ اس سے پتا چلا کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا بندہ کہا وہ منجرب
قبائح نہیں ہو سکتا۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”المخلصین“ اس میں دو قرأتیں ہیں یا
ایم فاعل ہے اور یا ایم مفعول۔ اگر ایم فاعل ہو تو معنی یہ ہوگا کہ آپ طاعات و قربات پر
خلوص سے عمل کرنے والے ہیں اور اگر ایم مفعول ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے
اپنی ذات کے لیے خالص بنایا اور اپنے حضور پسندیدہ کیا۔ دونوں وجہ آپ کی برأت
پر کامل طور پر دل ہیں واما بیان ان ابلیس افترطھا رقبہ فلا نہ خالہ۔

فبعزتک لا غوینہم اجمعین الاعبادک منهم المخلصین فاقربا نہ
لا یمكننا اغواء المخلصین ویوسف من المخلصین لقولہ تعالیٰ انه
من عبادنا المخلصین فكان هذا اقتران من ابلیس بانہ ما اغواءہ
وما اخسلہ عن طریقۃ الہدی

ابلیس نے بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی کا اقرار کیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ
سے جب اس نے مہلت مانگی اس کو قیامت تک مہلت دے دی گئی۔ اس نے کہا، اے
اللہ مجھے تیری عزت کی قسم اب میں سوائے تیرے مخلص بندوں کے تمام کو گمراہ کرتا رہوں گا تو
اس کا یہ اقرار اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مخلص بندوں کو راہِ راست سے
بھٹکانا شیطان کے لیے ممکن نہیں۔ اور یوسف علیہ السلام کا مخلصین سے ہونا بھی یقین
ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخلصین میں سے ہونے کی شہادت دی اور فرمایا

بے شک وہ (یوسف علیہ السلام) میرے مخلص بندوں سے ہیں۔
تو گویا کہ ابلیس کا اقرار ثابت ہو گیا کہ اس نے یوسف علیہ السلام کو نہ بھٹکایا اور نہ ہی بدراہ
کیا۔ و عندہذا نقول هؤلاء الجہال الذین نسبوا الی یوسف علیہ
السلام هذه الغفشیۃ ان كانوا من اتباع دین اللہ تعالیٰ فلیقبلوا
شہادۃ اللہ تعالیٰ علی طہاساتہ وان كانوا من اتباع ابلیس
وجندہ فلیقبلوا شہادۃ ابلیس علی طہاساتہ

اس مفصل تقریر کے بعد علامہ رازی فرماتے ہیں، جو جہلا یوسف علیہ السلام کی
برائی (یا ارادہ برائی) کی طرف نسبت کرتے ہیں اگر وہ اللہ کے دین کے شیع ہیں وہ اللہ کی
شہادت کو قبول کر لیں جو اللہ نے آپ کی پاک دامنی پر جو شہادت دی ہے اسے قبول
کے لشکر کے شیع ہیں تو وہ شیطان نے آپ کی پاک دامنی پر جو شہادت دی ہے اسے قبول
کر لیں۔

اس تقریر کی ابتداء پر نظر ڈالیں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ علامہ رازی نے آپ کو
برائی اور برائی کے خیال اور ارادے سے پاک تسلیم کیا ہے اور اسی پر مفصل دلائل

ہیں۔ اور پھر آگے زیادہ واضح طور پر فرماتے ہیں لا تسلموا یوسف علیہ السلام ہم سبھا والدلیل علیہ انہ تعالیٰ و ہم سبھا لولا ان سمای برهان ربہ وجواب لولا ہمنا مقدم و ہو کما یقال قد کنت من الہاکلین لولا ان خلنا خلصت ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کیونکہ یوسف علیہ السلام نے بُرائی کا ارادہ کیا ہو، کچھ کچھ خیال کیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں و ہم سبھا لولا ان سمای برهان ربہ۔ لولا کا جواب مقدم ہے جیسے کہ کہا جاتا ہے:

قد کنت من الہاکلین لولا ان خلنا خلصت اگر فلاں شخص تجھے نہ چھڑاتا تو ہلاک ہو جاتا۔ مطلب یہ کہ تو ہلاک نہیں ہوا کہ فلاں نے تجھے چھڑا لیا۔ اسی طرح یہاں بھی یہ ہے کہ دلیل رب کی طرف سے پائی گئی۔ لہذا آپ نے ارادہ فرمایا ہی نہیں۔ علامہ رازی نے بہت مفصل بحث کی ہے کئی اعتراضات کے جواب بھی دیئے۔ لیکن اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ بحث بھی اگرچہ طویل ہوگئی لیکن واضح یہ کرنا تھا کہ علحضرت نے کس طرح تفاسیر کے رائج قول کے مطابق ترجمہ کیا ہے اور کیسے ہی شان نبوت کا کٹھا کیا۔ یہ اللہ کی عطا ہے جسے چاہے نواز دے۔

وَاٰخِرُ الْمُنْزِلِیْنَ (پ: ۱۶)

- اور خوب طرح اتارتا ہوں۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- اور خوب طرح اتارتا ہوں مہمانوں کو۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- اور میں سب سے بہتر مہمان نواز ہوں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں ذکر ہے یوسف علیہ السلام کا جب آپ کے بھائی غلہ لے کر واپس آنے لگے تو آپ نے فرمایا کہ آئندہ تم اپنے سوتیلے بھائی کو بھی ساتھ لانا جس کو تم ساتھ نہیں لائے۔ تو ان کے ساتھ آپ نے جو تبلیغ کی وہ ترغیب و ترہیب پر مبنی تھی۔ ترغیب والے حصہ میں یہ فرمایا کہ کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میں تمہیں پورا پورا غلہ عطا کرتا ہوں اور سب سے بہتر مہمان نواز ہوں یعنی تمہاری بہتر طریقہ سے مہمان نوازی کرتا ہوں۔ علحضرت

کا ترجمہ یہی ہے عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ خوب طرح اتارنے کو بہتر مہمان نوازی مستلزم نہیں البتہ خوب طرح مہمان نوازی کو خوب طرح اتارنا مستلزم ہے۔ تفسیر کبیر نے اسی معنی کو پسند کیا ہے فرماتے ہیں وانا خیر المنزلین ای خیر المضیفین لانہ حین انزلہم احسن ضیافتہم یعنی میں سب سے بہتر مہمان نواز ہوں اس لیے کہ جب بھی ان کو اتارا تو ان کی اچھی مہمان نوازی کی۔

وَاِنَّا لَفَاعِلُوْنَ (پ: ۱۶)

• اور ہم کو یہ کام کرنا ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

• اور ہمیں یہ ضرور کرنا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کے پاس اپنے بھائی کو لانے کا وعدہ کیا تو کہا کہ ہم نے یہ کام ضرور کرنا ہے یعنی ضرور لانا ہے مولانا محمود الحسن صاحب نے ترجمہ میں تاکید کو استعمال نہیں کیا حالانکہ کلام مومکد ہے۔ لفظ اِنّ، لام تاکید جملہ اسمیہ تمام تاکید پر دال ہیں لیکن علحضرت نے ترجمہ میں اس کا خیال رکھا۔

تفسیر مدارک میں ہے: وانا لفاعلون ذلک لا محالۃ لا تضبط فبہ ولا منتولیٰ۔ ہم نے یہ کام ضرور کرنا ہے: نہ ہم اس میں کوئی کوتاہی کریں گے اور نہ مستستی بروض المعانی میں بھی اسی طرح ہے۔

كَذٰلِكَ كَدَّنَا لِيُوسُفَ (پ: ۱۶)

یوں داؤ بتا دیا ہم نے یوسف کو۔ (شاہ عبدالقادر)، (مولانا محمود الحسن)۔

ہم نے یوسف کو یہی تدبیر بتائی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں علحضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے اور شان الوہیت کا لحاظ کیا گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ داؤ یا مکر نہ کرتا ہے نہ سکھاتا ہے تفسیر روح المعانی میں ہے:

کدنا لیسف ای صنعنا و دبنا لاجل تحصیل غرضہ من

المقدمات التي ساتبها من حسن السقاية وما يتلوه فالكيد بجان لغوي في ذلك ولا تحققة وهي ان توهم غيرك خلوت متخفية ترميد على ما قالوا حال عليه تعالى يعني ہم نے یوسف علیہ السلام کو نذر سرکھائی کہ وہ کس طرح اپنے بھائی کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔ پیالہ ان کے سامان میں رکھنا پھر کچھ دوسرے مل کے سامان کی تلاش میں پہلے لینا۔ یہ ساری تدبیریں اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائیں۔ کید کا مجازی معنی مراد ہے حقیقی معنی تو لینا ممکن نہیں کیونکہ حقیقی معنی یہ ہے کہ باطن میں کچھ اور ظاہر کچھ اور۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے کہ خود اس پر عمل کرے یا سکھائے

إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ (پ ۱۶۶)

- تو تو اپنی اسی قدیم غلطی میں ہے۔ (مولینا محمود الحسن)
- تو ہے اپنی اسی غلطی میں قدیم کی۔ (شاہ عبد القادر)
- (لوگوں نے) کہا بخدا آپ تو اپنے اسی قدیم وہم میں (مبتلا) ہیں (عبد الماجد)
- اسی قدیم غلطی میں مبتلا ہیں۔ (فتح محمد)
- تو البتہ بیچ وہم اپنے قدیم کے ہے (شاہ رفیع الدین)
- آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں (اشرف علی)
- آپ اپنی اسی پرانی خود رفتگی میں ہیں۔ (الخصرت)

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو بھائیوں پر ظاہر فرمادیا اور قمیص دی کہ اباجان حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں پر رکھنا ان کو بینائی حاصل ہو جائے گی۔ اس خوشخبری کے ملنے سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا مجھے یوسف علیہ السلام کی بواہر ہی ہے۔ اس وقت آپ کے پوتوں اور موجود اہل و عیال نے یہ کلام کی غلطی کے ترجمہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ تم حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت میں وارفتم ہو۔ اللہ کے نبی کی طرف غلطی اور خطا کی نسبت درست نہیں جب کہ وہ آپ کی اولاد بھی تھی اور مومن بھی تھے۔ پہلے بھی اس کی تفصیل گزر

چکی ہے جس کا تعلق آپ کے بیٹوں سے تھا۔ توجہ فرمائیں تو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے مطابق پائیں گے۔

مدارک میں ہے: لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ عَنْ الصَّوَابِ قَدِيمًا فِي إِخْلَاطِ مُحِبَّتِكَ لِيُوسُفَ اَوْ فِي خَطَايَاكَ الْقَدِيمَةِ مِنْ حُبِّ يُوْسُفَ وَكَانَ عِنْدَهُ اِنَّهُ قَدِمَاتٌ یعنی آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی قدیم کثرت محبت میں وارفتم ہیں۔ لہذا یہ بات آپ کی درست نہیں کہ آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہیں حالانکہ وہ تو مرچکے ہیں۔ تفسیر کبیر میں ہے: لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ اِي لَفِي حُبِّكَ الْقَدِيمِ لَا تَقْسِمُ بِهِ وَلَا تَذْهَلُ عَنْهُ یعنی آپ حضرت یوسف علیہ السلام کی قدیم محبت میں ہیں نہ انکو چھوڑتے ہیں اور نہ ہی وہ آپ کے ذہن سے نکلتے ہیں۔

اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی واضح ہو گئی کہ آپ کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے اور نبی کی طرف غلطی کی نسبت کرنا مومن کی شان کے لائق نہیں۔ اس لیے آپ کی اولاد کے حق میں وہ ترجمہ درست نہیں جس میں ان کے ایمان پر حرف آ سکے۔

حَتَّىٰ إِذَا اسْتَأْيَسَّ الرُّسُلَ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِّبُوا اجْأَاهُمْ نَصْرُنَا (پ ۱۶۷)

- یہاں تک کہ جب پیغمبر نائید ہو گئے اور انھوں نے خیال کیا کہ اپنی نصرت کے بارے میں جو بات انھوں نے کہی تھی اس میں وہ سچے نہ نکلے تو ان کے پاس ہماری مدد پہنچی۔ (فتح محمد)
- یہاں تک کہ جب نائید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہتا تھا پہنچی ان کو مدد ہماری۔ (شاہ عبد القادر)
- یہاں تک کہ پیغمبر نائید ہو گئے اور ان کو گمان غالب ہو گیا کہ ہماری فہم نے غلطی کی، ان کو ہماری مدد پہنچی۔ (مولینا اشرف علی)

- یہاں تک کہ جب ثابت ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تھا پہنچی ان کو ہماری مدد (محمود الحسن)۔
- یہاں تک کہ پیغمبر بالیس ہو گئے اور گمان کرنے لگے کہ ان سے غلطی ہوئی دکھاتے ہیں انہیں ہماری مدد پہنچی۔ (عبد الماجد دریا آبادی)۔
- یہاں تک کہ جب رسولوں کو ظاہری اسباب کی امید نہ رہی اور لوگ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا تھا (اعلیٰ حضرت)۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں مفسرین نے بہت بسیط بحث کی ہے اور جس احتمال کو تفسیر کبیر اور روح المعانی میں رد کیا گیا ہے اس قول کو دیگر مترجمین نے اقبال مفسرین سے بے خبری کے عالم میں پسند کیا اور اسی کے مطابق ترجمہ کیا۔ اور بظاہر جو اعتراض ہوتا ہے جس کا مفسرین کو کام نہ آیا ہے۔ اسی اعتراض کو دور کرنے کے لیے اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ کیا ”یہاں تک کہ رسولوں کو ظاہری اسباب کی امید نہ رہی۔ اس پر بھی یار لوگوں نے اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لیے ان الفاظ میں اعتراض کیا۔“

حق اداستیتس الرسول میں ”ظاہری اسباب“ فاضل بریلوی نے اپنی طرف سے بلا کر قرآن کے اندر بیان کو بدلنے کی کوشش کی۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ ”کذبوا“ میں دو طرح کی قرأتیں ہیں ایک تخفیف سے جتنی کذبوا اور دوسری تشدید سے یعنی کذبوا۔ ہر قرأت پر دو قسم کے قول پیش کئے گئے ہیں یہاں چونکہ تخفیف والی قرأت ہی زیر بحث ہے اس لیے طوالت سے بچتے ہوئے صرف اسی کو پیش کیا جا رہا ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: اعلم انه قد اُعاصم وحمضہ والکسانی کذبوا بالتخفیف وکسر الذال والباقون بالتشدید ومعنى التخفيف من وجهين احدهما ان الضم واقع بالقوم ای حتی اداستیتس الرسول من ایمان القوم فظن القوم ان الرسل کذبوا فیما وعدوا من النصر والظفر۔

جان لو بے شک عاصم اور حمزہ اور کسائی رحمہم اللہ علیہم نے تخفیف سے پڑھا ہے

باقیوں نے تشدید سے اور تخفیف والی قرأت میں دو وجہ ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک یہ ہے کہ گمان قوم سے واقع ہوا یعنی مطلب یہ ہوا کہ جب رسولوں نے قوم کے ایمان سے امید کو منقطع کیا پس لوگ یہ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا تھا، یعنی رسولوں سے جو امداد، کامیابی کا وعدہ کیا گیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا۔ اب اس وجہ کے مطابق اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر غور کریں، آپ نے ترجمہ کیا ”لوگ یہ سمجھے کہ رسولوں نے ان سے غلط کہا ہے“ یہ ترجمہ اس قول کے عین مطابق ہے لیکن دیگر مترجمین نے دوسری وجہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے جس کو مفسرین نے رد کیا ہے کیونکہ کسی نے ترجمہ کیا ”اور رسول“ خیال کرنے لگے ان سے جھوٹ کہا تھا“ کسی نے ترجمہ کیا ”اور ان (رسولوں) کو گمان غالب ہو گیا ہماری فہم نے غلطی کی۔“

تفسیر کبیر نے دوسری وجہ بیان کی اور رد کیا ہے اسے دیکھیں: والوجه الثاني ان يكون المعنى ان الرسل ظنوا انهم قد كذبوا فيما وعدوا وهذا التاويل منقول عن ابن ابی مليكة عن ابن عباس رضي الله عنهما قالوا وانما كان الامر كذلك لاجل ضعف البشرية الا انه بعيد لان المؤمن لا يجوز ان يظن بامثله الكذب بل يخرج بذلك عن الايمان فكيف يجوز مثل ذلك على الرسل

دوسری وجہ یہ ہے کہ رسولوں نے گمان کیا کہ بے شک جو ان سے وعدہ کیا گیا تھا اس میں وہ جھوٹا ہے کئے (ترجمہ کو دیکھیے خیال کرنے لگے ان سے جھوٹ کہا تھا ایہ تاویل ابن ابی ملیکہ سے ہے۔ انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔ انہوں نے کہا گویا یہ بوجہ ضعف بشریت کے ہے لیکن علامہ رازی نے اس پر کور کیا اور کہا یہ بہت بعید ہے کیونکہ ایک مؤمن کی شان کے لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ کا گمان کرے بلکہ ایسا خیال کرنے والا شخص ایمان سے ہٹی چکا ہے ایسا قول رسولوں سے کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

اب توجہ فرمائیں کہ جس قول کو رد کیا گیا ہے کہ رسولوں سے ممکن نہیں کہ وہ

اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو جھوٹ خیال کریں۔ اسی قول کے مطابق تراجم آپ کو نظر آئیں گے لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بلا غما ہے کیونکہ آپ کا ترجمہ پہلے قول کے مطابق ہے جو معتبرین کا طے شدہ قول ہے۔ خیال رہے کہ تفسیر روح المعانی میں اس آیت کریمہ کی تفسیر بہت ہی مفصل ہے چونکہ لب لباب اس کا بھی یہی ہے اس لیے اس کی عبارات کو نہیں پیش کیا جا رہا۔

اب رہا یہ اعتراض کہ اعلیٰ حضرت نے ظاہری اسباب کے الفاظ کا اضافہ کیوں کیا۔ چونکہ یہاں ایک اعتراض ہوتا ہے جس کا جواب روح المعانی میں دیا گیا ہے ایک جواب صراحتہ اور ایک ضمنی جو جواب ایک بحث کے ضمن میں دیا گیا ہے اسی کو اعلیٰ حضرت نے اختیار کیا ہے۔ روح المعانی میں ہے: واستشكل بعضهم نسبة الاستيئاس اليهم عليهم السلام ايضا بناء على ان الظاهر انهم استيئسوا مما وعدوا به واخبروا بكونه فان ذلك ايضا مما يليق بنسبة اليهم واجيب بانه لا يبراد ذلك وانما يبراد انهم استيئسوا من ايمان قومهم - اعتراض یہ ہوتا ہے کہ ناامیدی کی نسبت انبیائے کرام کی طرف بظاہر طور پر کر دی گئی ہے کیونکہ ظاہر آیت چلتا ہے کہ انبیائے کرام سے جو وعدے کئے گئے اور انہیں خیر دی گئی اس سے وہ ناامید ہو گئے حالانکہ انبیائے کرام کی شان کے لائق یہ نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ دیا کہ وہ وعدوں سے ناامید نہیں ہوئے بلکہ قوم کے ایمان لانے سے امیدوں کو منقطع کیا۔ دوسری بحث آپ کی اس طرح ہے: وذلك ان الخبر عن استيئاسهم مطلق وليس في الآية ما يدل على تقديده بما وعدوا به واخبروا بكونه واذا كانت كذلك فمن المعلوم ان الله تعالى اذا وعد الرسل بنصر مطلق كما هو غالب اخباره لم يعين في مائه ولا مكانه ولا صفة فكثيرا ما يعتقد الناس في الموعود به صفات اخري لا يريدون عليها خطاب الحق تعالى بل يعتقدونها اسبابا خري كما اعتقد طائفة من الصحابة رضي الله تعالى عنهم اخبار النبي صلى الله

عليه وسلم لهم انهم يمدخلون المسجد الحرام ويطوفون به ان ذلك يكون عام الحديبية لان النبي صلى الله عليه وسلم خرج معتمرا وسجاء ان يمدخل مكة ذلك العام ويطوف ويسعى فلما استيسوا من ذلك ذلك العام لما صدقهم المشركون حتى قاضاهم عليه الصلوة والسلام على الصلح المشهور بقي في قلب بعضهم شيء حتى قال عمر رضي الله عنه مع انك انت من المحدثين المتخبرين يا رسول الله اننا قد دخل البيت ونطوف قال بل اننا خبثنا انك قد دخلته فقال لا - قال انك داخله و مطوف به -

ناامیدی کی خبریں مطلق ہیں آیت میں کوئی ایسے الفاظ نہیں جو انبیائے کرام کے ساتھ کئے گئے وعدوں اور خبروں کی تفسیر پر دل ہوں۔ لہذا انبیائے کرام سے جو امداد کے وعدے تھے وہ مطلق تھے۔ عام خبروں میں ایسے ہی ہے ان کو کسی زمانے یا مکان یا صفات سے مقید نہیں کیا گیا۔ البتہ لوگوں نے صفات کا اعتقاد کیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا خطاب ان پر دل نہیں جیسا کہ صحابہ کرام نے یہ اعتقاد کیا کہ اسی حدیبیہ کے سال مسجد حرام میں داخل ہونا طواف کرنا معتبر ہے کیونکہ نبی کریم جب عمرہ کرتے کی غرض سے نکلے طواف سعی کی امید کرتے ہوئے لیکن جب نبی کریم نے کفار کے روکنے پر ان سے صلح کر لی جس کے نتائج پر آپ ہی باخبر تھے بظاہر شرط اگرچہ مشکل نظر آتی تھیں لیکن حقیقتہً وہ مسلمانوں کے حق میں مفید تھیں۔ تو مسلمانوں نے ناامیدی کے حال میں کچھ چیزوں کو دلوں میں لایا یعنی کچھ تسکوک پیدا سوئے یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ باوجود اس کے آپ صاحب امام والقار تھے لیکن عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ نے ہمیں خیر نہیں دی تھی کہ ہم بیت اللہ شریف میں داخل ہوں گے۔ اور طواف کریں گے؟ آپ نے فرمایا میں نے خیر دی تھی لیکن کیا میں نے یہ بھی کہا تھا

کہ اسی سال تم بیت اللہ میں داخل ہو گے۔ تو فاروق اعظم نے عرض کیا نہیں یا رسول اللہ! تو آپ نے فرمایا کہ تم ضرور بیت اللہ شریف میں داخل ہو گے اور طواف کرو گے۔ اس بحث کے بعد سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی گی کہ نبی کریم تا امیدیں ہوئے بلکہ آپ بانہر تھے کہ ضرور ہی بیت اللہ شریف میں داخل ہوگا صرف ظاہری اسباب کا وقتی طور پر انقطاع تھا نہ کہ حقیقتہً تا امیدیں دوسرے حضرات کو تھی۔ خود نبی کریم اس سے دور تھے۔

اب اعلیٰ حضرت کی علمی بصیرت اور محبتِ رسل واضح ہو گئی کہ آپ کا ترجمہ مفتخر کرام کی آراء سے مختلف نہیں۔ اگر کوئی شخص تفاسیر کا مطالعہ نہ کرے صرف اپنے دل کو بھانے والے تراجم کو دیکھ کر کچھ اچھا لانا شروع کرے اور یہ بھی سمجھے کہ جس ترجمہ کو بیس من گھڑت کہہ رہا ہوں وہی اقوالِ مفسرین کرام کے عین مطابق ہے اور جن مترجمین کی میں تشریف کر رہا ہوں انہوں نے مروج اقوال کو اپنے تراجم میں پیش کیا ہے اور شانِ انبیاء کرام کے مطابق نہ ہونے پر بظاہر اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو وہ تفاسیر کے مطابق اپنے تراجم سے مندرج نہ کر سکے بلکہ ان کے تراجم پر وہی اعتراضات ہوتے ہیں۔

مِنْ حَمَائِ مَسْنُونٍ دیکھئے

- سنے ہوئے گارے سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- سنے گارے سے (شاہ عبدالقادر)۔
- جو کہ مڑے ہوئے گارے سے بنی تھی۔ (مولانا اشرف علی)۔
- مڑے ہوئے گارے سے۔ (فتح محمد)۔
- جو اصل میں ایک سیاہ بدبودار گارہ تھی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

انسان کی تخلیق کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے انسان کو محبتی ہوئی (کھٹکنا) مٹی سے پیدا کیا جو اصل میں ایک سیاہ بدبودار گارہ تھی۔ یہاں یہ بیان کرنا تو مقصود نہیں ہے

کہ باقی تراجم سے مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں یا وہ کسی اعتراض کو مندرج نہیں کرے یا شانِ الوہیت و رسالت کا صحیح طور پر لحاظ نہیں کیا گیا البتہ اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے تفاسیر کے مطابق بیانِ حقیقت اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی واضح ہے۔

جلالین میں ہے: من حمای طین اسو مسنون متغیر سیاہ رنگ کا گارا بدلا ہوا۔ اس متغیر چمیل کی عبات اس طرح ہے متغیر ای متغیر المراتحت من طویل مکتبہ یعنی زیادہ دیر پھرنے کی وجہ سے اس کی بُو بدلی ہوئی ہو۔ اسی طرح روح البیان میں ہے: قولہ مسنون صفت حمای منقذ و بالفاس سیتہ بن تھ گھٹتہ بواسطہ بسیار بودن در آب یعنی ترکیبی لحاظ سے مسنون صفت ہے حمای کی جس کا معنی بدبودار ہونا۔ پھر فارسی میں بھی یہی معنی کیا ہے کہ زیادہ دیر پانی میں پھرنے کی وجہ سے اس میں بُو آجانا۔ اسی طرح مدارک میں ہے ای طین اسو متغیر سیاہ رنگ کا گارا بدبودار۔ جو بعد میں خشک ہو کر صلصال بن گیا جو بجنے پھٹنے لگا۔

مِنْ نَارِ السَّمُومِ دیکھئے

- آگ لون کی سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔ نو کی آگ سے (محمود الحسن)۔
 - نو کی آگ سے (شاہ عبدالقادر)۔
 - آگ سے وہ ایک گرم ہوا تھی (مولانا اشرف علی)۔
 - آگ کی بیٹ سے (مودودی)۔ گرم آگ سے۔ (عبدالماجد دریابادی)۔
 - بے دھوئیں کی آگ سے (اعلیٰ حضرت)۔
- یہاں جتن کی تخلیق کا ذکر ہے کہ جنوں کو ہم نے انسان سے قبل آگ سے پیدا کیا جس میں دھواں نہیں تھا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بے دھوئیں کی آگ، باقی تراجم، نو کی آگ، آگ جو گرم تھی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے۔ جلالین میں ہے: ہی نار لا دخان لہا تنفذ فی المسام۔ یعنی نار السوم وہ آگ ہے جس میں دھواں

نہیں مسموموں میں نافذ ہو جاتی ہے۔ بریضاوی میں ہے: من نار السموم اى من نار الحار الشديد۔ سخت گرم آگ ہے۔ روح المعانی میں ہے: قیل السموم نار لادخات لها۔ یعنی سموم سے مراد وہ آگ ہے جس میں دھواں نہ ہو۔ وقیل السموم افراط الحول والاضافة من اضافة الموصوف الى الصفة والمراد من النار المضطحة الحارسة۔ یعنی سموم کا معنی سخت گرم۔ یہاں موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے، مراد اس سے سخت گرم آگ ہے۔

وَلَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوْحِي (پہلا)

اس میں اپنی بے بہا چیز یعنی رُوح پھونک دی۔ (فتح محمد)۔
اور پھونک دوں بیچ اس کے رُوح اپنی سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
اور پھونک دوں اس میں اپنی جان سے۔ (شاہ عبد القادر)۔ محمود الحسن۔
اس میں اپنی جان ڈال دوں۔ (اشرف علی)۔
اور اس میں اپنی رُوح سے کچھ پھونک دوں (مودودی)۔
اور اس میں اپنی طرف کی خاص معزز رُوح پھونک دوں (علحضرت)۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ ہے کہ اپنی طرف سے خاص معزز رُوح پھونک دوں۔ باقی تراجم میں ہے اپنی جان ڈال دوں یا اپنی جان سے پھونک دوں، یہاں ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو فرمایا، میں انسان بنانے والا ہوں بھئی مٹوئی مٹی سے، جب میں اس کی تخلیق کر لوں مکمل، اس میں ایک معزز رُوح ڈال دوں تاکہ وہ زندگی حاصل کر لے جہل میں ہے: من روحی من زائدة او تبعیضیۃ اى نفخت فيه روحا حى بعض الاسرار التى خلقها اى ادخلتها واجميتها۔ یعنی من روحی میں من زائدہ ہے یا تبعیضیۃ یعنی میں اس میں رُوح ڈال دوں جو میرے تخلیق شدہ ارجح کا بعض ہو گا۔ جلالین میں ہے: اضاف الروح اليه تشيخا لادم اور حاشیہ جلالین میں ہے اضاف الروح اليه

تشريف كما يقال بيت الله۔

جس طرح بیت اللہ حقیقتاً اللہ کا گھر نہیں بلکہ اضافت تشریف ہے اسی طرح من رُوحی میں اللہ کا رُوح جان نہیں بلکہ مراد وہ رُوح ہے جو اللہ کی مخلوق ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے معزز ترین ہو گئی۔ تفسیر کبیر میں ہے: وانما اضاف الله سبحانه سماوح ادم الى نفسه تشريفاً له وتكريماً لله تعالى نے رُوح آدم کو اپنی طرف تشریف عطا کرنے اور تکریم کے لیے منسوب کیا۔ مقصد واضح ہو کہ اصل مدعی ابھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ایک معزز رُوح پھونکی۔ یہ مقصود نہیں کہ اپنی جان ان میں ڈال دی۔ علحضرت کا ترجمہ ابتداء ہی مقصود کو بیان کر دیتا ہے جب کہ دیگر تراجم میں جب تک تاویل نہ کی جائے اور تفاسیر کی تقریر کو اپنی زبان میں نہ پیش کیا جائے اس وقت تک مدعی حاصل نہیں ہوتا جب کہ ترجمہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام آدمی کو کچھ نہ کچھ قرآن پاک کی سمجھ آجائے ورنہ علمائے کرام جو تفاسیر کی اجاث کو سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ ترجمہ کے محتاج نہیں۔ لہذا وہی ترجمہ ذی شان ہو گا جو عام انسان کو خدشات سے دور رکھے۔ ایسے تراجم کا کیا مقصد جن کے پڑھنے کے بعد دہم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی جان (رُوح) کیسے ڈال دی۔ کیا وہ حادث تو نہیں؟ کیا رُوح باری تعالیٰ اس سے جدا ہو سکتی ہے؟ کیا رُوح کا اس پر اطلاق ہو سکتا ہے؟ اس طرح کے خدشات سے بچنے کے لیے علحضرت کا ترجمہ ہی معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا (پہلا)

- کہ ان سے شراب بناتے ہو (فتح محمد)۔
- لیتے ہو تم اس سے مست کرنے والی چیزیں (شاہ رفیع الدین)۔
- بناتے ہو اس سے نشہ۔ (شاہ عبد القادر)۔ مولینا محمود الحسن)۔
- تم لوگ نشہ کی چیز بناتے ہو (اشرف علی)۔

جسے قم نشہ آور بھی بناتے ہو۔ (مودودی)۔
اس سے نشہ چیریں بناتے ہو (عبدالماجد دریا آبادی)۔

اس سے نبیذ بناتے ہو (علحضرت)۔

اللہ تعالیٰ اپنی نشانوں اور قدرتوں کو بیان فرما رہا ہے اور فرمایا کہ کھجوریں اور انگوروں کے پھلوں سے قم نبیذ بناتے ہو اور اچھا رزق۔ اعلحضرت نے سکر کا معنی نبیذ کیا ہے لیکن دیگر حضرات نے نشہ معنی کیا ہے۔ اگرچہ تفاسیر میں نشہ بھی معنی لیا گیا ہے اور یہ بیان کیا گیا ہے کہ آیت خمر کی حرمت کی آیت سے منسوخ ہے لیکن امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما اس آیت کو منسوخ نہیں مانتے بلکہ وہ اس سے مراد نبیذ لیتے ہیں اور اس کی حالت پر یہی آیت دلیل مانتے ہیں۔ اعلحضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہے۔ مدارک میں ہے: وقیل للسکر النبذ وهو عصیر العنب والزبيب والتمر اذا طبخ حتى يذهب ثلثاه ثم يترك حتى يشتد وهو حلال عند ابی حنیفہ وابی یوسف الى حد السکر ويحتج ان بهذه الآية بیان کیا ہے کہ سکر سے مراد نبیذ ہے۔ نبیذ کے کہا جاتا ہے جو انگور اور کشمش اور کھجور کو جب پکایا جائے اور اس کے دو حصے زائل ہو جائیں ایک حصہ باقی رہ جائے پھر اس کو چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ وہ گاڑھا ہو جائے وہ شیخین کے نزدیک حلال ہے جب تک نشہ نہ دے۔ انھوں نے اسی آیت سے دلیل پکڑی ہے۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ (آیۃ ۲۱)

• اور جن کو پکارتے ہو سوائے اللہ کے نہیں پیدا کرتے کچھ اور وہ پیدا کیے جاتے ہیں مردہ ہیں نہیں زندہ اور نہیں جانتے کب اٹھائیں جائیں گے۔
(شاہ رفیع الدین)

• اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز بھی تو نہیں بنا سکتے بلکہ خود ان کو اور بناتے ہیں وہ لاشیں ہیں بے جان، انکو یہ بھی تو معلوم نہیں کہ اٹھائے کب جائیں گے۔ (فتح محمد)۔

• اور وہ دوسری مہتیاں جنھیں اللہ کو چھوڑ کر لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں مردہ ہے نہ کہ زندہ اور ان کو کچھ معلوم نہیں ہے کہ انھیں کب (دوبارہ زندہ کر کے) اٹھایا جائے گا۔ (مودودی)

• اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا کچھ پیدا انہیں کرتے اور آپ پیدا ہوتے ہیں مردے ہیں جن میں جی نہیں اور خبر نہیں رکھتے کب اٹھائے جائیں گے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
• اور جن کو پکارتے ہیں اللہ کے سوا پیدا انہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں جن میں جان نہیں اور نہیں جانتے کب اٹھائے جائیں گے۔
(مولانا محمود الحسن)

• اور جن کو یہ اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں وہ کسی کو پیدا انہیں کر سکتے اور وہ خود بھی مخلوق ہیں اور وہ مردے ہیں نہ کہ زندہ اور ان کی اتنی بھی خبر نہیں کہ (مردے) کب اٹھائے جائیں گے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔

• اور اللہ کے سوا جن کو پوجتے ہیں وہ کچھ نہیں بناتے وہ خود بنائے ہوئے ہیں۔ مردے ہیں زندہ نہیں اور انھیں خبر نہیں لوگ کب اٹھائے جائیں گے اعلحضرت۔ اس مقام پر اعلحضرت نے یدھون کا ترجمہ کیا ہے ”پوجتے ہیں“ اور دیگر مذکور ترجمہ میں آیا ہے ”پکارتے ہیں“۔ اپنا مقصد ثابت کرنے کے لیے اسی آیت کو بڑے زور و شور سے اسیائے عظام اور انبیائے کرام پر چسپاں کیا جاتا ہے یہی ان کا طریقہ واردات ہے۔ وہی آیتیں جو مشرکین کے حق میں نازل ہوئیں ان کو مسلمانوں پر چسپاں کرنا اور جو آیتیں بنوں کے بارے میں ہیں ان کو اولیاء و انبیاء کرام پر محمول کرنا، بس یہی ان کا ایمان، یہی علم۔ ان کے اعتراضات کا محمود مسلمان، اولیائے کرام اور انبیائے کرام ہیں۔

وقت کو ہی نہیں جانتے ان کو ان کی عبادت پر برا کیا دیں گے۔ یہاں خیال رہے کہ روح المانی میں اموات غیر احیاء کی تاویل کر کے حضرت عمرؓ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ کو بھی شامل کیا ہے اور والدین یدعون کو بھی بعض کے نزدیک عام رکھا گیا ہے لیکن مراد پھر بھی محبوب ہی ہیں۔

بفضلہ تعالیٰ مسلمان انبیائے کرام یا اولیائے کرام کو محبوب نہیں سمجھتے اس لیے اس آیت کریمہ کو اپنے مقصد پر دلیل بنانے والے اس غموسے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

اب دوسری بحث یہ سمجھنے کے قابل ہے کہ توسل اور تبرک آثار صالحین سے جائز ہے۔ پہلے مطلقاً توسل پر پھر انبیائے کرام، اولیائے کرام کے فزارات سے توسل و تبرک پھر زندگی بعد از وفات پر مختصر بحث کر رہا ہوں افضلی بحث اگر مرقس کا سننا اور ان کی ہرزخی زندگی پر اگر کوئی دیکھنا چاہے تو استاذی المکرم حضرت علامہ مولانا ابوالحسن محمد اشرف سیالوی صاحب مدظلہ العالی کی کتاب جلاء الصدر کا مطالعہ کرے اس میں یہ بحث بالتفصیل ہے اور تحقیق و تدقیق پر مبنی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ مبارک تھا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا اس کے بعد وہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے پاس آیا۔ اس جبہ مبارک کو دھو کر اس کے پانی سے بیمار شفا حاصل کرتے حضرت اسماء فرماتی ہیں: وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبسہا فتنفس نفسہا للمرضی لشفی بها مسلم ثم یغسل جلدہ ثانی باب تعویج اناء الذهب والفضة علی الرجال الخ حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ نبی کریم جو جبہ پہنا کرتے تھے ہم اسے مریضوں کی صحت یابی کے لیے دھو کر اس کے پانی کو استعمال میں لاتے تھے۔ اس حدیث پاک کے ماتحت علامہ نووی فرماتے ہیں: وفي هذا الحديث دليل على استحباب التبرک بالآثار الصالحین واثابہم یعنی اس حدیث پاک میں دلیل ہے کہ آثار صالحین اور ان کے کپڑوں سے تبرک حاصل کرنا جائز ہے۔ اب علامہ نووی کی اس تحقیق کے بعد مزید ضرورت نہ رہی کہ بیان کیا جائے کہ آثار صالحین سے تبرک جائز ہے کیونکہ آپ نے صرف جواز ثابت نہیں کیا بلکہ استحباب ثابت کیا ہے۔

جس پر عمل کرنے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت سہل نے ایک مرتبہ ابو حازم اور دیگر حضرات کو بتایا کہ یہ وہ پیالہ ہے جس سے نبی کریم اور آپ کے صحابہ کرام نے پیلے ہیں بعد میں اسی پیالہ سے ان حضرات نے بطور تبرک پیا قال ابو حازم فاخرج لنا سہل ذلك القدح فشربنا فيه شراستو حبه بعد ذلك عمر بن عبد العزیز فرحبہ۔

باب اباحتہ التبرک۔ ابو حازم کہتے ہیں کہ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے وہ پیالہ ہمیں عطا فرمایا، ہم نے اس سے پیا۔ بعد میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے وہ طلب کیا تو ان کو دے دیگا۔ ابو حازم وغیرہ کا اس پیالہ سے پینا اور حضرت عمر بن عبد العزیز کا مانگنا صرف بوجہ تبرک تھا اس میں کوئی اور وجہ نہ تھی بلکہ اس حدیث پاک کی شرح میں علامہ نووی کا بیان نہایت جامع ہے۔ هذا فيه التبرک باتا النبی صلی اللہ علیہ وسلم وما مسوا لبسه او كان منه فيه

سبب وهذا نحو ما اجمعوا عليه واطبق السلف والخلف عليه من التبرک با لمسلوة في مصلى رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي الروضة الكريمة ودخول الغار الذي دخله صلى الله عليه وسلم وغير ذلك ومن هذا اعطاءه صلى الله عليه وسلم ابا طلحة شعره ليقسمه بين الناس واعطاه صلى الله عليه وسلم حقوه لتكفي فيه بفتة وجعله الجريدتين على القبرين وجمعت بنت ملحان عرقه صلى الله عليه وسلم وتمسحوا بوضوئهم وذكوا وجوههم بغمامة صلى الله عليه وسلم واشباه هذا كثيرة مشهورة في الصحيح وكل ذلك واضح لا شك فيه۔ علامہ نووی فرماتے ہیں کہ اس حدیث پاک سے پتہ چلا کہ نبی کریم کے آثار سے تبرک حاصل کرنا بہتر ہے جس کو نبی کریم نے مس کیا ہو یا پہنا ہو یا کسی طرح بھی وہ چیز نبی کریم

کے صندوق میں بزرگ کے دریائے نیل دفن کیا جائے تاکہ وہاں سے پانی گزر کر شہر میں آئے اور سب ہی اس سے فائدہ حاصل کریں۔

نبی کریم کے مزارِ انور سے تبرک

وعن ابی جہزمہ قال قحط

اهل المدينة قحطاً شديداً فشكر الى عائشة فقالت انظروا قبر النبي صلى الله عليه وسلم فاجعلوا فيه كرمي الى السماء حتى لا يكون بينه وبين السماء سقف ففعلوا فمطر وامطر حتى نبت الدشب وسمنت الابل حتى تفتقت من الشحم فسمى عام الفتن سوراہ الدارمی۔ مشکوٰۃ باب الکلیات ابن جوزا سے مری ہے ایک مرتبہ اہل مدینہ سخت قحط میں مبتلا ہو گئے مینی بارش نہیں ہو رہی تھی تو انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس شکایت کی۔ آپ نے فرمایا، نبی کریم کے مزارِ انور کی طرف دیکھو اور ان کے حجرہ سے محوڑا سا سوراخ کر دو یہاں تک کہ آپ کی قبر انور اور آسمان کے درمیان کوئی چھت یعنی حجاب نہ رہے۔ پس صحابہ کرام نے ایسے ہی کیا۔ اتنی کثیر بارش ہوئی جس سے بہت بارش سے بہت سی گھاس اُگی۔ اونٹ وہ گھاس کھا کھا کر اتنے موٹے ہوئے کہ چربی کی وجہ سے ان کی گھانسی وغیرہ پھٹ گئیں۔ اس سال کا نام ہی عام الفتن (پھٹنے کا سال) پڑ گیا۔

اس حدیث کے ماتحت علامہ علی قاری رحمۃ اللہ علیہ مرقاۃ میں بیان فرماتے ہیں۔ وقیل انہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یستشفی بہ عند الجذب فمطر السماء فامرت عائشہ بکشف قبرہ مبالغۃ فی الاستشفاء فلا یبقی بینہ وبين السماء حجاب بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم کے توسل سے جب قحط سالی میں بارش طلب کی جاتی تو بارش ہو جاتی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو فرمایا کہ آپ کے مزارِ انور اور آسمان کے درمیان کوئی حجاب نہ رہے یہ توسل میں مبالغہ ثابت کرنا تھا۔ اسی طرح ایک واقعہ دلوانہم اذ ظلموا انفسہم الخ کے ماتحت بحوالہ مدارک گزر چکا ہے سمجھنے کے لیے کافی ہے بطوالت سے بچنے کے لیے مختصار سے کام لیا جا رہا ہے ورنہ اور کئی

سے متعلق ہوئی ہو اس سے تبرک حاصل کرنا مستحب ہے سلف صالحین متاخرین کا اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ نبی کریم کے نماز پڑھنے کی جگہ نماز پڑھنے سے تبرک حاصل کیا جائے نبی کریم کے روضہ مطہرہ سے تبرک حاصل کیا جائے جس غار میں نبی کریم داخل ہوئے اس غار میں داخل ہو کر تبرک حاصل کیا جائے۔ اس پر نبی کریم کا ابو طلحہ کو اپنے بال مبارک عطا کرنا تاکہ لوگوں میں تقسیم کریں اور ان کو اپنی چادر مبارک دینا تاکہ اس میں بیسی گوشت کریں اور دو قبروں پر درویشوں کا رکھنا۔ اور بنتِ لمحان کا نبی کریم کا پسینہ مبارک جمع کرنا اور صحابہ کرام کا وضو کے پانی کو اپنے جسم پر ملنا اور آپ کے خاتمہ مبارک کو چہروں پر ملنا یہ تمام اسی پر دل ہیں۔ اس قسم کی کثیر صورتیں احادیث صحیحہ میں موجود ہیں اور یہ واضح ہے کہ ان میں کوئی شک نہیں۔

اب علامہ توفی کی وضاحت کے بعد جس کو آپ نے بلا شک کہا ہے اگر کوئی شک کرے تو وہ اپنی قسمت پر رستے ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔ ماننے والے صاحب عقل سلیم کے لیے تو یہ کافی ہے نہ ماننے والے کے لیے کثیر دلائل بھی ناکافی!

مزاراتِ انبیائے کرام اور صلحائے تبرک

حضرت یوسف کی وفات کے بعد بنی اسرائیل میں

سے تبرک حاصل کی غرض سے ہر ایک نے خواہش کا اظہار کیا کہ آپ کو ہمارے محلہ میں دفن کیا جائے۔ مدارک نے پلا توفی مسلماً والحقنی بالصالحین کے تحت بیان کیا، فخاصم اہل مصر و تشاجرو فی دفنہ کل یحب ان یدفن فی محلہم حتی هموا بالقتال فراوا ابن یعلموا لوالد صندوقان من مصر وجعلہ فیہ ودفنوا فی النیل بمکان یسمر علیہ الماء ثم یصل الی مصر لیکونوا کلہم فیہ شرعاً۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی وفات کے بعد اہل مصر نے جھگڑا کیا۔ تمام نے آپ کے دفن میں کوشش کی کیونکہ ہر ایک یہی پسند کرتا تھا کہ آپ کو ہمارے محلہ میں دفن کیا جائے یہاں تک کہ جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر کار اس بات پر صلح ہوئی کہ آپ کو ننگِ ممر

واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں۔

صلی کے مزارات سے توسل

قال الامام الشافعی الحی لا تبرک
بالی حنیفہ رحمۃ اللہ و اجبت الی قبرہ فاذا عرضت لی حاجتہ
صلیت رکعتین و سالت اللہ عند قبرہ فتقضى سرعاً شامی جداول
حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ
سے تبرک حاصل کرتا ہوں۔ آپ کے مزارِ انور پر حاضری دیتا ہوں۔ جب کوئی حاجت
درپیش آتی ہے تو دو رکعت نمازِ تفضل ادا کرتا ہوں۔ پھر امام ابو حنیفہ کی قبر کے پاس اگر
اللہ سے سوال کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ میری حاجت کو جلدی پورا کر دیتا ہے۔
معلوم ہوا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سنو ال تو اللہ تعالیٰ سے کرتے ہیں لیکن امام
اعظم رحمۃ اللہ علیہ کی قبرِ انور کے توسل سے اور تبرک حاصل کرتے ہیں اور ان کی حاجت
پوری کی جاتی ہے۔ معروف الکرخی بن فیر من المشائخ الکبار
مستجاب الدعوات یستقی بقبرہ وهو استاذ السری السقطی۔

رد المختار جداول

سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے اُستاد کرنجی بن فیر ورجوہت بڑے مشائخ سے
مختص بن کی دعا کو قبول کیا جاتا تھا۔ ان کی قبرِ انور کے توسل سے دعا قبول کی جاتی تھی
حیات الانبیاء و اولیاء علیہم السلام حضرت ابوالدرداء سے حدیث مڑی ہے جس
کا کچھ حصہ یہ ہے: ان اللہ حرم علی الارض ان تاكل اجساد الانبياء
فنبی اللہ حی یرزق۔ رواہ ابن ماجہ مشکوٰۃ باب الجمعة
نبی کریم کا ارشاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا کہ وہ انبیائے کرام
کے جسموں کو کھائے۔ اللہ کے نبی زندہ ہوتے ہیں انکو رزق دیا جاتا ہے۔

اس پر مرقاۃ میں ہے: ولذا قيل اولياء الله لا يمتوتون ولكن
ينتقلون من دار الى دار البقاء۔ اسی وجہ سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ

کے ولی نہیں مرتے لیکن وہ ایک دار سے دوسرے دار میں منتقل ہوتے ہیں۔ یرزق کے
ما تحت لکھتے ہیں: ولا ینافیہ ان یکون هنالك رزاق حسی ایضا وهو
الظاهر المتبادر۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر انبیاء کو رزق دیے جاتے کے متعلق یہ کہا
جائے کہ ان کو فی الواقع حسّار زق دیا جاتا ہے یہ کوئی منافی نہیں بلکہ ظاہر متبادر ہی
ہے۔ والبیہقی فی کتاب حیاة الانبياء عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ

وسلم قال الانبياء احياء في قبورهم يصلون (الحاوی للفتاوی)
بیہقی نے کتاب حیاة الانبياء میں حضرت انس سے روایت کیا ہے نبی کریم نے فرمایا:
کہ انبیائے کرام اپنی قبر میں زندہ ہوتے ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔ الحاوی للفتاوی
میں بیہقی کے حوالہ سے ہی بیان کیا گیا ہے ان علی بعد موتی کعلی فی الحیوة
نبی کریم فرماتے ہیں کہ میرا علم وفات کے بعد بھی اسی طرح ہے جس طرح ظاہری زندگی میں
قال الشیخ عقیف الدین الیافعی الاولیاء مترج علیہم احوال یشاہدون
فیہا ملکوت السموات والارض وینظرون الانبياء احياء غیر اموات
کما نظر النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی موسی علیہ السلام فی قبرہ
قال وقد تقرر ان ما جاء من انبياء معجزة جاش للا نبياء کرامة
بشرط عدم التحدی (الحاوی للفتاوی)

شیخ عقیف الدین یافعی فرماتے ہیں کہ اولیائے کرام پر احوال پیش کیے جاتے ہیں وہ
زمین و آسمان کے ملکوت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور انبیائے کرام زندہ حالت میں دیکھتے
ہیں جس طرح کہ نبی کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قبر میں دیکھا۔ شیخ یافعی فرماتے
ہیں کہ یہ ثابت ہے کہ جو چیز انبیائے کرام کے لیے بطور معجزہ ثابت ہو سکتی ہے وہ اولیاء
کے لیے بطور کرامت ثابت ہو سکتی ہے البتہ انبیائے کرام کے معجزات بوقت معاوضہ ثابت
ہوتے ہیں لیکن کرامات میں معاوضہ نہ ہونا شرط ہے۔ آخر میں بطور تبرک قبلہ استاذی
المکرم کی کتاب جلالہ الصدور سے ایک حوالہ مح ترجمہ نقل کر رہا ہوں۔ دلائل اس موضوع
پر اسی میں دیکھے جائیں۔ میں نے تو تراجم کا فرق بیان کرتے ہوئے ضمناً اس موضوع پر مختصر

بحث کر دی جس پر تراجم کے فرق کا سمجھنا موقوف تھا۔

علامہ قسطلانی شراح بخاری مواہب لدنیہ میں فرماتے ہیں لا فرق بین مرنہ

وحیاتہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مشاہدۃ الامتہ ومعرفۃہم باحوالہم

ونیاتہم وعزائمہم وخواطرہم وذلك جلی عندہ لاخفاء بہ۔

(مواہب لدنیہ مع زرقانی جلد ثامن ص ۳۰۵) ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری

حیات طیبہ اور عالم برزخ کی زندگی مبارک میں اپنی امت کے مشاہدہ اور ان کے احوال

وکیفیات قلبی ارادوں اور نیات عزائم وخواطر کی معرفت میں کوئی فرق نہیں اور امت

کے سب امور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح و منکشف ہیں۔ ان میں کسی قسم کا خفا

اور پوشیدگی نہیں۔ (انتہی)

صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم محفوظ رہتے ہیں۔ طحطاوی میں آتا ہے کہ خان معاویہ لما

ارادہ تعویلم لیجری العین التي باحد عند قبور الشهداء

وجدهم كما دفنوا حق ان المساحة اصابت اصبع حمزة

رضی اللہ عنہ فانقطرت دما فترکهم۔ طحطاوی فصل الصلوۃ علیہ

(علی الشہید) حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب احد کے شہداء کرام کی قبروں

کو بوسہ کرنے کا ارادہ کیا تا کہ احد کے چشمہ کو جاسی کیا جاسکے۔ ان کو ایسے ہی پایا جیسے

وہ دفن کئے گئے تھے یہاں تک کہ غلطی سے کندالی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی انگلی

مبارک پر لگی تو خون جاری ہو گیا۔ پھر اسی حال پر ان شہداء کرام کو چھوڑ دیا گیا۔

اب اس وضاحت کے بعد ثابت ہو گیا کہ اولیائے کرام اور انبیائے کرام کو قبروں

میں زندگی حاصل ہے۔ ان کے توسل سے دعا جائز ہے۔ کوئی مسلمان ان کو محبوب سمجھ

کر ٹوختا نہیں۔ معبود صرف اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک لہ ہے۔ اب بھی اگر کوئی مسلمان

کو مشرک کہے اور اس آیت کریمہ کو ان پر ثابت کرنے کی کوشش کرے تو اللہ ہی اس کو

ہدایت دے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کے اجسام محفوظ رہنے میں راقم کو اس لیے بھی کامل یقین ہے کہ راقم کے

کے پردادا قاضی غلام نبی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے ۱۸ سال بعد قبر میں سوراخ ہو جانے

کی وجہ سے پانی بھر گیا۔ اس پانی کو نکالنے کے لیے آپ کے جسم مبارک کو قبر سے باہر نکالا

گیا تو جسم صحیح اور کفن درست۔ ڈاڑھی مبارک میں غسل کے پانی کے قطرات موجود تھے۔

قُلْ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ

الصُّبُرِ عَنْكُمْ وَلَا تَحْيَايَاهُمْ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ

يَتَّعُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمْ أَلَيْسَ لَٰهُمُ اقْرَبٌ وَيَجُودٌ رَحْمَتٌ

وَيَخَافُونَ عَذَابَ اللَّهِ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْظُورًا (پہ ۱۰)

• کہ پکارو جن کو سمجھتے ہو سوا اس کے نہیں اختیار کھتے کہ تکلیف کھول دیں تم

سے نہ بدل دیں۔ وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ

کون بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں اس کی مہر کی اور ڈرتے ہیں اس کی ما

سے۔ بے شک تیرے رب کی مار ڈرنے کی چیز ہے۔ (شاہ عبد القادر)

• آپ فرما دیجیے کہ جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی

سو وہ نہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا۔

اور نہ لوگ کہ جن کو مشرکین پکارتے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈ رہے

ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور

اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ واقعی آپ کے رب کا عذاب ہے بھی ڈرنے کے

قابل (مولانا اشرف علی)۔

• کہو پکارو جن کو تم سمجھتے ہو سوائے اس کے، وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کھول

دیں تکلیف تم سے اور نہ بدل دیں وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں۔ وہ خود ڈھونڈتے

ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کون سا بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں

اس کی مہربانی کی اور ڈرتے ہیں اس کے عذاب سے۔ بے شک تیرے رب کا عذاب

ڈرنے کی چیز ہے۔ (مولانا محمود الحسن)۔

• ان سے کہو پکار دیجھو ان معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کار ساز) سمجھتے ہو۔ وہ کسی تکلیف کو تم سے نہ ٹھا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون ان سے قریب تر ہو جائے اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کا عذاب ہے ہی ڈرنے کے لائق (مودودی)۔
• تم فرماؤ پکارو ابھیں جن کو اللہ کے سوا گمان کرتے ہو تو وہ اختیار نہیں رکھتے تم سے تکلیف دور کرنے اور نہ پھیر دینے کا وہ مقبول بندے تجھیں یہ کافر پوچھتے ہیں وہ آپ ہی اپنے رب کی طرف وسیلہ ڈھونڈتے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب ہے، اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ بے شک تمھارے رب کا عذاب ڈر کی چیز ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اولئک الذین یدعون کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے ”وہ مقبول بندے تجھیں یہ کافر پوچھتے ہیں“ دوسرے تراجم میں مطلقاً ذکر ہے اور ان پوچھنے کی بجائے پکارنا ہے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت یہ ہے کہ یہاں جن معبودوں کا ذکر ہو چکا ہے وہ حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ ہیں۔ وہ یقیناً مقبول بندے ہیں۔

اسی طرح بعض تراجم میں یہ ہے ”اور یہ لوگ کہ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں“ لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں مشرکین کی جگہ کافر ہے۔ ”جھیں یہ کافر پوچھتے ہیں۔ اس لیے کہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ پر مشرکین کے لفظ کا اطلاق اختلافی ہے لیکن کافر کا اطلاق اتفاقی ہے۔ اب تفسیر کبیر سے عبارت پیش کی جا رہی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معبود سے مراد حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام اور ملائکہ ہیں۔ اسی طرح معبودوں کے مناسب لفظ پوچھنا ہے نہ کہ پکارنا۔ ولیمس المراد الاصنام لانہ تعالیٰ قال فی صفتہم ادلست الذین یدعون یتبعون الی سبہم الوسیلۃ وابتغوا الوسیلۃ الی اللہ تعالیٰ لایلیق بالاصنام المبتتہ۔

یہاں بت مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وہ معبود تو خود اپنے سے زیادہ مقرب کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔ (یعنی ان کو معبود ماننے تو وہ تمھارے قول کے مطابق کچھ بت معبود ہونے کے اللہ سے مقابلہ کریں اور تم سے ضرر و نفع کو دور کریں۔ یہ ممکن نہیں)۔
بت تو یقیناً وسیلہ تلاش کرنے سے عاجز ہیں: ادلست الذین یدعون ہم الانبیاء الذین ذکرہم اللہ تعالیٰ بقولہ ولقد فصلنا بعض النبیین علی بعض وتعلق ہذا الکلام بما سبق ہران الذین عظمت منزلتہم وہم الانبیاء لا یعبدون الا اللہ ولا یتبعون الوسیلۃ الالیہ فانتم بالاعتقاد بہم حق فلا تعبدوا غیر اللہ تعالیٰ۔ یعنی اولئک الذین یدعون سے مراد انبیائے کرام جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے قول سے ماقبل کی آیت کریمہ میں بیان کیا ہے ولقد فصلنا بعض النبیین علی بعض۔ ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی۔ اس کلام کا تعلق ما سبق سے ہے۔ وہ جن کو عظیم مرتبہ عطا ہوا (وہ مقبول بندے ہیں) اور وہ انبیائے کرام ہیں۔ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے۔ اپنے سے مقرب (زیادہ مرتبہ والے نبی) کا وسیلہ صرف اللہ کے قرب کے لیے ہی تلاش کرتے ہیں۔ جھیں بھی ان کی اقتدا کا ہی حق پہنچتا ہے۔ پس تم بھی اللہ کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو۔ اب اس وضاحت کے بعد اس میں سمجھنا مشکل نہ رہا کہ وہ جن کو پوجا کا ذکر ہے وہ انبیائے کرام ہیں۔ وہ مقبول بندے ہیں۔ مراد عبادت (پوجا کرنا ہے) صرف پکارنا نہیں۔ اور منح عبادت سے کیا ہے نہ کہ ان کے وسیلہ سے۔ مقرب کا وسیلہ تو خود قرآن پاک سے ثابت ہوا اسے رد نہیں کیا گیا کیونکہ یتبعون الی سبہم الوسیلۃ فرمایا گیا ہے۔ ان کے ضرر و نفع کی نفی ان کی الوہیت سے مقید ہونے کی صورت میں ہے مطلق نہیں ورنہ شفاعت، دعا اور ان کے وسیلہ سے نفع کا اندفاع پہلے کئی مقامات پر پیش کیا جا چکا ہے۔

وَكَانَ وَرَاءَهُمْ مَلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَضْبًا ۝

اور تھا پھر ان کے ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو (شاہ رفیع الدین) کیونکہ آگے ایک ایسے بادشاہ کا علاقہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا۔

(مودودی)

ان کے پیرے تھا ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر (مولانا محمود الحسن)۔

ان کے پیرے تھا ایک بادشاہ جو لے لیتا تھا ہر کشتی کو چھین کر (شاہ عبدالقادر) اور ان لوگوں کے آگے کی طرف ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی پکڑ رہا تھا۔

(مولانا اثر علی)

اور ان کے سامنے (کی طرف) ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کو زبردستی چھین لیتا تھا (فتح محمد)۔

اور ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا کہ ہر ثابت کشتی زبردستی چھین لیتا۔ اعلیٰ حضرت یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا ذکر ہے جب کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑ دیا تھا یعنی اس کے دو تختے اکھیڑ دیے تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس پر تعجب کرتے ہوئے اس امر کو امر عظیم سمجھا کیونکہ کشتی بان نے ان حضرات سے گمراہی بھی وصول نہیں کیا تھا۔ اس وجہ سے بھی یہ بات حیران کن تھی کہ ایسے شخص کا نقصان کرنا بہت ہی امر عظیم ہے۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے ان کے اس تعجب پر یہی سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ کشتی کو توڑنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک بادشاہ ہے ان کے پیچھے جو ہر ثابت کشتی کو چھین لیتا ہے اس لیے اس کشتی کو عیب ناک کیا ہے تاکہ اس سے بچ جائے اور معمولی مزدوری سے اس کو صحیح کر لے۔

یہ مضمون اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے زیادہ واضح ہے کیونکہ اگر وہ بادشاہ ہر کشتی کو چھین رہا تھا تو یہ بھی کشتی تھی یا وجودیکہ عیب ناک تھی حالانکہ وہ تو فقط صحیح اور ثابت کو چھین لیتا۔ تفسیر کبیر میں ہے خلاص ذلك العالم عليه انه لولـ

يعب تلك السفينة بالخرق يغصبها ذلك الملك وفانت منافعا عن ملاكها بالكلية - یعنی آپ کو معلوم تھا کہ اگر وہ کشتی کو توڑ کر عیب ناک نہیں کرتے تو وہ بادشاہ اس کو چھین لے گا اور کشتی کے مالکوں کا مکمل طور پر نفع حاصل کرنا ختم ہو جائے گا۔

اس سے مقصد یہ حاصل ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کے مطابق ہے اور بات کو مکمل طور پر سمجھاتا ہے۔

مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۝

دھوم اٹھاتے ہیں ملک میں۔ (مولانا محمود الحسن)؛ شاہ عبدالقادر)۔

زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں ذکر ہو رہا ہے سکندر ذوالقورن کا جب ان کو ایک قوم نے کہا کہ یا جوج مابوج زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ ہم تمہیں پیسے جمع کر کے دیتے ہیں تم ہمارے او ان کے درمیان ایک دیوار بنا دو۔ اعلیٰ حضرت نے ترجمہ مفسدین کا کیا ہے زمین میں فساد مچاتے ہیں۔ دیگر مذکورہ تراجم میں ہے ”دھوم اٹھاتے ہیں“ حالانکہ اردو محاورہ میں اچھے کام کی شہرت ہو تو پھر بھی دھوم اٹھاتے ہیں یا دھوم مچاتے ہیں الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے دھوم اٹھانا مقصد کو واضح نہیں کرتا بلکہ مقصد کے مطابق یہ ہی ہے کہ زمین میں فساد مچاتے ہیں ان کے فساد کو تفسیر کبیر میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے :

واختلفوا في كيفية افساءهم في الارض فقيل كانوا يقتلون الناس وقيل كانوا ياكلون لحوم الناس وقيل كانوا يخرجون ايام الربيع فلا يمتنعون لهم شيئا اخصروا بالجملة فلفظ الفساد محتمل لكل هذه الاقسام - یا جوج مابوج کے زمین میں فساد پھیلانے میں مختلف قول ہیں کہ وہ کیسے فساد پھیلاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ لوگوں کو قتل کر دیتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ لوگوں کا گوشت کھاتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ موسم بہار میں نکلتے تھے۔

ان کے لیے کوئی سبز چیز یعنی درخت، پودے وغیرہ نہیں چھوڑتے تھے۔
 حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ فساد ان تمام صورتوں کا احتمال رکھتا ہے کہ وہ ان قسموں
 میں سے ہر ایک کو شامل ہے یعنی وہ ان فساد کا مومن میں سے ہر ایک کام کرتے تھے۔
 روح المعانی میں ہے : مفسدون فی الاموال فی ارضنا
 بالقتل والنهب وسائر وجوه الافساد المعروف
 من البشر وہ زمین میں فساد مچاتے ہیں یعنی وہ ہماری زمین میں قتل و غارت
 تخریب کاری، ہر قسم کا غلط کام جو انسانوں سے واقع ہوتا ہے وہ کرتے ہیں۔
 معلوم ہو کہ ان مذکورہ معانی کو فساد مچاتے ہیں ترجمہ حاوی ہے نہ کہ ”مضموم
 مچاتے ہیں“۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (پہلے پڑھا)

آپ کہ دیجیے کہ میں تو بس تمھارا ہی جیسا بشر ہوں۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔
 کہ دو کہ میں تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ (فتح محمد)۔
 تو کہ میں ایک آدمی ہوں جیسے تم (محمود الحسن)۔
 تو کہ میں بھی ایک آدمی ہوں جیسے تم۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 کہ سوائے اس کے نہیں کہ میں آدمی ہوں مانند تمھارے (شاہ رفیع الدین)۔
 آپ کہ دیجیے کہ میں تو تم ہی جیسا بشر ہوں۔ (اشرف علی)۔
 اے نبی کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا (مودودی)۔
 تم فرماؤ ظاہر صورت بشری میں تو بس تم جیسا ہوں (اعلیٰ حضرت)۔
 اعلیٰ حضرت کے اس ترجمہ پر مفسرین نے ان الفاظ پر اعتراض کیا :-

”مولانا بریلوی نے یہاں تمھاری طرح کے ساتھ ظاہری صورت بشری کا اضافہ کہ
 قرآنی مضموم کو اپنے عقیدے کے مطابق ڈھالنے کی سازش کی“۔ یہ اعتراض فقط مخالفت
 پر مبنی ہے یا نبی کریم کی حقیقت سے بے خبری کی علامت ہے اور نبی کریم کی نورانیت کا

انکار ہے حالانکہ قرآن پاک سے نبی کریم کی نورانیت روز روشن کی طرح عیاں ہے :
 قد جاءكم من الله نور وكتاب مبين پ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علامہ آلوسی
 روح المعانی میں ذکر فرماتے ہیں : قد جاءكم من الله نور - عظیم و ہونہ الانوار
 والنبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم تحقیق تمھارے پاس اللہ کی طرف سے نور عظیم آگیا
 جو تمام نوروں کا نور اور نبی المختار صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس کے بعد اس طرح ذکر کیا :
 وقال الطیبری انه اذ فلق لشكره قولہ سبحانہ وتعالیٰ قد جاءكم بغیر عطف
 دخلق به اولاد وصف الرسالہ والثانی وصف الکتاب ولا یبعد عندی ان
 یجاد بالنور والکتاب المبین ہوا لنبی صلی اللہ علیہ وسلم علامہ طبری فرماتے ہیں کہ
 یہاں زیادہ مناسب یہ ہی ہے کہ نور سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی
 ہو کیونکہ پہلے یا اہل الکتاب قد جاءکم سر لہنا ذکر فرمایا پھر بغیر عطف کے
 قد جاءکم من الله نور ذکر فرمایا۔ دونوں سے مراد ایک ہی ذات ہے۔ اسی
 لیے صرف عطف کو ذکر نہیں فرمایا لیکن صرف عطف مختار ت پر دلالت کرتا ہے علامہ آلوسی
 فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ کوئی بعید نہیں کہ نور سے مراد اور کتاب مبین سے مراد نبی
 کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ بلا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ شرح شفا میں یہی فرماتے ہیں
 وای مانع من ان یجعل البعثان للرسول صلی اللہ علیہ وسلم فانہ
 نور عظیم کسما لظہورہ بین الانوار وکتاب مبین حیث انہ جامع
 لجميع الاسماء ومظهر للحکام والاعمال والاعبار۔ کون سا امر مانع ہے
 کہ نور اور کتاب مبین دونوں ہی سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں کیونکہ آپ انوار
 کے درمیان کمال ظہور کے لیے نور عظیم ہیں اور آپ کتاب مبین اس لیے ہیں کہ آپ
 تمام اسرار کے جامع ہیں اور تمام احکام و احوال اور اتجار کے ظاہر کرنے والے ہیں۔
 البتہ مستخرجوں نے نور اور کتاب مبین سے مراد قرآن پاک لیا ہے جیسا کہ روح المعانی
 میں ہے : وقال ابو علی الجبائی عنی بالنور القرآن کشفہ و اظہارہ طرق
 الہدی والیقین واقترن علی ذلک النور محشری۔ ابو علی جبائی نے

کہا کہ نور سے مراد قرآن پاک ہے کیونکہ قرآن پاک ہدایت و یقین کے طریق کو ظاہر اور
منکشف کرتا ہے۔ زمخشری بھی اسی کا قائل ہے۔ لیکن اہل علم حضرات سے یہ مخفی نہیں
کہ ابوعلی جیانی اور زمخشری مختزلہ کے امام اور رئیس مانے جلتے ہیں۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کے انکشاف اس حد تک متجاوہ ہونا کہ مختزلہ
کا مقلد بن جانا اور اکابر اہل سنت علامہ آلوسی صاحب روح المعانی اور علی قاری اور
دیگر مفسرین کرام کے اقوال سے روگردانی عقل و دانش کا کام نہیں۔ اور پھر نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد گرامی اول ما خلق اللہ نوحی (سب سے پہلے
اللہ تعالیٰ نے میرے نور کو پیدا کیا) کو مولانا حسین احمد مدنی نے اشہاب ثقب میں
نقل کیا مولانا اشرف علی صاحب نشر الطیب میں نور محمدی کے باب میں کئی احادیث
بیان کرتے ہیں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانیت کا ذکر ہے۔ اور مولانا محمد قاسم
تاتوئی قصائد قاسمیہ میں اس طرح فرماتے ہیں :

رہا جمال پر تیرے حجاب بشریت نہ جانا کسی نے تجھے بجز ستار
سوا خدا کے بھلا کوئی تجھ کو کیل جائے نوشی تو ہے شیر منط اولوالابصار
اپنے اکابر کی ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد تو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر اعتراض نہ کیا
جلئے کہ آپ نے ظاہر بشریت کہا ہے حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت نور اور
ظاہر بشریت کے عقیدہ میں اعلیٰ حضرت منفرد نہیں بلکہ یہی عقیدہ سلف صالحین کا ہے۔
علامہ خفاجی شرح شفا میں لایمکن فی سنة الله اس سال الملک الذلین
ہو من جنسہ او من خصہ اللہ کا لا نبیاء والرسول کے تحت فرماتے ہیں :
فانهم خلقهم الله تعالى بابدان بشرية واسما واح ملكية فكانوا دون غيرهم
مستعدين لمقاومة الملك ومخالطة ومخاطبة (نسیم الریاض جلد ۱)
انبیاء اور رسولوں پر ملائکہ کا نزول اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے
بدن ظاہر بشری بنائے لیکن ان کے ارواح ملکی یعنی نوری ہیں اسی وجہ سے انبیاء
ملائکہ سے میل جول اور خطاب کی طاقت رکھتے ہیں جب کہ دوسرے انسان اس طاقت

سے قاصر ہیں۔

اسی طرح نسیم الریاض جلد سوم میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کے مطابق بعینہ الفاظ ملتے
ہیں ظاہر صلی اللہ علیہ وسلم بشری و باطنہ ملکی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہر بشری ہیں
اور باطنی ملکی ہیں۔
مذکورہ دلائل کی روشنی میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں تو اس سے انکار ممکن نہیں
کہ آپ کا ترجمہ کتنی بڑی تفصیل کو بالا اختصار حاوی ہے۔
اس مسئلہ نور و بشر کو اگر کوئی بالتفصیل دیکھنا چاہے تو استاذی المکرم کی کتاب
تنویر الابصار کا مطالعہ کرے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّي وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّي (پارا ۱)

بولالے رب میرے بوڑھی ہو گئیں ہڈیاں (شاہ عبدالقادر)۔
عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہو گئیں۔ (اشرف علی)۔
بولالے میرے رب بوڑھی ہو گئیں میری ہڈیاں (محمود الحسن)۔
عرض کیا اے میرے رب میری ہڈی کمزور ہو گئی (اعلیٰ حضرت)۔
یہ حضرت زکریا علیہ السلام کی پرانہ سالی میں التجا ہے۔ اس مقام پر اعلیٰ حضرت
کے ترجمہ پر اعتراض کیا جاتا ہے۔ حال صاحب عظم کا ترجمہ ہڈی کرتے ہیں۔ تمام
مترجمین فارسی اور اردو اس کا ترجمہ جمع کے صیغہ میں ہڈیاں لکھتے ہیں۔ حال صاحب
کو یہ بھی معلوم نہیں کہ عظم پر الف لام کیسا ہے اور اس کا ترجمہ بصیغہ جمع تمام سلف
نے کیوں کیا۔ پہلے تو یہ غور کریں کہ یہاں حضرت زکریا علیہ السلام نے بیٹے کے لیے دعا
کی اور عرض کیا کہ میری ہڈی کمزور ہو گئی۔ اس ہڈی سے مراد صلب یعنی پشت کی ہڈی
مراد ہے جو نطفہ کی جگہ قرار ہے۔ قرآن میں دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے :
يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ (نسیم الریاض جلد ۱) جو نکلتا ہے پیٹھ اور سینوں کے بیچ
سے چونکہ مرد کا نطفہ پیٹھ میں ہوتا ہے۔ روح المعانی میں ہے : وهن العظم مني

ای ضعف واسناد ذلك الى العظم لانه عماد البدن و دعام الجسد
فاذا اصابه الضعف والرخاوة تداعى ما وسر اسنه وتساقطت
قوته - یعنی وہن کا معنی کمزور ہے اور اس وہن کی نسبت ہڈی کی طر
کی گئی ہے کیونکہ وہ جسم و بدن کا ستون ہے۔ جب وہ کمزور ہو جائے تو تمام کمزور ہو
جاتا ہے اور قوت ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں سے سمجھ آتا ہے کہ بدن کا ستون اگر ٹھک
ہڈی ہی ہے اور وہی مختبر ہے۔ روح المعانی کی عبارت میں مفرد ضمائر بھی اس معنی
پر دال ہیں:- وافر علی ما قالہ العلامة المتذکرہ محشری واما تضاه کشیر
من المحققین لان المفرد هو الدال علی معنی الجنسیة والقصد الی
ان الجنس الذی هو العمود والقوام واشد ما ترکب منه الجسدی
قد اصابه الوهن - (روح المعانی) یہاں عظم (ہڈی) کو مفرد لایا گیا علامہ محشر
نے بھی یہی کہا ہے اور کثیر محققین نے اسے ہی پسند کیا ہے کیونکہ مفرد وہ معنی جنسیہ پر
دال ہے اور جنس سے مراد جسم کا ستون اور قوام ہے اور وہ سخت ہے جس سے جسم مرکب
ہوتا ہے اور کبھی اس میں کمزوری آجاتی ہے۔ مفرد معنی کثیر محققین کا پسندیدہ ہے اور مراد
اس سے ریڑھ کی ہڈی ہی ہے۔ و وحدہ لان الواحد هو الدال علی معنی
الجنسیة والمراد ان هذا الجنس الذی هو العمود والقوام واشد
ما ترکب به الجسد قد اصابه الوهن - (مدارک)
عظم (ہڈی) کو واحد ذکر کیا گیا ہے کیونکہ واحد یہاں معنی جنسیہ پر دال ہے اور جنس سے
مراد وہ ستون اور قوام اور وہ سخت ہے جس سے جسم مرکب ہوتا ہے اور اس میں
کمزوری واقع ہوتی ہے۔ مدارک سے بھی پتہ چلا کہ معنی مفرد والا ہی زیادہ مناسب ہے
اب یہ کہنا کہ خال صاحب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ الف لام جنسی ہے۔ اس سے یہ بہتر تھا
کہ کہا جاتا کہ خال صاحب کو تو یہ معلوم تھا کہ الف لام جنسی ہے البتہ خال صاحب
کے بغیر ورنہ کو الف لام کا ترجمہ کرتا نہیں آیا کہ الف لام جنسی کا ترجمہ کیسے کیا جانا
چاہیے۔ الف لام جنسی کا ترجمہ صحیح سے نہیں کیا جاتا۔ الرجل خیر من المرأة

یعنی ماہیت رجل ماہیت مرآة سے بہتر ہے۔ اور یہ معنی نہیں کہ افراد رجل افراد مرآة
سے بہتر ہیں۔ (ایضاح المطالب شرح کافیه مولانا مشیت اللہ دیوبندی)۔

ان الجنسی ما یشار بہا الی ماہیة الشئ من غیر ملاحظۃ الواحدة والکثرة
(تحریر سبب) الف لام جنسی سے کسی چیز کی ماہیت کی طرف
اشارہ ہوتا ہے وحدت و کثرت کا لحاظ نہیں ہوتا۔ الف لام جنس آنرا گویند کہ اشارہ کند
بسوی ماہیت تدخل تو قطع نظر از فرد و افراد (جامع الفوائد) الف لام جنسی اسے
کہتے ہیں کہ جس سے ماہیت کی طرف اشارہ ہو کسی ایک فرد یا زیادہ افراد کا لحاظ نہ
کیا جاتے جب کہ الف لام جنسی کثرت یعنی جمع کے معنی کو مستلزم ہی نہیں تو پھر جمع
کا معنی کرنے پر اصرار کیوں اور اپنی لاعلمی کو دوسرے پر محمول کرنا کہاں کی دانش ہے۔

فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ (پط ۱۸)

- پھر وہ اپنی قوم کے رو برو حجرہ میں سے برآمد ہوئے (عبداللہ ماجہ دریا آبادی)۔
- پس نکلا اوپر قوم اپنی کے محراب سے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
- پھر نکلا اپنے لوگوں کے پاس حجرہ سے (شاہ عبداللہ قادری)، (مولانا محمود الحسن)
- پس حجرہ میں سے اپنی قوم کے پاس برآمد ہوئے۔ (اشرف علی)۔
- چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا (مودودی)۔
- تو اپنی قوم پر مسجد سے باہر آیا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر ہے جب آپ محراب سے اپنی قوم پر باہر تشریف
لائے۔ یہاں محراب کا معنی باقی حضرات نے حجرہ کیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں
محراب کو مسجد معنی میں لیا گیا ہے۔ تفاسیر میں بھی محراب کو مسجد کے معنی میں لیا گیا ہے۔
حجرہ عام ہے کسی کمرہ پر بھی بولا جاسکتا ہے لیکن مسجد خاص ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ
حجرہ کا اطلاق مسجد پر ضروری ہے۔ جلالین میں ہے: من المحراب ای مسجد
وکانوا ینتظرون فتخالیصوا فیہ بامرہ علی العادة - یعنی محراب سے مراد

مسجد ہے۔ لوگ آپ کے کھولنے کے منتظر رہتے تھے تاکہ بحسب اوقات آپ کے حکم سے اس میں نماز ادا کریں۔ جمل میں ہے: وَكَانُوا يَنْتَظِرُونَ اَلْجَنَّةَ فَكَانَ هُوَ مَقِيماً وَلَا يَفْتَحُ الْاَوْقَاتِ الصَّلَاةَ وَلَا يَدْخُلُهَا اِلَّا بِاِذْنِهِ۔ آپ اس میں مقیم رہتے تھے سوائے نماز کے وقت کے۔ اس کو نہیں کھولتے تھے۔ اولہ لوگ آپ کی اجازت کے بغیر اس میں داخل نہیں ہوتے تھے۔ رُوح المعانی میں ہے: من المحراب ای من المصلی یعنی نماز کی جگہ (مسجد) سے نکلے۔ ویسے ہی محل العبادة محراب بالمان العابد کا لمحراب للشیطان ذبیہ (روح المعانی) عبادت کی جگہ کو محراب کہا جاتا ہے کیونکہ عابد وہاں شیطان سے لڑائی کرتا ہے کیونکہ محرابت کا معنی لڑائی کرنا ہے۔ مدارک میرا ہے: من المحراب ای من موضع صلواتہ وَكَانُوا يَنْتَظِرُونَ۔ محراب سے مراد نماز کی جگہ (مسجد) ہے۔ لوگ آپ کی انتظار فرماتے تھے۔

ان تقاسیر کے بیان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل نہیں کہ محراب کا معنی مسجد ہی زیادہ مناسب ہے اس لیے کہ حجرہ ضروری نہیں کہ نماز کی جگہ ہو اور مسجد کو بھی شامل ہو۔ جلالین اور جمل کی عبارات سے یہ عقیدہ بھی حل ہو گیا کہ مراد مسجد ہی ہے۔ عام حجرہ میں کبھی کبھی نماز ادا کر لی جاتی ہو یہ مراد نہیں بلکہ عام لوگ اس میں نماز پڑھتے تھے اور اس کی چابی حضرت زکریا کے پاس ہوتی تھی اور آپ اسے نماز کے وقت کھولتے تھے۔ یہ واضح حقائق اس کا تین ثبوت ہیں کہ مراد مسجد ہے۔

وَاتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا (پہلے)

- اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکپن میں۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- اور دیا ہم نے اس کو حکم لڑکپن سے (شاہ رقیع الدین)۔
- اور ہم نے اُن کو لڑکپن میں سمجھ دے دی تھی (عبدالماجد دریا آبادی)۔
- اور ہم نے اُن کو لڑکپن ہی میں دانائی عطا فرمائی۔ (فتح محمد)۔

- اور دیا ہم نے اس کو حکم کرنا لڑکپن میں (محمود الحسن)۔
- اور اُن کو لڑکپن ہی میں سمجھ عطا فرمائی (مولانا اشرف علی)۔
- ہم نے اسے بچپن ہی میں حکم سے نوازا۔ (مودودی)۔
- اور ہم نے اسے بچپن ہی میں نبوت دی۔ (اعلیٰ حضرت)۔

باقی حضرات کے تراجم میں تو حکم کرنا مذکور ہے۔ اسی طرح دانائی سمجھ عطا کرنا لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ ہے کہ ہم نے نبوت دی۔ اس معنی کی تائید کی تفسیر کبیر کو دیکھا جائے جس میں یہ مذکور ہے: والا قرب حملہ علی النبوة لوجهین الاول ان الله تعالى ذكر في هذه الایة صفات شرف و منقبة ومعلوم ان النبوة اشرف صفات الانسان فذكرها في معرض المدح اولیٰ من ذکر غیرها فوجب ان تكون نبوته مذکور فی هذه الایة ولا لفظ يصلح للدلالة علی النبوة الا هذه اللفظة فوجب حملها علیها۔ والثانی ان الحكم هو ما يصلح لان يحكم به علی غیره ولغيره علی الاطلاق و ذلك لا يكون الا بالنبوة۔ تفسیر کبیر میں علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے حکم کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے ایک معنی نبوت کیا ہے اور حکم بمعنی نبوت کے زیادہ بہتر سمجھتے ہوئے اس پر دلائل قائم کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حکم کو نبوت کے معنی میں لینا زیادہ مناسب ہے۔ اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اس آیت میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صفات میں سے اشرف صفات کا ذکر فرمایا اور آپ کی منقبت بیان کی ہے اس لیے یہ بات یقیناً ثابت ہے کہ انسان کی صفات میں سے اشرف صفت نبوت ہی ہے اس لیے مقام مدح میں اسی کا ذکر کرنا بہ نسبت اوصاف کے زیادہ مناسب ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ اس آیت میں نبوت کا ذکر ہو اور نبوت پر دلالت کرنے کے لیے اس لفظ (حکم) کے بغیر اور کوئی لفظ نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کو نبوت کے معنی میں لیا جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ غیر کو حکم دینا یعنی اوامر و نواہی، جزا و سزا کا علی الاطلاق

بغیر نبوت کے ممکن نہیں اس لیے بھی حکم کو بمعنی نبوت لینا زیادہ مناسب ہے۔

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ﴿۱۰۱﴾

- اور حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا پھر راہ سے بہکا۔ (شاہ عبد القادر)۔
- اور آدم نے نافرمانی کی اپنے رب کی۔ پس گمراہ ہوئے (مولوی عاشق الہی میرٹھی)۔
- حکم ٹالا آدم نے اپنے رب کا پھر راہ راست سے بہکا (مولانا محمود الحسن)۔
- آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو غلطی میں پڑ گئے۔ (مولانا اشرف علی)۔
- آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا۔ (مودودی)۔
- آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو وہ غلطی میں پڑ گئے (عبد الماجد دریا آبادی)۔
- آدم سے اپنے رب کے حکم میں لغزش واقع ہوئی جو مطلب چاہا تھا اس کی راہ دہ پائی۔ (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کرتے وقت حضرت آدم علیہ السلام کے مقام کو مد نظر رکھتے ہوئے ترجمہ کیا کیونکہ نبی کا گمراہ ہونا، بہک جانا، بھٹک جانا، غلطی میں پڑ جانا شان نبوت کے خلاف ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ادب اتمام برہمنی الفاظ کو استعمال کیا۔ اس مقام پر علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کبیر میں اس طرح ذکر فرمایا:

ان ظاہر المقامات وان دل علی ان آدم عصی وغویٰ لکن لیس لاحد ان یقول ان آدم کان عاصیا غاویا۔ یعنی بیشک ظاہر قرآن پاک اگرچہ دلالت کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے عصیاں غوایت واقع ہوئے لیکن کسی کو یہ کہنے کا کوئی حق نہیں کہ وہ یہ کہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حکم ٹالا، وہ گمراہ ہوئے، بھٹک گئے۔ یعنی مقصد یہ ہے کہ یہ الفاظ اللہ تعالیٰ نے استعمال فرمائے جس کو حق پہنچا ہے۔ وہ اپنے بندے کے حق میں جو الفاظ استعمال کرے لیکن وہی حقیقتاً ان کے معانی سے بھی آگاہ ہے۔ روح المعانی میں ہے: وقد صرح القاضی ابوبکر بن العرب بعدم جواز نسبة العصیان للآباء الاذنیین البینا المماثلین

لنا فلیف یجوز نسبة الذنوب والآباء والنبي المقدم المكرم وامر تفضی ذلک القرطبی۔

قاضی ابوبکر نے صراحت بیان فرمایا کہ عصیاں یعنی نافرمانی، بھٹک جانا، بہک جانا، گمراہ ہو جانا، اس قسم کے الفاظ کی نسبت جب ہم اپنے والدین، آباؤ اجداد کی طرف نہیں کر سکتے اور یہ جائز نہیں تو انبیاء کے کرام جو کہ برگزیدہ، مکرم اور ہر طرح تعظیم و تکریم کے لحاظ سے مقدم ہیں انکی طرف ایسے الفاظ کی نسبت کیونکر ہو سکتی ہے یہ عالم تنزیل میں ہے: واعلم انه لا يجوز اطلاق العاصی وغیره علی آدم علیہ السلام لانہ انما یقال عاصی لمن اعتاد فعل المعصیۃ كالرجل یخیط ثوبه ولا یقال هو خياط حتى یحاذ ذلک ویعتادہ۔ یہ یقین بات ہے کہ آدم علیہ السلام ہر عاصی وغیرہ کے الفاظ یعنی نافرمان ہوا، بہک گیا، حکم ٹالا، گمراہ ہوا، قصور کیا، غلطی میں پڑ گیا، بھٹک گیا، اطلاق جائز نہیں اس لیے کہ عاصی تو اسے کہیں گے جو عصیاں بار بار کرے اور اس کی عادت بنا لے جس طرح کوئی آدمی کپڑا سیتا ہے اسے اس وقت تک خياط (درزی) نہیں کہیں گے جب تک وہ دوبارہ نہ کرے اور عادت نہ بنائے۔ اسی طرح آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ تو کہیں گے کہ ان سے حصول واقع ہوئی، لغزش واقع ہوئی، لیکن محافل صاحب ایمان جو شان انبیاء کرام سے واقف ہوں اس کے لیے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ کہیں کہ نبی نے رب کا حکم ٹالا دیا، نبی بہک گیا، نبی نے قصور کیا، نبی غلطی میں پڑ گیا، نبی بھٹک گیا، نبی گمراہ ہو گیا۔ ہر صاحب خرد ان الفاظ سے جو آدم علیہ السلام کی طرف منسوب کیے گئے ہیں اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں جو الفاظ آپ کی طرف منسوب کئے گئے ہیں، فرق سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات خود بخود واضح ہے کہ جس مقام پر بڑے بڑے جلیل القدر مفسرین کرام تاویلات کرتے نظر آتے ہیں اور عاصی اور غاوی کے الفاظ کو براہ راست بخیر تاویل کیے آدم علیہ السلام پر محمول کرتے ہوئے سچکچاتے ہیں اور اس نازک مرحلہ میں اپنے ایمان کی کشتی کو بھنور میں پھنسنے سے گھبراتے ہوئے تاویلات کر کے اپنے آپ کو بچاتے ہیں تو ان کے شانہ نشا اعلیٰ حضرت بھی ترجمہ کرتے ہوئے اردو زبان میں

وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے سلامتی کے کنارے کشتی کو پار لگاتے ہیں لیکن اس کے برعکس دیگر مترجمین اللہ کے نبی کو بہک گیا، بھٹک گیا، گمراہ ہو گیا کہ گمراہی طرح وادیِ خاردار میں بھٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر ذی دانش تراجم پر نظر کرنے سے تفاوت مقامات اور علمی سطح کا اندازہ خود کر سکتا ہے۔

إِذَا وَحْيَنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ (پ: ۱۱۶)

- یاد کرو وہ وقت جب کہ ہم نے تیری ماں کو اشارہ کیا۔ ایسا اشارہ جو وحی کے فریہ سے ہی کیا جاتا ہے۔ (مودودی)۔
- جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو جو آگے سناتے ہیں۔ (محمود الحسن)۔
- جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو جو آگے سناتے ہیں۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- جب ہم نے تمھاری والدہ کو الہام کیا تھا جو تمہیں بتایا جاتا ہے۔ (فتح محمد)۔
- جس وقت کہ وحی ڈالی ہم نے طرف ماں تیری کے وہ چیز کہ وحی کی جاتی ہے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
- ہم نے تیری ماں کو الہام کیا جو الہام کرنا تھا۔ (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ذکر ہے۔ یہاں ظاہر طور پر یہ ہم ہوتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی وجہ وحی آئی تو کیا وہ مقام نبوت پر فائز تھیں؟ اس کا ازالہ مفسرین نے اس طرح کیا ہے کہ یہاں وحی معنی الہام ہے۔ اور الہام کے لیے نبی کا ہونا ضروری نہیں۔ الہام غیر نبی کو بھی ہوتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو واضح کرتا ہے کیونکہ آپ کے ترجمہ پر یہ اعتراض نہیں ہو سکتا بلکہ پہلے ہی اس کو زائل کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب یہ ترجمہ کیا جائے کہ ”جب حکم بھیجا ہم نے تیری ماں کو“ تو اس میں وہ اعتراض برقرار ہے کہ ہو سکتا ہے وہ حکم بواسطہ جبرائیل بھیجا گیا ہو اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی ہوں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کہ اس میں اعتراضات کو زائل کر دیا جاتا ہے اور ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہوتا

ہے۔ مدارک نے مایو حی کے بعد منا اور الہام کے الفاظ کو ذکر کیا یعنی آپ کو الہام ہوا (کسی چیز کا منکشف ہونا) یا آپ کو سونے ہوئے خواب میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ علامہ رازی نے بھی تفسیر کبیر میں وحی کو معنی الہام یا خواب یا دل میں نچتہ ارادہ کا پایا جانا لیا ہے اور وجہ ان تاویلات کی یہ بیان کی ہے۔ اذ او حیثا فقد اتفق الاکثرون علی ان ام موسیٰ علیہ السلام ماکانت من الانبیاء والرسول فلا یجوز ان یکون المراد من هذا الوحی هو الوحی الواصل الی الانبیاء، وكيف لانقول ذلك والمرأة لاتصلح لملقضاء والامامة بل عند الشافعی رحمہ اللہ لاتمکن من تنزیل وپیچھا نفسہا فکیف تصلح للنبوة۔ اکثرین کا اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نبی نہیں تھیں نہ ہی رسول تھیں پس اسی وجہ سے یہ جائز نہیں کہ اس وحی سے مراد وہ وحی ہو جو انبیاء کی طرف آتی ہے۔ یہ ہم کیسے نہ کہیں کیونکہ عورت جبکہ تھیں اور امام نہیں بن سکتی بلکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو وہ اپنا نکاح بھی خود بخیر ولی کی اجازت کے نہیں کر سکتی تو نبی کیسے بن سکتی ہے۔

اسی وجہ سے مذکورہ بالا تاویلات کی ضرورت درپیش آئی۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی اس مقصد پر دال ہے۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب کا ترجمہ جو انھوں نے کیا یوحی کا کیا ہے، مقصد کے خلاف ہے۔

وَفَتَّلَتْ فُتُونًا (پ: ۱۱۷)

- اور جانچا ہم نے تجھے ایک ذرا جانچنا (محمود الحسن)۔
 - اور جانچا تجھ کو ایک ذرا جانچنا۔ (شاہ عبدالقادر)۔
 - اور آزمایا ہم نے تجھ کو آزمائش۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 - اور خوب تجھے جانچ لیا (اعلیٰ حضرت)۔
- حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے کہ ہم نے تمہیں غموں سے نجات اور

کئی قسم کی آزمائشوں میں مبتلا کیا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ خوب جانچ لیا یعنی کئی آزمائشوں میں مبتلا کیا۔ دوسرے مذکورہ تراجم میں ہے ایک ذرا جانچا۔ لفظ فتون مصدر ہو یا جمع ہو، قلت کے معنی پر دال نہیں اور نہ تنوین کو تفصیل کے معنی میں لینے کی ضرورت ہے کیونکہ مصدر ہو تو تاکید کے معنی کو مستلزم ہے اور تاکید کے لحاظ پر صرف اتنا ترجمہ کافی ہے۔ جانچا ہم نے تجھے جانچنا۔ اور جمع کے لحاظ پر معنی ہی یہ ہو گا جو اعلیٰ حضرت نے کیا ہے: فتونا و جہات احدھما ان مصدر کا لعکوف والجلوس والمعنى وفتناك حقا كقوله تعالى وكلمه استلھ موسى تكليما والشافى انه جمع فتن او فتنة اى فتناك ضروريا من الفتن (المفرد من الكبير) فتون میں دو وجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ وہ مصدر ہے جس طرح عکوف اور جلوس مصدر ہیں اور معنی یہ ہے فتناك حقا یعنی ہم نے تمہیں یقیناً آزمایا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے ارشاد گرامی میں ہے: وكلمه استلھ موسى تكليما۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے یقیناً کلام کی۔ یا یہ معنی کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کی کلام کرنا۔ جس طرح یہاں قلت کا معنی مقصود نہیں اسی طرح فتونا میں بھی قلت کا معنی مقصود نہیں۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ فتونا فتن یا فتنة کی جمع ہے اور اب اس صوت میں معنی یہ ہو گا کہ ہم نے تمہیں کئی قسموں کی آزمائشوں سے آزمایا۔ اسی کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے کہ ہم نے تجھے خوب جانچ لیا۔

قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ اِبْرَاهِمُ ۝۱۱

- وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان ان کو کچھ کہتا اس کو پکارتے ہیں ابراہیم۔ (شاہ عبد القادر)
- بولے ہم نے ایک نو جوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم ہے۔ (مودودی)

- کہا انھوں نے ہم نے ایک جوان کو کہ ذکر کرتا تھا ان کا کہتے ہیں اس کو ابراہیم۔ (شاہ فیض الدین)
 - وہ بولے ہم نے سنا ہے ایک جوان بتوں کو کچھ کہتا ہے اس کو کہتے ہیں ابراہیم (محمود الحسن)۔
 - بعضوں نے کہا کہ ہم نے ایک نو جوان آدمی کو جس کو ابراہیم کے پکارا جاتا ہے، ان بتوں کا ذکر کرتے سنا۔ (مولانا اشرف علی)۔
 - لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک جوان کو ان کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے اس کو ابراہیم کہتے ہیں۔ (فتح محمد)
 - ان میں کچھ بولے ہم نے ایک جوان کو انھیں برا کہتے سنا جسے ابراہیم کہتے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے جبکہ آپ نے بتوں کو توڑ دیا تو آپ کی قوم جب اپنے میتے سے واپس آئی تو کہنے لگے کہ یہ ہماری بتوں سے ایسا کام کس نے کیا؟ تو ان میں کچھ نے کہا کہ ہم نے ابراہیم کو ان بتوں کو برا کہتے سنا۔
- اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بتوں کے عیب نکالتے تھے ان کو برا کہتے تھے جبکہ دیگر تراجم میں یہ ظاہر نہیں کیونکہ بتوں کو کچھ کہنا یا ان کا ذکر کرنا ان کے عیب نکالنے اور ان کے برا کہنے کو مستلزم نہیں جبکہ مقصود یہی ہے۔ اسی طرح یہ کلام ان میں سے بعض کی تھی جنھوں نے ابراہیم علیہ السلام کی کلام کو سنا ہوا تھا نہ کہ تمام کی۔
- دوسرے مذکورہ تراجم میں سے بعض نے مطلقاً یہ ذکر کیا وہ بولے۔ اس سے یہ نہیں سمجھ میں آتا کہ یہ کلام بعض کی تھی یا کہ تمام کی۔
- یہ دونوں فرق جو بیان کئے گئے ہیں ان پر تفسیر کو دیکھیں:۔ قالوا اى بعض منهم وھم الذین سمعوا قوله عليه السلام۔ (روح المعانی)
- یعنی ان میں سے بعض نے کہا جنھوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے سنا تھا

کہ آپ سے ایسا سلوک کریں گے جو ان کے سامنے آیا۔ سمعنا فحق یدکرہم
یعنی ہم فعل الذی فعل ذلک بہم۔ (روح المعانی) ہم نے ایک جوان کو ان
کے عیب نکالتے سنا، شاید اسی نے ان سے یہ کام کیا ہوگا۔ قالوا ای بعضہم
لبعض سمعنا فحق یدکرہم ای یعنی ہم یقال لہ ابراہیم (جلالین)
بعض نے بعض کو کہا ہم نے ایک جوان کو انہیں برا کہتے سنا جسے ابراہیم کہتے ہیں۔
اب واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ واضح ہے کہ کلام بعض کی تھی اور
ابراہیم علیہ السلام بتوں کی برائی بیان کیا کرتے تھے۔

قَالَ بَلْ فَعَلَ كَبِيرُهُمْ هَذَا (پ ۱۰)

- بولا انہیں، پر یہ کیا ان کے اس بڑے نے۔ (شاہ عبدالقادر)۔
- بولا انہیں، پر یہ کیا ان کے اس بڑے نے (محمود الحسن)۔
- انھوں نے فرمایا کہ انہیں بلکہ اس بڑے نے کی (مولینا اشرف علی)۔
- اس نے جواب دیا بلکہ یہ سب کچھ ان کے اس سردار نے کیا ہے۔ (موددی)۔
- کہا بلکہ کیا ہے اوکو بڑے ان کے نے یہ (شاہ رفیع الدین)۔
- فرمایا بلکہ ان کے اس بڑے نے کیا ہوگا۔ (اعلیٰ حضرت)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بتوں کو توڑ دیا، کلہاڑا سب سے بڑے
بت کے کندھے پر رکھ دیا جب وہ لوگ واپس آئے تو آپ سے پوچھنے لگے کہ
یہ کام تم نے کیا ہے؟ تو آپ نے یہ جواب دیا۔

اب بظاہر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر آپ نے اس بڑے بت کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اس بڑے نے یہ کام کیا ہے تو جھوٹ لازم آتا ہے جبکہ
اس بت میں یہ صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ دوسرے بتوں کو توڑ سکتا۔ تو آپ نے
یہ کیسے فرمایا؟ اس کے جواب میں مفسرین کرام نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔
ان میں سے ایک یہ ہے: : یکون حکایتہ لما یلزم علی ہذہم

کہانہ قال لہم ما تکترون ان یفعلہ کبیرہم فان من حق من یعبد ویدعی
الہا ان یقدس علی ہذا واشد منہ (کبیر) ان کے مذہب کے مطابق ہو لازم آتا
ہے اس کی حکایت ہے، گویا کہ انہیں آپ نے فرمایا، تم تو ان کے بڑے کے فعل کا
انکار نہیں کر سکتے کیونکہ جس کو مجبور سمجھتے ہو اور اس کے خدا ہونے کے دعویدار
ہو اس کو یہ کام کرنے کی قدرت ہونی چاہیے بلکہ وہ اس سے بھی زیادہ کام کرنے کا
حق دار ہونا چاہیے۔

اسی توجیہ کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے کہ یہ کام ان کے اس بڑے نے
کیا ہوگا جس کو تم خدا سمجھ کر عبادت کرتے ہو۔ تمہارے خیال میں تو یہ کام اس نے
ضرور ہی کیا ہوگا۔ آپ کا یہ ترجمہ اس وہم کو بھی زائل کر رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام
نے یہ کیسے کہا۔ کذب کی نسبت آپ پر لازم آتی ہے۔

دوسرا فائدہ یہ بھی ہو کہ ان کو نہنگنا سمجھا بھی دیا کہ جس کو تم بڑا معبود سمجھ رہے
ہو وہ اپنے دوسرے بتوں کو نہیں بچا سکا تو معبود بننے کے لائق کیسے ہو سکتا ہے۔
عام آدمی اس وجہ کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ اور بھی کئی توجیہات ہیں
لیکن یہ زیادہ معتبر اور مفید ہے۔

لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هَؤُلَاءِ يَنْطِقُونَ (پ ۱۰)

- تو تو جانتا ہے جیسا یہ بولتے ہیں (مولینا محمود الحسن)، (شاہ عبدالقادر)۔
 - کہ تمہیں خوب معلوم ہے یہ بولتے نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- اعلیٰ حضرت نے مافیہ کے مطابق ترجمہ کیا ہے کہ ”یہ بولتے نہیں“ اس پر تفسیر
کی تائید موجود ہے۔ مدارک میں ہے: والمعنی لقد علمت عجزہم عن النطق
فکیف نساء لہم۔ معنی یہ ہے کہ آپ تو یقیناً جانتے ہیں کہ یہ بت بولنے سے عاجز
ہیں (یہ بولتے نہیں) ان سے ہم کیسے سوال کریں۔ ابو السعود میں ہے: والحدیث
لقد علمت ان لیس من شائہم النطق فکیف تامرنا بسوالہم

بخدا آپ تو خوب جانتے ہیں یہ بولتے نہیں، آپ ہیں ان سے سوال کرنے کا کیسے حکم دے رہے ہیں۔

اَفِ لَكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ (پ ۱۱۰)

• بیزارہوں میں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوائے (محمود الحسن)۔
 • تف ہے تم پر اور جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو، ان پر بھی (فتح محمد)۔
 • بیزارہوں میں تم سے اور جن کو تم پوجتے ہو اللہ کے سوا (شاہ عبدالقادر)۔
 • تف ہے تم پر اور ان بتوں پر جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو (انشر علی)۔
 • تف ہے تم پر بھی اور ان پر بھی جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو (عبدالماجد)۔
 • تف ہے تم پر اور ان بتوں پر جن کو اللہ کے سوا پوجتے ہو۔ (الغضرت)۔
 یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کلام ہے جو انھوں نے اپنی قوم سے کی۔ الغضرت کے ترجمہ میں واضح ہے کہ اس سے مراد وہ قوم اور ان کے معبود بت مراد ہیں نہ کہ مطلقاً وہ جن کی وہ لوگ عبادت کرتے تھے کیونکہ آپ کی قوم کے لوگ چاند، سورج اور ستاروں کو پوجتے والے بھی تھے لیکن یہاں چاند، سورج اور ستارے مراد نہیں ہیں بلکہ بت مراد ہیں۔ اسی پر تفسیر جلالین کی عبارت دال ہے: اِیْ هَذِهِ الْاَهْنَامُ لَا شَيْءَ حَقَّ الْعِبَادَةِ وَلَا تَصْلَحُ لِمَا وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ اِنَّهَا لَا تَنْفَعُكُمْ شَيْئاً وَلَا تَضُرُّكُمْ اَلَمْ تَعْلَمُوا اَنَّكُمْ كَانْتُمْ فِي سُلْطَانٍ مِّنْ دُونِ اللَّهِ (پ ۱۱۱)۔
 یعنی یہاں بت مراد ہیں۔ یہ مستحق عبادت نہیں اور نہ ہی ان میں صلاحیت ہے کہ ان کی عبادت کی جائے۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی عبادت کا مستحق ہے۔
 الغضرت کے ترجمہ میں جتنی وضاحت ہے اور مقصد کے مطابق ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ ہی اس ترجمہ میں بخوبی ہے کہ تفسیر کے مطابق ہے اور مقصد کو سمجھانے میں اس کا ایک منفرد مقام ہے۔
 مولانا اشرف علی صاحب کا ترجمہ یہاں درست ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ (پ ۱۱۲)

• اور جب تجھ کو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہان کے لوگوں پر (محمود الحسن)۔
 • اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کر جہان کے لوگوں پر (عبدالقادر)۔
 • آپ کو اور کسی کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہان کے لوگ (یعنی مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لیے۔ (مولانا اشرف علی)۔
 • اے محمد! ہم نے جو تجھے بھیجا ہے تو یہ دراصل دنیا والوں کے حق میں مہربانی رحمت ہے۔ (مودودی)۔
 • اور ہم نے تمہیں نہ بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لیے۔ (الغضرت)۔
 اس مقام پر الغضرت کے ترجمہ میں وسعت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہان کے لیے رحمت ہیں آپ نے اپنے ترجمہ میں لوگوں کے لیے رحمت کی قید نہیں لگائی لیکن دوسرے مترجمین نے جہان کے لوگوں یا دنیا جہان کے لوگوں کی قید سے نبی کریم کی رحمت کا دائرہ تنگ کیا ہے اور مولانا مودودی نے تو نبی کریم کی رحمت کو ہی تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم کو بھیجا دنیا والے لوگوں پر رب کی رحمت ہے یعنی آپ خود رحمت نہیں نبی کریم کی رحمت کا دنیا والے لوگوں پر انحصار یا آپ کی رحمت ہی تسلیم نہ کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔ نبی کریم کا رحمت ہونا اور آپ کی رحمت کی وسعت تفسیر سے ثابت ہے جمل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:
 الرَّحْمَةُ يَجُوزُ أَنْ يَكُونَ مَفْعُولًا لِهَ إِیْ لَا جَلَ الرَّحْمَةِ وَأَنْ يَنْقَسِبَ عَلَى الْحَالِ مَبَالِغَةً فِي أَنْ جَعَلَهُ نَفْسَ الرَّحْمَةِ وَأَمَّا عَلَى حَذَفِ مضاف إِیْ ذَا رَحْمَةٍ أَوْ بِمَعْنَى رَاحِمٍ وَفِي الْحَدِيثِ يَا أَيُّهَا النَّاسُ ائْتُوا رَحْمَةَ مَهْدَاةٍ - یعنی رحمت پر نصب کی وجہ یا مفعول لہ ہونے کی وجہ سے ہے مطلب یہ ہو گا کہ ہم نے آپ کو بھیجا ہے کیونکہ آپ کا سارے جہان والوں کے لیے رحمت ہونا اس ارسل کی علت اور وجہ ہے۔ یا نصب لوجہ

حالیہ کے ہے۔ مقصد یہ ہوا کہ ہم نے آپ کو بھیجا دیکھا کہ آپ سارے جہان کے لیے رحمت ہیں۔ رحمت مصدر ہے حال بننا بظاہر درست نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہاں مبالغہ ہے۔ تو معنی یہ ہوگا کہ آپ اتنا رحم فرمانے والے ہیں گویا عین رحمت ہیں اس طرح اور اس کے نصب کی وجہ یہ ہے کہ حذف مضامین ہے یعنی دار رحمت۔ مغموم یہ ہوگا کہ آپ صاحب رحمت ہیں۔ یا پھر رحمت مصدر مبنی بلقاعل ہے۔ راحم کے معنی ہیں کہ آپ رحم فرمانے والے ہیں کیونکہ نبی کریم خود فرماتے ہیں کہ میں رحم کرنے والا، ہدایت دینے والا ہوں۔

اس تقریر سے اتنا واضح ہو گیا کہ رحمت سے مراد نبی کریم ہی ہیں مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ حقیقت حال سے کوسوں دور ہے۔ اگرچہ نبی کریم کو بھیجا بلاشبہ رب تعالیٰ کی رحمت ہے لیکن اس آیت کریمہ کا معنی اس طرح کرنا جس میں آپ کو بھیجا رب کی رحمت ہے، سمجھ آئے۔ یہ ترجمہ بذاتِ نبی عیادت کا گواہ کی رو سے درست ہے اور وہی مقصد بیان کے مطابق ہے۔ نبی کریم کی رحمت عامہ کو علامہ آوسی رحمۃ اللہ روح المعانی میں اس طرح بیان فرماتے ہیں: المراد بالعالمین جميع الخلق فان العالم ما سوى الله تعالى وصفاته جل شانہ وجمع جمع العقلاء بتبليغ الاشرف على غيره - وكونه صلى الله عليه وسلم رحمة للعالمين باعتبار ان عليه الصلاة والسلام واسطة الفيض الالهي على المخلوقات على حسب القابل لذلك ان نزل الله عليه وسلم الى المخلوقات ففي الخبايا من خلق الله تعالى نور نبينا يا جابر - وجاء الله المعطي وانا القاسم - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سارے جہان کے لیے رحمت ہیں کیونکہ عالمین سے مراد تمام مخلوق ہے اس لیے کہ عالم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بغیر تمام کائنات پر مشتمل ہے۔ (اگرچہ عالم کا اطلاق ذوی العقول غیر ذوی العقول تمام کائنات پر جمع و اومانوں اور یا مانوں سے ذوالعقول کی ہوتی ہے تو عالمین کا اطلاق تمام کائنات پر کیسے؟) تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ذوی العقول کو شرافت کے پیش

نظر غیر ذوی العقول پر غلبہ دیتے ہوئے اس طرح جمع بنا گئی گئی۔ نبی کریم تمام کائنات کے لیے رحمت ہیں اس لیے آپ اللہ تعالیٰ کے فیضانِ کرم اور کائنات کے درمیان واسطہ ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کا نور اول المخلوقات سے ہے۔ اور حدیث پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم نے فرمایا:-

”اے جابر! اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کے نور کو سب سے پہلے پیدا کیا۔“

اور حدیث پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ:-

”اللہ تعالیٰ التمتین عطا فرماتا ہے اور میں تقسیم کرنا ہوں۔“

اسی طرح اور یہ فرمایا: العالم جسد سما وجہ النبوة ولا قيام للجسد بدون سما وجہ۔ ”تمام جہان ایک جسم ہے اور نبوت اس کی روح ہے بغیر روح کے جسم کا قیام ممکن نہیں۔“

اس کے بعد اور فرمایا: والذي اختاره الله صلى الله عليه وسلم انما بعث رحمة لكل فرد فرد من العالمين ملائكتهم وانسهر وجنهم ولا فرق بين المؤمن والكافر من الانس والجن في ذلك مختار ميسلک یہ ہے کہ نبی کریم کو تمام کائنات کے ہر فرد کے لیے رحمت بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ ملائکہ، انسانوں اور جنوں تمام کے لیے رحمت ہیں مومنوں اور کافروں کا کوئی امتیاز نہیں۔ تمام مومنوں اور کافروں کے لیے رحمت ہیں۔ خواہ وہ انسان ہوں یا جن۔

اب آپ خود توجہ فرمائیں کہ اہل حضرت کا ترجمہ کتنا حسین اور خوب تر کامل ہے جس میں نبی محترم کی رحمت عامہ کا ذکر واضح طور پر تفاسیر کے مطابق موجود ہے۔ جب کہ دیگر ترجمہ جہاں نے رحمت کا دائرہ تنگ کر کے یا اشارتاً انکار کر کے شانِ مصطفیٰ علیہ النجیۃ والثناء کو چھپانے کی کوشش کی ہے لیکن جس شانِ رحیم کو مالک کائنات ظاہر فرمائے وہ کیسے چھپ سکتی ہے!

وَذَا النُّونِ إِذْ ذُهِبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ أَنْ لَنْ نَقْدِرَ عَلَيْهِ
فَنَادَى فِي الظُّلُمَاتِ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي
كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِينَ (پاک)

- اور مچھلی والے (پیغمبر کا بھی ذکر کیجیے) جبکہ وہ خفا ہو کر چلے گئے اور یہ سمجھے کہ ہم ان پر تنگی نہ کریں گے۔ پھر انھوں نے اندھیروں میں سے پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو ہی سب نقائص سے پاک ہے۔ بیشک میں ہی قصور وار ہوں (عبدالماجد دریا آبادی)
- اور ذوالنون کو یاد کرو جب وہ اپنی قوم سے ناراض ہو کر غصے کی حالت میں چل دیے اور خیال کیا کہ ہم ان پر قابو نہ پاسکیں گے۔ آخر اندھیرے میں خدا کو پکارنے لگے کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور بیشک میں قصور وار ہوں (فتح محمد)
- اور مچھلی والے کو بھی ہم نے نوازا یاد کرو جب وہ بگڑ کر چلا گیا تھا اور سمجھا تھا کہ ہم اس پر گرفت نہ کریں گے۔ آخر کو اس نے تاریکیوں میں پکارا، نہیں ہے کوئی خدا مگر تو پاک ہے تیری ذات۔ بیشک میں نے قصور کیا (مودودی)
- پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے اس کو، پھر پکارا ان اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں سے (مجموع الحسن)
- اور مچھلی والے کو جب چلا گیا غصہ سے تڑکڑ پھر سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے پھر پکارا ان اندھیروں میں کہ کوئی حاکم نہیں سوائے تیرے تو بے عیب ہے میں تھا گنہگاروں سے۔ (شاہ عبدالقادر)
- اور ذوالنون کو یاد کرو جب چلا غصہ میں بھرا تو گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہ کریں گے تو اندھیروں میں پکارا کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاکی ہے تجھ کو بے شک مجھ سے بے جا ہوا (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر آنحضرت نے فظن ان لن نقدر علیہ کا ترجمہ کیا ہے تو گمان کیا ہم اس پر تنگی نہ کریں گے۔ دوسرے مذکورہ تراجم میں ہے سوائے عبدالماجد کے سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے گرفت نہ کریں گے۔ اسی طرح آنحضرت کے ترجمہ اس طرح آیا ہے انی كنت من الظالمين تیرے شک مجھ سے بے جا ہوا اور باقی مذکورہ تراجم میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے میں گنہگاروں سے تھا میں نے قصور کیا۔ تراجم میں پہلا فرق جو بیان کیا ہے اس پر توجہ فرمائیں کہ یہ کہنا سمجھا کہ ہم نہ پکڑ سکیں گے یا یہ کہنا سمجھا ہم پکڑنے کی قدرت نہیں رکھتے یا یہ کہا جائے کہ سمجھا ہم پکڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اردو محاورہ میں تمام الفاظ کا ایک ہی مطلب لیا جاتا ہے۔ حالانکہ اسی مطلب کو علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں رد کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں:

و ثانیہ اقولہ تعالیٰ فظن ان لن نقدر علیہ وذلک یقتضی کونہ شاکا فی قدسہ اللہ تعالیٰ۔ جن حضرات نے انبیائے کرام سے گناہ سرزد ہوتا جائز قرار دیا ہے ان کی یہ دوسری دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد و گرامی فظن ان لن نقدر علیہ۔ تقاضا کرتا ہے کہ یونس علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کرتیو لے ہوں (جو شک کرتیو لا سوتا ہے وہ گنہگار ہوتا ہے) اس دلیل کو آپ نے اس طرح رد فرمایا: والجواب عن الشبهة الثانية وهو التمسك بقوله تعالى فظن ان لن نقدر علیہ ان نقول من ظن عجزا لله تعالى فهو كافر ولا خلاف انه لا يجوز نسبة ذلك الى احاد المؤمنين فكيف الى الانبياء علیہم السلام فاذا لا بد فيه من التاويل وفيه وجه احدها فظن ان لن نقدر علیہ لن تضيق علیہ وهو كقولہ تعالى الله يبسط الرزق لمن يشاء من عباده ويقدر ای يضيق ومن قدر علیہ رزقہ ای ضيق واما اذا ما ابتلاه فقدر علیہ رزقہ ای ضيق ومعناه ان لن تضيق علیہ وعلما ان هذا التاويل تصوير الایة حجة لنا وذلک لان یونس علیہ السلام ظن انه مغیر

ان شمار اقام وان شمار خرج وانہ تعالیٰ لا یضیق علیہ فی اختیارہ -

مترضین کی دلیل کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہاں لن نقدر علیہ کا معنی لن فضیق علیہ ہے تو اب یہ معنی ہوا کہ انھوں نے گمان کیا کہ ہم ان پر تنگی نہ کریں گے۔ آپ نے اس معنی پر قرآن پاک کی تین آیات سے استدلال پکڑا ہے کہ قدر کا معنی تنگی قرآن پاک میں استعمال ہوا ہے - اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر

ومن قدر علیہ منقہ - اور واما اذا ما بتلادہ فقد علیہ منقہ - ان تمام آیات میں قدر کا معنی تنگی کرتا ہے لہذا یہاں بھی اس کا معنی تنگی کرتا ہی ہے۔ پھر آپ نے یہ فرمایا کہ یہ تاویل ہمارے لیے دلیل ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ آپ کو اختیار ہے اگر چاہیں مقیم رہیں اور چاہیں تو اس قوم کو چھوڑ کر چلے جائیں اور اللہ تعالیٰ آپ کے اس اختیار میں تنگی نہیں فرمائے گا۔ اسی طرح مدارک میں بھی آتا ہے: فظن ان لن نقدر فضیق علیہ وعن ابن عباس انہ داخل علی معاویۃ فقال لقد ضربتني امواج القرآن البارحة فغرت فیہا فلم اجد لنفسی خلاصا الا بک قال وما ہی یا معاویۃ فقراء الایۃ وقال او یظن نبی اللہ ان لا یقدر علیہ قال ہذا امن القدس لا من القدسۃ - یعنی اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے گمان کیا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کریں گے۔

حضرت ابن عباس سے مری ہے کہ وہ ایک مرتبہ حضرت امیر معاویہ کے پاس گئے۔ انھوں نے کہا کہ میں گذشتہ رات سے قرآن پاک کی موجوں میں غرق ہوں آپ کے بغیر ان سے نجات ممکن نہیں۔ آپ نے کہا کہ اے معاویہ! وہ کیسا ہے؟ انھوں نے یہی آیت مبارکہ پڑھی اور کہا کہ کیا اللہ کا نبی بھی گمان کر سکتا ہے کہ اللہ قدرت نہیں رکھتا تو آپ نے کہا ان لن نقدر قدر سے مشتق ہے نہ کہ قدرت سے مطلب یہ ہے کہ اس کا معنی تنگی ہے نہ کہ طاقت۔ لہذا معنی یہ نہیں کہ ہم پکڑ نہیں سکیں گے بلکہ معنی یہ ہے کہ ہم تنگی نہیں کریں گے۔

آب دوسرا فرق دیکھیں: انی کنت من الظالمین کا ترجمہ بیشک مجھ سے بے جا ہوا۔ دوسرے تراجم میں میں تھا گنہگاروں سے، میں نے قصور کیا، میں قصور وار ہوں۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تاہم تفسیر کبیر سے ملتی ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں: انی کنت من الظالمین فهو واجب التاویل لانا الواجب انا علی ظاہر لوجب القول بكون النبی مستحقا للطن وهذا لا یقول مسلم واذا وجب التاویل فنقول لاشک انہ کان نارا کالافضل مع القدسۃ علی تحصیل الافضل فکان ذلک ظلما - یعنی اس آیت میں تاویل ضروری ہے کیونکہ اگر ظاہر لیرکھا جائے اللہ نبی کا مستحق لعنت ہونا (الحیاذ باللہ) لازم آئے گا کیونکہ حضرت یونس علیہ السلام کا اگر قول یہ ہو کہ میں ظالم (گنہگار) تھا تو ظالم لعنت کا مستحق ہے اس لیے کہ قرآن پاک میں ہے فلعنت اللہ علی الظالمین - ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو، حالانکہ کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کا نبی ظالم (گنہگار) اور لعنت کا مستحق ہے۔ اس لیے تاویل ضروری ہے۔ لہذا ہم بلا شک یہ کہتے ہیں کہ آپ نے افضل کو چھوڑا یعنی وہاں رہنے کو باوجود اس کے کہ آپ افضل کے حاصل کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ یعنی آپ وہاں سے چلے گئے۔ یہ جانا ترک افضل تھا اسی کو ظلم سے تعبیر کیا ہے معنی یہ ہوا کہ میں نے افضل کو چھوڑا اس لیے مجھ سے بے جا ہوا۔ یہ مراد نہیں کہ مجھ سے گنہ ہوا، ظلم ہوا، میں تھا گنہگاروں سے۔ یہ معنی نبی کی شان کے لائق نہیں۔ اسی لیے علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے رد کیا اور تاویل کر کے اس کا صحیح استعمال بنایا اور اعلیٰ حضرت نے بھی اسی حقیقت کو سمجھتے ہوئے ایسا ترجمہ فرمایا جو بلا غبار ہے جس پر اعتراض کی گروہش ممکن نہیں۔

فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِمَّ صَوَافٍ (پ ۱۱۰)

- پس انھیں کھڑا کر کے ان پر اللہ کا نام لو۔ (مودودی)۔
- پس یاد کرو نام اللہ کا اوپر اس کے پاؤں باندھے ہوئے۔ (شاہ رفیع الدین)

• سو پڑھوان پر نام اللہ کا قطار باندھ کر (شاہ عبد القادر)۔
 • سو تم ان پر کھڑے کر کے اللہ کا نام لیا کرو (مولانا اشرف علی)۔
 • سو تم انھیں کھڑا کر کے اللہ کا نام لیا کرو (عبد الماجد دریا آبادی)۔
 • تو اقر بانی کرتے وقت قطار باندھ کر ان پر خدا کا نام لو (فتح محمد)۔
 • تو ان پر اللہ کا نام لو ایک پاؤں بندھے تین پاؤں کھڑے۔ (علی حضرت)۔
 قربانی کے جانوروں کا ذکر سہولت ہے کہ وہ قربانی کے جانور یعنی اونٹ اور گائے اللہ کی تشانیوں سے ہیں۔ اس کے بعد اونٹوں کے ذبح کرنے کا طریقہ بیان فرمایا کہ ان کو مسنون طریقہ سے ذبح کیا جائے اور وہ طریقہ یہ ہے کہ وہ اونٹ ایک پاؤں سے بندھے ہوں اور تین پاؤں سے کھڑے۔
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مطلب بہت واضح ہے جبکہ دیگر تراجم میں یہ مقصد ظاہر نہیں۔ تفاسیر علی حضرت کے ترجمہ پر تناہید کر رہی ہیں۔ جلالین میں ہے:
 فاذا ذكروا اسم الله عليها عند ذبحها صواف قائمة على ثلاث معفولة البید اليسرى یعنی ذبح کے وقت ان پر اللہ کا نام ایسے حال میں لیا جائے جب وہ تین پاؤں پر کھڑے ہوں اور ان کا اگلا بائیں پاؤں بندھا ہوا ہو۔ فاذا ذكروا اسم الله عليها بان تقروا عند ذبحها بسم الله والله أكبر اللهم منك ولك۔ صواف ای قائمات قد ضعفن ايديهن وارجلهن لان البدنة عند الذبح تعقل احدی يديها فتقوم على ثلاث وعقلها عند الفرسنة عن ابن سابط رضي الله عنه ان النبي صلى الله عليه وسلم ولها حابة كانا يعقلون يدي البدنة اليسرى ويخرونها قائمة على ما
 بقى من قوائمها۔ (المخضر من روح المعاني) یعنی ان کو ذبح کے وقت کہے: بسم الله والله أكبر اللهم منك ولك اس طرح کہ تین پاؤں کھڑے ہوں کیونکہ اونٹ کے ذبح میں مسنون یہی ہے کہ اس کا اگلا بائیں پاؤں باندھا جائے اور تین پاؤں پر وہ کھڑا ہو۔ کیونکہ حضرت ابن سابط رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

نبی کریم اور آپ کے صحابہ کرام اونٹ کو ذبح کے وقت اس کا اگلا بائیں پاؤں باندھ دیتے تھے اور ذبح کرتے جبکہ وہ تین پاؤں پر کھڑا رہتا۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهْ دَمَرْتُمْ صَوَامِعُ
 وَيَسِعُ صَلَوَاتُكَ وَمَسَاجِدُكُمْ قَرِيبًا اَسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا (پیش)

• اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو ایک سے تو دھلے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت (شاہ عبد القادر)۔
 • اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک کو دوسرے سے تو دھلے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام پڑھا جاتا ہے اللہ کا بہت (محمود الحسن)۔
 • اور اگر اللہ آدمیوں میں ایک دوسرے سے دفع نہ فرماتا تو ضرور دھادی جاتیں خالق ہیں اور گر جا اور کلیسے اور مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت نام لیا جاتا ہے۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کے مطابق دیکھیں کیسے مقصد کو واضح کر رہے ہیں جب کہ دیگر مذکورہ تراجم اس سے خالی ہیں اور وہ کہاں تک درست ہیں؟ تفاسیر کی عبارات کو دیکھنے سے واضح ہو جائے گا۔ مدارک میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: ولما ستر كوا ليلن صاوي بيحان لا تسر هبا منهم صوامع ولا ليلهمود صلوات اى كنائس سميت الكنيسة لانه يصلى فيه ولا للمسلمين مسلجهم یعنی اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک دوسرے سے مندرفع نہ فرمایا تو نصاریٰ کے گرجے نہ رہتے اور ان کے پادریوں کی خانقاہیں نہ رہتیں اور یہود کے کلیسے نہ رہتے۔ کلیسا کو مجازاً صلوة سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ وہ محل صلوة ہے۔ اور نہ مسلمانوں کی مسجدیں رہتیں۔ جلالین میں ہے: صوامع للمساكين وبيح كنائس للمساكين و صلوات كنائس لليهود بالعبرانية ومسجد للمسلمين۔

یعنی صوامع سے مُراد نصاریٰ کے پادریوں کی خانقاہیں ہیں اور بیع سے مُراد نصاریٰ کے گرجے اور صلوات سے مُراد یہود کے کلیے اور مساجد سے مُراد مسلمانوں کی مسجدیں۔
 رُوح المعانی میں جو ذکر کیا گیا ہے وہ مختصر یہ ہے : و السبع واحد
 بیعة بوسن فعلتہ وہی مصطلح النصاری و لا تختص
 بوحبائہم کا لُصو معہ وصلوات جمع صلوة وہی کنیستہ الیہود۔
 یعنی بیع کا واحد بیعتہ بوزن فعلتہ یہ عیسائیوں کا گرجا ہے۔ یہ عبادت
 خانہ ان کے پادریوں سے خاص نہیں جس طرح صومعہ (صوامع کا واحد)۔ ان
 کی پادریوں کی عبادت گاہ سے خاص ہے۔ اور صلوات صلوة کی جمع ہے اور یہ
 یہودیوں کا کلیسا ہے۔ اسی طرح کی عبارات کبیر، البوالسعود، الخطیب میں بھی ہیں۔
 اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے اور آیت کریمہ میں جو مقصد محتر ہے
 اس کا صحیح ترجمان ہے۔

لَتَجَرُّوا الْيَوْمَ اِنَّكُمْ مِّنْ لَا تَنْصُرُون (پہلے)

• مت چلاؤ آج کے دن تم ہم سے چھڑائے نہ جاؤ گے (شاہ عبدالقادر)۔
 • مت چلاؤ، آج کے دن تم ہم سے چھوٹ نہ کر سکو گے (محمود الحسن)۔
 • آج فریاد نہ کرو۔ ہماری طرف سے تمہاری مدد نہ ہوگی (علی حضرت)۔
 اس مقام پر لا تنصرون کا ترجمہ کیا گیا ہے ”تم چھڑائے نہ جاؤ گے“
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں آیا ہے تمہاری مدد نہ ہوگی۔ لغوی معنی یہ ہی ہے مولانا
 اشرف علی صاحب نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے۔ اگرچہ امداد کے نہ ہونے سے عذاب
 سے نہ چھڑایا جاتا ہے۔ یا من کو لا تنصرون کا صلہ مانا جائے تو معنی ہوگا :
 تمہیں عذاب سے لاو کا نہیں جائے گا لیکن مختصر میں تو بامحاورہ ترجمہ
 کے قائل ہی نہیں تو یہاں بامحاورہ ترجمہ یا مجازی طور پر ترجمہ کیوں کیا گیا ہے؟ کیونکہ
 اعلیٰ حضرت نے ظلم کا معنی بے جا کیا تو اعتراض یہ کیا گیا کہ لفظ کی لغوی اور اصطلاحی

حقیقت کا علم۔ یہاں کون سا لغوی معنی یا اصطلاحی معنی کیا گیا ہے۔
 تفسیر مدارک میں علی حضرت کے ترجمہ پر تائید موجود ہے۔ ذکر ہے : انکم من
 لا تنصرون ای من جہنم لا یلحقکم نصر و معونۃ یعنی ہماری طرف سے
 تمہاری مدد نہ ہوگی۔ روح المعانی میں ہے : لا یلحقکم من انصرۃ تخیکم
 مما انتم فیہ۔ یعنی جس عذاب میں تم ہو اس سے نجات حاصل کرنے کے
 لیے ہماری طرف سے تمہاری مدد نہیں ہوگی۔

مُسْتَكْبِرِينَ بِسَمِرَاتِهِمْ جُرُون (پہلے)

• تکبر کرتے ہوئے ساتھ اس کے افسانہ کوئی کرتے ہوئے بے ہودہ بکتے
 تھے۔ (شاہ رفیع الدین)۔
 • اپنے گھمنڈ میں اس کو خاطر ہی میں نہ لاتے اپنی چوپایوں میں اس پر باتیں پھیلاتے
 اور بکواس کیا کرتے تھے۔ (مودودی)
 • اس سے بڑائی کر کر ایک کہانی والے کو چھوڑ کر چلے گئے (شاہ عبدالقادر)
 • اس سے تکبر کر کے ایک قصہ گو کو چھوڑ کر چلے گئے (محمود الحسن)۔
 • تکبر کرتے ہوئے قرآن کا مشغلہ بناتے ہوئے یہودہ بکتے ہوئے (عبدالمنان)
 • ان سے سرکشی کرتے کہانیوں میں مشغول ہوتے اور یہودہ بکواس کرتے
 تھے (فتح محمد)۔

• خدمتِ حرم پر بڑائی مارتے ہوئے رات کو وہاں بے ہودہ کہانیاں بکتے حتی
 کو چھوڑے ہوتے۔ (اعلیٰ حضرت)۔

مضمون یہ بیان کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب ہم نے کفار کے
 امیروں کو عذاب میں پکڑ لیا یعنی وہ مسلمانوں سے شکست کھانے لگے، ان کی تلواروں کے
 عذاب میں آئے یا قحط سالی میں مبتلا ہوئے تو وہ فریاد کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے
 ان کی فریاد پر فرمایا، اہج تم فریاد نہ کرو۔ ہماری طرف سے تمہاری کوئی امداد نہ ہوگی

کیونکہ جب میری آیات تم پر تلاوت کی جائیں تم ان سے روگردانی کر جاتے تھے اور خدمتِ حرم کی وجہ سے تم اپنی بڑائی مانتے اور تکبر کرتے تھے اور رات کو یہودہ باتیں کرتے کبھی قرآن کو جادو کہتے، کبھی شعر کہتے اور نبی کریم کی شان میں گستاخانہ کلام کرتے اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور قرآن پاک کو چھوڑتے تفاسیر میں اسی طرح بیان کیا گیا ہے اور علحضرت کے ترجمہ سے بھی یہ واضح ہے :-

متكبرين بـ اى بالبيت الحرام لانهم يستكبرون ويفخرون بانهم خدام البيت وقام وهذا ما عليه جمهور المفسرين سيما اى سمعون بذكر القرآن والطعن فيه و ذلك لانهم كانوا يجتمعون حول البيت بالليل فيسمعون وكانت عامة سمرهم ذكر القرآن وتسميته سحرا وشعرا - (هذا ما حصل من روح المعاني) یعنی متکبرین یہ سے مراد یہ ہے کہ وہ خدمتِ حرم کی وجہ سے تکبر کرتے تھے، اپنی بڑائی بیان کرتے اور فخر کرتے تھے کہ ہم بیت اللہ شریف کے خدام اور اس کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ جمہور مفسرین کرام کے نزدیک یہی معنی ہے۔ سمر کا معنی یہ ہے کہ وہ رات کو بے ہودہ کہانیاں کہتے، قرآن پاک کا تذکرہ کرتے اور اس میں طعن کرتے۔ بیت اللہ شریف کے ارد گرد رات کو جمع ہوتے اور یہودہ باتوں اور کہانیوں میں قرآن پاک کو جادو اور شعر کہتے۔ تہجرون ہجر سے لیا ہوا ہے جس کا معنی قطع کرنا اور ترک کرنا ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ یا نبی کریم یا قرآن پاک کو چھوڑنے والے ہوئے جلالین میں ہے :

متكبرين عن الايمان بـ اى بالبيت او الحرام بانهم اهل في امن بخلاف سائر الناس في مواضع سائر حال اى جماعة يتحدون بالليل حول البيت (يتحدون حول البيت بالطعن في القرآن حاشیہ) تہجرون من المثالي تتكون القرآن من الرباعي اى تقولون غير الحق في البني والقرآن - یعنی وہ ایمان لانے سے تکبر کرتے تھے بیت اللہ شریف یا

حرم کی وجہ سے کیونکہ حرم والے بہ نسبت دوسرے لوگوں کے امن میں رہتے۔ رات کو بیت اللہ شریف کے گرد یہودہ کہانیاں کہتے۔ قرآن پاک میں عجیب نکالتے۔ تہجرون اگر ثنائی سے ہو یعنی ہجر سے مشتق ہے تو معنی یہ ہے کہ قرآن پاک کو چھوڑتے اور اگر رباعی سے ہو یعنی بابِ فاعل سے (رباعی کا مصطلح معنی نہیں) ہو تو معنی یہ ہوگا کہ نبی کریم اور قرآن پاک کی شان میں ناحق کہتے۔

تفاسیر کے بیان کے بعد علحضرت کے ترجمہ کی فوقیت و زور و روش کی طرح بیان ہو گئی۔ زیادہ تبصرہ کی محتاج نہیں۔ نیز مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ حقیقت سے دور، تہجرون کا ترجمہ کیا ہی نہیں۔ باقی ترجمہ بھی ذہنی اقتراعات پر مبنی ہے۔

بَلْ آتَيْنَاهُمْ بَذِكْرِهِمْ عَنْ ذِكْرِهُمْ مَعْصُونَ (پ ۱۶)

- نہیں بلکہ ہم نے ان کا اپنا ہی ذکر ان کے پاس لائے ہیں اور وہ اپنے ذکر سے مٹھ مٹھ رہے ہیں۔ (مودودی)
- کوئی نہیں پہنچائی ہم نے انکو ان کی نصیحت۔ سو وہ اپنی نصیحت کو دھیان نہیں کرتے۔ (محمود الحسن)
- بلکہ ہم نے ان کے پاس ان کی نصیحت کی بات بھیجی۔ سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں۔ (مولانا اشرف علی)
- کوئی نہیں ہم نے پہنچائی ہے انکو ان کی نصیحت۔ سو وہ اپنی نصیحت کو دھیان نہیں کرتے۔ (شاہ عبدالقادر)

• بلکہ ہم نے ان کو ان کی نصیحت (ہی کی بات) بھیجی سو یہ لوگ اپنی نصیحت سے بھی روگردانی کرتے ہیں (عبدالماجد)۔

• بلکہ ہم تو ان کے پاس وہ چیز لائے جس میں ان کی ناموری تھی تو وہ اپنی عزت سے ہی منہ پھیرے ہوئے ہیں (علحضرت)۔

علحضرت کے ترجمہ کی تائید تفسیر روح المعانی سے ملتی ہے مقصد بیان یہ ہے

کہ ان کو قرآن پاک عطا فرمایا جس میں ان کی ناموری تھی۔ انھوں نے قرآن پاک سے منہ پھیرا جس پر ایمان لانے میں ان کی عزت تھی۔ تو قرآن پاک سے اعراض عزت سے اعراض ہوا۔ روح المعانی میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: ای بل اتیناہم بفخرہم و شرفہم الذی کان یحب علیہم ان یقبلوا علیہ اکمل اقبال و یقبلوا ما فیہ اکمل قبول فہم بما فعلوا من النکوح عن ذکرہم اسی فخرہم و شرفہم خاصۃ مع رضون لا عن غیر ذلک مما لا یوجب الاقبال علیہ ولا اعتناء بہ والمراد بالذکر البقاء الذی ہو فخرہم و شرفہم ینطق بقولہ تعالیٰ و انہ لذلک و یقومون یعنی قرآن پاک میں تو ان کو ذکر کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہوا کہ بلکہ ہم نے ان کو عطا کیا وہ جس میں ان کے لئے شرافت و فخر تھا یعنی ان کی ناموری تھی۔ ان پر واجب تھا کہ وہ اس کی طرف کامل توجہ کرتے اور اس کے جمیع احکام و اخبار کو تسلیم کرتے لیکن انھوں نے الٹ کیا اور انھوں نے ذکر سے یعنی اپنے فخر و شرافت (عزت) سے اعراض کیا، منہ پھیرا۔ ان کا منہ پھیرنا اسی چیز سے تھا جس کی طرف ان کو توجہ کرنی ضروری تھی اور اہتمام شان ضروری تھا۔ یعنی ذکر سے مراد قرآن پاک ہے جو ان کے لیے باعث شرافت و فخر تھا (ان کے پاس وہ چیز لائے جس میں ان کی ناموری تھی) اس پر خود قرآن پاک شاہد ہے کہ بیشک یہ قرآن پاک آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے ذکر ہے۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اسی مقصد کو واضح کر رہا ہے اور آپ کی دقت نظر کی نشاندہی کر رہا ہے۔

وَلَا تُکْرِهُوَ اَفْتِیَاتِکُمْ عَلٰی الْبَغَاۃِ اِنْ اَرَدَنْ تَحَصُّنًا (۱۰۱)

- اور نہ زور کرو اپنی چھو کر یوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید سے رہنا۔ (شاہ عبد القادر)
- اور نہ زبردستی کرو اپنی چھو کر یوں پر بدکاری کے واسطے اگر وہ چاہیں قید

سے رہنا (محمود الحسن)۔

• اور مجبور نہ کرو اپنی کنیزوں کو بدکاری پر جب کہ وہ بچنا چاہیں (اعلیٰ حضرت) اعلیٰ حضرت نے فقیات کا ترجمہ کیا ہے "کنیزوں" اور دوسرے مترجمین نے ترجمہ کیا ہے "چھو کر یوں"۔ اسی طرح تحفہ کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے "بچنا" اور دوسرے حضرات نے ترجمہ کیا "قید سے رہنا"۔

اس آیت کریمہ کے شان نزول سے فرق سمجھ آ جائیگا۔ شان نزول روح المعانی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: اخرج مسلم و ابو داود عن جابر بن عبد اللہ عنہ ان جاریۃ لعبد راشد بن سلول یقال لہا مسکۃ و اخری یقال لہا امیمہ کان یکرہہما علی الزنا فشکنا ذلک الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فممن لست۔ مسلم تریف اور ابو داؤد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عبد اللہ بن سلول اپنی کنیز مسکۃ اور دوسری کنیز امیمہ کو زنا پر مجبور کرتا تو انھوں نے نبی کریم کی خدمت میں آکر شکایت کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

و الفقیات جمع فتاة و کل من الفتی و الفتاة کنایۃ مشہورۃ عن العبد والامۃ مطلقا ان اردن تحصن الیس لتخصیص المہنی بمسکۃ اسما دتمین التعنف عن الزنا۔ (روح المعانی) فقیات جمع فتاة کی ہے۔ فتی یا فتاة سے مراد کنایتہ غلام اور کنیز ہیں۔ ان اردنا تحصنا سے یہ وہم نہ پڑے کہ شاید ان عورتوں کو مجبور نہ کیا جائے جو بچنا چاہیں بلکہ کسی کو بھی مجبور نہ کیا جائے۔ مقصد بیان یہی ہے کہ کنیزوں پر جبر نہ کر وجب وہ بچنا چاہیں۔ چھو کر یا قید سے رہنا یہ مقصد کو واضح نہیں کرتے جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصد کو واضح کر رہا ہے۔

وَقَدِمْنَا اِلٰی مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَاهُمْ مِّمَّنْشُورًا (۱۰۲)

- اور آئے ہم طرف اوس چیز کے کہ کیا تھا انھوں نے سب کاموں سے پس

کیا ہم نے اس کو جیسے ذرے پر اگندہ - (شاہ رفیع الدین) -

• اور جو انھوں نے عمل کیے ہوں گے ان کی طرف متوجہ ہونگے تو ان کو اتنی خاک کر دیں گے - (فتح محمد) -

• اور ہم ان کے کاموں کی طرف متوجہ ہونگے جو یہ کر چکے ہیں سو ان کو ایسا ہی کر دیا گے جیسے پریشان غبار (عبدالماجد دریا آبادی)

• اور ہم پہنچے ان کے کاموں پر جو کئے تھے انھوں نے پھر ہم نے کر ڈالا اس کو خاک اڑتی ہوئی (محمود الحسن) -

• اور ہم ان کے کاموں کی طرف جو وہ کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو ایسا ہی کر دیں گے جیسے پریشان غبار - (مولانا اشرف علی) -

• اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اسے لے کر ہم غبار کی طرح اڑا دیں گے - (مودودی)

• اور جو کچھ انھوں نے کام کئے تھے ہم نے قصد فرما کر انہیں باریک باریک غبار کے پکھرے ہوئے ذرے کر دیا کہ روزن کی دھوپ میں نظر آتے ہیں (علی حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے قدیم کا ترجمہ فرمایا ہے "ہم نے قصد فرمایا" یہ

تفاسیر کے مطابق ہے وقد منا ای عمدنا و قصدنا کمافی عن ابن عباس (روح المعانی) قد منا کا معنی ہم نے ارادہ کیا حضرت ابن عباس نے ایسا ہی فرمایا

ہے وقد منا ان القدوم لا یصح الا علی الاجسام لان القدوم حوکرۃ والمقصود بالحوکرۃ محدث و ثبت ان امثله عز وجل لا یخونہ ان یکون محدثا

فوجب تاویل لفظ القدوم و هو من وجہ احدھا وقد منا الی ما عملوا من عمل ای و قصدنا الی اعمالہم و اطلق المسبب علی السبب مجازا

(المختصر من الکسبید) یعنی قدوم (آنا، پہنچنا، متوجہ ہونا) یہ صرف اجسام پر یوں لا جاتا ہے کیونکہ قدوم حرکت ہے اور حرکت حادث میں پائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ حادث ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے لفظ قدوم میں تاویل ضروری ہے۔

اور وہ تاویل کئی وجہ سے ہے۔ ایک یہ ہے کہ ہم نے قصد فرمایا یعنی قدیم کا معنی قصد

ہے۔ یہاں مسبب کا اطلاق مجازاً سبب پر ہے۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہبہا، مستقماً کا واضح ہے۔ کیونکہ صرف خاک اڑانا، غبار کا پریشان ہونا صحیح ترجمانی

نہیں و اخرج جماعة عن مجاهد والحسن وعكرمة وابن مالك وعامر ان شعاع الشمس في الكوة وكانهم ارادوا ما يرمى فيه من

الغبار كما هو المشهور عند اللغويين قال الراغب الهباء دقاق السراب و ما انبت في الهباء فلا يبدو الا في اثناء ضد الشمس

في الكوة منشورا مبالغتي الغناء اعمالهم فان الهباء تراه منتظما مع الضرب فاذا حركته الريح تناثر و ذهب كل مذهب فلم يكف

ان شبه اعمالهم بالهباء حتى جعل منشورا لا يتركب جمع والانتفاع به اصلاً - (المختصر من روح المعانی) -

ایک جماعت نے مجاہد حسن، عکرمہ، ابوالمالک اور عامر سے بیان کیا ہے کہ سوچ کی شعاعیں جو روزن (روشن دان) سے نظر آتی ہیں جن کو دیکھتے والا غبار کے ذرات

سمجھتا ہے اسے ہبہا کہتے ہیں۔ یہی اہل لغت کے نزدیک مشہور ہے۔ راغب نے کہا، ہبہا مٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات کو کہتے ہیں جو ہوا میں اٹھتے

ہیں۔ وہ نظر فقط اس وقت آتے ہیں جب سوچ کی روشنی روزن سے باہر آتی ہے منشوراً کا مطلب ہے کہ ان کے اعمال کامل طور پر بغیر اور بے کار نہیں کیونکہ

غبار کے ذرات جب روشنی میں منتظم مجتمع ہوں۔ جب ہوا چلتی ہے تو وہ ہر طرف پکھر جاتے ہیں۔

اسی طرح ان کے اعمال کی بھی ہبہا سے اس وقت تشبیہ کامل ہوگی جب کہ ان کے اعمال بھی منتشر پکھرے ہوئے سمجھے جائیں گے کہ ان کا جمع ہونا

ممکن نہیں اور ان کو ان کے اعمال کا کوئی نفع نہیں۔ تفاسیر کی ان عبارات کو دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر رکھی

جائے تو واضح ہوتا ہے کہ آپ نے قدِ منا کا معنی ”ہم نے قصد کیا“ بیان کیا ہے وہ ایک اعتراض کو مندرج کر رہا ہے اور سبباً منشوراً کا بھی آپ کا ترجمہ کامل اور واضح ہے۔ دوسرے تراجم کو دیکھ کر اہل انصاف خود ہی کوئی رائے قائم کر لیں: **واللہ**
 یحب للقسطنین -

إِذْ قَالَ لَهُمُ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ (١٩٠/٦)

- جب اُن سے ان کے بھائی نوح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں (فتح محمد)۔
• جس وقت کہ کہا واسطے ان کے بھائی نوح نے کیا نہیں ڈرتے تم۔
(شاہ رفیع الدین)
• جب کہا اُن کو ان کے بھائی نوح نے کیا تم کو ڈر نہیں (شاہ عبدلقدار)
" " " " " "
• جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تھا کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟
(مودودی)
• جب کہ اُن سے اُن کے بھائی نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں (عبدلماجد)۔
• جبکہ ان سے ان کے ہم قوم نوح نے کہا کیا تم ڈرتے نہیں (اعلیٰ حضرت)
اعلیٰ حضرت نے یہاں اُخوہم کا ترجمہ اُن کے ہم قوم کیا ہے جب کہ
دوسرے حضرات نے "ان کے بھائی" کیا۔ صرف بھائی کہنے میں وہم ہے کیا حقیقی
بھائی تھے یا دینی بھائی؟ انصار المؤمنین اخوة کے مطابق یا کہ قومی
بھائی تھے یا شان کے لحاظ سے بھائی کی طرح تھے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کا ترجمہ حقیقت
کو واضح کر رہا ہے کسی وہم کی اس میں گنجائش نہیں ہے کہ وہ ان کے ہم قوم تھے۔
اسی وجہ سے جلالین میں ذکر ہے اُخوہم نسباً بین اسطور میں صاوی کے حوالہ
سے ہے ای لا فی الدین یعنی اُن کے ہم قوم نے کہا۔ یہاں دینی بھائی مراد
نہیں۔ تفسیر کبیر میں ہے: اُخوہم نسباً لانہ کان منہم من قول العرب

یا اخابنی تمیم یرید دن واحد امتمہم ۔ یعنی اُن کے کسی بھائی
ہم قوم مراد ہیں کیونکہ وہ ان سے سے ایک مختص جس طرح اہل عرب کہتے ہیں :
یا اخابنی تمیم ۔ اور مراد اس سے ان میں سے ایک فرد ہوتا ہے ۔ اسی طرح
یہاں بھی ہے ۔ مدارک میں بھی ہے : اذ قال لہم اخوہم لبنا دیننا
جب کہ اُن کو ہم قوم نے کہا کہ دینی بھائی نے ۔

وَسَجَّحْتُنَّ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فَارِهِينَ ﴿١٩﴾

- اور تراش لیتے ہو تم پہاڑوں سے گھر بانٹکلف۔ (شاہ رفیع الدین)
• اور تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے ہوئے مکان بناتے ہو۔ (عبدالماجد)
• اور تکلف سے پہاڑوں میں تراش تراش کر گھر بناتے ہو (فتح محمد)۔
• اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف کے (مولانا محمود الحسن)۔
• اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر تکلف سے (شاہ عبدالقادر)۔
• اور کیا تم پہاڑوں کو تراش تراش کر اتراتے ہوئے مکانات بناتے ہو (اشرف علی)
• تم پہاڑ کھود کھود فخریہ انداز میں عمارتیں بناتے ہو۔ (مودودی)۔
• اور پہاڑوں میں گھر تراشتے ہو استاد دی سے۔ (اعلیٰ حضرت)
• قوم نمود کا ذکر ہے۔ اعلیٰ حضرت نے فارہین کا معنی کیا استاد دی سے اس
کی تائید میں تفاسیر کی عبارت ذکر کی جا رہی ہیں۔ مدارک میں ہے: فارہین
شامی و کوفی حاذقین حال غیر ہم فرہین اشیرین والنفاہتہم
الکلیس والنشاط۔ شامی اور کوفی حضرات نے فارہین (الف کے سا)
پڑھا ہے جس کا معنی ماہر ہونا، استاد ہونا۔ یہ حال واقع ہے۔ ثنایوں اور کوفیوں
کے غیروں نے فرہین (بغیر الف کے) پڑھا ہے جس کا معنی مجبور کرنا، اترانا۔
فراہت کا معنی عقلمندی، زیرکی اور ہشاش بشاش رہنا ہے۔ جلالین میں
ہے: فرہین بطرین و فی قراءۃ فارہین حاذقین یعنی جس

قرأت میں فرہین ہے اس کے مطابق معنی ہے اترانا، تکبر کرنا اور مشہور قرأت میں
فارہین (الف کے ساتھ) ہی ہے اس لیے اس کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق مہارت
سے، استاد سے ہوگا۔ اگر مشہور قرأت فرہین (بغیر الف کے) ہوتی تو اترانا،
اکرٹنا، تکبر کرنا یہ معانی درست ہوتے لیکن مشہور معروف قرأت کے مطابق تفاسیر
کی رائے کو دیکھتے ہوئے کہنا پڑے گا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر سے مطابقت
رکھتا ہے۔

وَادْخُلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ (پ ۱۹)

- اور داخل کر مجھ کو ساتھ رحمت اپنی کے بیچ بندوں اپنے صاحبوں کے۔
(شاہ رفیع الدین)
- اور مجھے اپنی رحمت سے داخل رکھ اپنے نیک بندوں میں (عبدالماجد)
- مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل فرما (فتح محمد)
- اور ملائے مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں (مولانا محمود الحسن)
- اور ملا مجھ کو اپنی مہر سے اپنے نیک بندوں میں (شاہ عبدالقادر)
- اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھے (اشرف علی)
- اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل کر (مودودی)
- اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے ان بندوں میں شامل کر جو تیرے قرب
خاص کے سزاوار ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا ہے اس لیے نبی کی دعا صرف نیک بندوں
میں ہونے کی کافی نہیں بلکہ نیک بندے وہ مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کا قرب خاص
حاصل ہو کیونکہ نیک آدمی تو عام غیر انبیاء بھی ہیں۔ اسی وجہ سے جلالین میں صلیب
کی تفسیر الانبیاء والاء لیا چونکہ یہ قرب خاص کے سزاوار ہیں لہذا ان میں شامل کرنے
کی دعا کی مدارک تفسیر کی ہے: ای فی ذمۃ انبیائک المرسلین

اور مع عبادک الصالحین یعنی مجھے انبیاء و مرسلین کی جماعت میں شامل کر
یا اپنے خاص مقرب بندوں میں شامل کر۔

لَوْلَا اَنْ رَّبَّنَا عَلٰی قَلْبِنَا دِيَارٌ

- اگر نہ ہم نے گمراہی ہوتی اس کے دل پر (محمود الحسن)۔
 - اگر نہ ہم نے گمراہی ہوتی اس کے دل پر (شاہ عبدالقادر)
 - اگر ہم ان کے دل کو مضبوط نہ کئے رہے (عبدالماجد دریا آبادی)
 - اگر ہم نہ ڈھارس بندھاتے اس کے دل پر (اعلیٰ حضرت)۔
- یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کا ذکر ہے جب کہ انھوں نے موسیٰ علیہ السلام
کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ہم اس کے
دل کی ڈھارس نہ بندھاتے تو قریب تھا کہ وہ بے قرار ہوتیں۔
- اس جگہ لولا کا جواب محذوف ہے جس پر ماقبل ان کاد ث کتبہ فی ہم
دلالت کر رہا ہے۔ یہاں بھی اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصود پر دلالت کر رہا ہے اور جو معنی تفاسیر
نے لیا ہے اسی کو آپ نے ذکر فرمایا۔ جلالین میں ہے: لَوْلَا اَنْ رَّبَّنَا عَلٰی
قَلْبِنَا الصَّبْرُ ای سکنہ یعنی اگر ہم اس کے دل کو تسکین نہ دیتے، ڈھارس
نہ بندھاتے۔ اسی طرح روح المعانی میں ہے: لَوْلَا اَنْ رَّبَّنَا عَلٰی قَلْبِنَا
ای بما انزلنا علیہ من السکینۃ والمراد لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنَا قَلْبَهَا وَصَبَّحْنَا
فَالْتَبَطَ عَلٰی الْقَلْبِ مَجَازٌ عَنْ ذَلَالٍ یعنی رُبَّنَا عَلٰی قَلْبِنَا
کا معنی ہے کہ ہم نے جو اس پر تسکین کو نازل کیا۔ مراد یہ ہے کہ اگر ہم اس کے دل کو
ثابت نہ رکھتے اور نہ صبر دلاتے معنی اس کے دل کی ڈھارس نہ بندھاتے۔ یہاں لبط
قلب کا یہی مجازی معنی ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مقصود کو واضح کر رہا ہے۔ اس کے
سمجھنے میں کوئی استحالہ درپیش نہیں آتا اور حقیقی معنی گمراہ دینا مراد نہیں بلکہ مجازی
معنی ہی مخبر ہے جیسا کہ روح المعانی سے واضح ہے۔

فَصْرٌ بِعَنْ جَنْبٍ (پتہ ۱۰)

پھر دیکھتیں رہیں اس کو جنبی ہو کر (محمود الحسن)۔

تو اے دورے دیکھتی رہی (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب دریا میں ڈال دیا گیا تو آپ کی بہن دریا کے

کنارے کنارے دورے صندوق کو دیکھتی رہی۔

اعلیٰ حضرت نے عن جنب کا ترجمہ دورے کیا ہے مفسرین کرام نے بھی زیادہ

طور پر یہی معنی لیا تفسیر کبیر میں ہے عن جنب ای عن بعد یعنی دور سے۔

مدارک میں بھی اسی طرح ہے عن جنب عن بعد دور سے۔ جلالین میں ہے

عن جنب من مکان بعید اختلافاً یعنی دور مکان سے نظر بچا بچا کر

دیکھتی رہی۔ جو روح المعانی میں ہے اختصاراً ذکر کیا جا رہا ہے: عن جنب

ای عن بعد وقیل ای عن شوق وقال الکرمانی الموصوف

محذوف ومعناه عن مکان بعید۔ وقیل عن جانب لاضحا کانت

تمشی علی الشطر۔ یعنی دور سے دیکھتی رہی بعضوں نے کہا

کہ اس کا معنی ہے شوق سے دیکھتی رہی۔ کرمانی نے کہا کہ اس کا موصوف محذوف

ہے۔ اصل عبارت ہوئی مکان جنب۔ اس کا معنی یہ ہوا دور مکان سے دیکھتی رہی۔

بعضوں نے کہا ایک کنارے سے دیکھتی رہی کیونکہ وہ کنارے پر چل رہی تھی۔

جنبی ہو کر دیکھتی رہی میں کسی حد تک ہے وہ یہ ہے: وقیل انظر

عن جانب ان تنظر الی الشئ کانک لا تریده بعضوں نے کہا ایک

طرف سے دیکھتی رہی یعنی کسی چیز کی طرف اس طرح نظر کرنا گویا کہ اس کو دیکھنے کا

ارادہ نہیں تھا تاہم اس کا بھی واضح معنی تو یہ تھا کہ نظر بچا بچا کر دیکھتی رہی۔ حقیقت

ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں زیادہ تفاسیر کے اقوال ہیں۔

عَلَى أَنْ تَأْجُرَنِي ثَمَانِي حَجَّجَ (پتہ ۱۱)

اس عہد پر کہ تم آٹھ برس میری خدمت کرو (فتح محمد)۔

اس شرط پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس (محمود الحسن)۔

اس پر کہ تو میری نوکری کرے آٹھ برس (شاہ عبدالقادر)۔

اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری نوکری کرو (مولانا اشرف علی تھانوی)۔

بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو (مودودی)۔

اس مہر پر کہ تم آٹھ برس میری ملازمت کرو (اعلیٰ حضرت)۔

یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی کلام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کی کہ

میں اپنی دوستیوں میں سے ایک کا ہمتا ہے ساتھ نکاح کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں

شرط یہ ہے کہ مہر کے عوض تم آٹھ سال میری ملازمت کرو۔ اس وقت آپ کی شریعت

میں یہ مہر تھا۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ واضح ہے آٹھ سال تک ملازمت کی شرط بطور

مہر تھی۔ یہ وہم نہیں ہو سکتا کہ شاید آپ صرف بٹنی کا رشتہ دینے کا لالچ دے کر یہ

خدمت کرانا چاہتے ہوں اور مہر بعد میں کوئی اور مقرر کیا جانا ہو۔ باقی تراجم

میں یہ وہم ہو سکتا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں اس وہم کا کوئی ثابہ نہیں۔

روح المعانی میں ہے ویحیی بذلک المہر کہ اس سے مہر مراد ہے۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ (پتہ ۱۲)

تحقیق تو نہیں ہدایت کرتا جس کو چاہے (شاہ رفیع الدین)۔

جس کو آپ چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے (عبدالماجد دریا آبادی)۔

اے (محمد) تم جس کو دوست رکھتے ہو اسے ہدایت نہیں کر سکتے (فتح محمد)۔

تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے (شاہ عبدالقادر محمود الحسن)۔

• اے نبی! تم جسے چاہو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے (مودودی)۔

بے شک یہ نہیں کہ تم جسے اپنی طرف سے چاہو ہدایت کرو (اعلیٰ حضرت) اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہاں یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں ”جسے اپنی طرف سے چاہو“ کیونکہ آپ نے ایک اعتراض کو مندرجہ کیا۔ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کی ہدایت کی نفی فرمائی کہ آپ ہدایت نہیں دے سکتے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: **وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ** کہ آپ سیدھی راہ کی ہدایت فرماتے ہیں۔ اب ایک ہی ذات کا ہدایت فرمانا اور ہدایت نہ دینا ان میں منافات ہے۔ اس لیے اعلیٰ حضرت نے یہ ترجمہ فرمایا کیونکہ مقصد یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر خود ہی اپنی طرف سے کسی کو ہدایت نہیں کر سکتے۔

اسی وجہ سے مدارک میں لا تقدس ان تدخل فی الاسلام کل من اجبت کہ آپ جسے چاہیں اس کو اسلام میں داخل کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ مطلب یہ ہوا کہ نفی قدرت ہے نہ کہ نفی ہدایت وہ بھی مثبت انزیدی کے بغیر۔ اگر رب خود قدرت عطا فرمائے تو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: **انہ تعالیٰ قال فی هذه الاية انک لاتهدی من اجبت وقال فی آية اخرى وانک لاتهدی الی صراط مستقیم ولا تنافی بینہما فان الذی اثبتواضاف الیہ الدعوة والذی نفی عنہ ہدایت التوفیق وشرح الصدوسی وهو خور یقذف فی القلب فیحیا بہ القلب**۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آیت میں ہدایت کا ثبوت ہے اور دوسری آیت میں ہدایت کی نفی ہے لیکن ان میں کوئی منافات نہیں اس لیے کہ جس آیت میں ہدایت کا ثبوت ہے اس میں دعوت حق اور بیان شریع ہے۔ جس میں نفی ہے اس میں توفیق عطا کرنا، سینہ کو کھولنا، دل میں نور ڈالنا جس سے دل کو زندگی حاصل ہو اور نور ایمان کو قبول کر سکے۔

روح المعانی میں ہے: **وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ**

إِلَى الصِّرَاطِ لَا مَحَالَةَ مِنْ اجِبَتْ أَيْ كُلِّ مَنْ أَحْبَبَتْهُ طَبَعًا مِنَ النَّاسِ قَوْمًا وَغَيْرُهُمْ وَلَا تَقْدِرُ أَنْ تَدْخُلَ فِي الْإِسْلَامِ

یہاں ہدایت مراد منزل مقصود تک پہنچنا یعنی ایمان عطا کرنا جس کو آپ اپنی قوم وغیرہ سے پسند فرمائیں اس کو ایمان عطا فرمائیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مقصد یہ واضح ہوا کہ نفی اس ہدایت کی ہے جس میں قدرت و توفیق پائی جائے وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہدایت فرمانا رب تعالیٰ کے اپنے ہی ارشاد گرامی سے ثابت ہے۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب کے ترجمہ میں ’لے محمد‘ کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے۔

وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ (پہلے)

- اور پھونکی اس میں اپنی ایک جان (مولانا محمود الحسن)۔
 - اور پھونکی اس میں اپنی جان میں سے (شاہ عبد القادر)۔
 - اور اس میں اپنی روح پھونکی (مولانا اشرف علی)۔
 - اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی (مودودی)۔
 - اور پھونکنا بیچ اس کے روح اپنی سے (شاہ رفیع الدین)۔
 - اور اس میں اپنی طرف کی روح پھونکی۔ (اعلیٰ حضرت)۔
- اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی طرف سے ایک روح عطا فرمائی یہ مراد نہیں کہ وہ اللہ کی اپنی روح انسان کو حاصل ہو گئی جیسا کہ بظاہر دیگر تراجم سے دہم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے تفسیر کبیر میں ہے: **وَنَفَخَ فِيهِ مِنْ رُوحِهِ** ای الروح التي هي ملكة كما يقول القائل داری وعبادی۔ یعنی یہاں روح سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ کی ملک میں ہے جس طرح کوئی کہے میرا گھر اور میرا غلام۔ اسی طرح یہاں بھی مراد ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اسی وجہ سے یہ ترجمہ فرمایا اپنی طرف کی روح پھونکی۔ مدارک میں ہے: **الاضافة للاختصاص كانہ**

قال ونفخ فيه من الشئ الذي اخترت هو به ويعلمه - یعنی یہاں روح کی نسبت جو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے وہ اختصاص پر دل ہے مطلب یہ ہے کہ انسان میں رب نے اس چیز کو چھوڑا جو اس کے ساتھ خاص ہے اور اس کے علم میں ہے۔ اس سے بھی پتا چلا کہ رب نے اپنی طرف سے انسان کو روح عطا فرمائی روح کو اپنی جانب صرف شرافت و تخصیص کے لیے منسوب کیا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ اس کی اپنی جان اور روح مراد ہے۔ اردو محاورہ میں اس طرح کہا جلتے کہ میں تو اپنی جان کا ذمہ دار ہوں تو اس کا یہ مطلب ہے کہ میں اس کام کے کرنے میں فقط اپنا ذمہ دار ہوں کسی اور کا نہیں۔ اسی طرح یہ کہا جائے کہ جب تک میرے جسم میں میری روح موجود ہے میں انشاء اللہ اسی عقیدہ پر قائم رہوں گا۔ اس سے مراد بھی اس کی اپنی روح ہے اس لیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ وہم نہیں ہوتا لیکن دیگر تراجم میں یہ وہم پایا جاتا ہے۔

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْآدِنِيِّ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ (پلہ ۴)

- اور البتہ چکھا دیں گے ہم ان کو تھوڑا سا عذاب ورے اس بڑے عذاب سے (شاہ عبدالقادر)۔
- البتہ چکھائیں گے ہم ان کو تھوڑا عذاب ورے اس بڑے عذاب سے۔ (مولانا محمود الحسن)۔
- البتہ چکھا دیں گے ہم ان کو عذاب چھوٹا سوائے عذاب بڑے کے۔ (شاہ رفیع الدین)
- اور ضرور ہم انہیں چکھائیں گے کچھ نزدیک عذاب اس بڑے عذاب سے پہلے (اعلیٰ حضرت)۔
- اس مقام پر کفار کا ذکر ہوا ہے کہ ان کو آخرت کا عذاب یعنی عذابِ نار

دیا جائے گا اور اس سے پہلے دنیا کا عذاب دیا جائے گا۔ وہ دنیا کا عذاب کیا ہے؟ جلالین میں ہے: عذاب الدنیا بالقتل والاسر والجدب سنین والامراض۔ ان کو قتل کرنا، قید دلانا اور کئی سال محط سال میں مبتلا کرنا، امراض میں مبتلا کرنا

اب یہ سمجھا جائے کہ اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے العذاب الادنیٰ کا ترجمہ "نزدیک کا عذاب" کیا ہے، تھوڑا عذاب نہیں کیا کیونکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کا لغوی معنی نزدیک ہے جبکہ یہ دنو سے لیا جائے اور گھٹیا ہے جبکہ یہ دنیا دہائی سے لیا جاتے۔ یہاں دنو سے لیا گیا ہے اس لحاظ پر نزدیک کا عذاب کرنا اس میں حس اور کمال ہے کیونکہ اس میں احتیاط ہے، دو متقابلوں میں سے ایک کو ذکر کرنا دوسرے کو چھوڑنا احتیاط ہے۔ یہاں بھی ایسے ہی ہے۔

تفسیر کبیر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْآدِنِيِّ فِي مَقَابِلَةِ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ - فنقول حصل فی عذاب الدنیا امر ان احدهما انه قریب والاخر انه قليل صغير وحصل فی عذاب الاخرة ايضا امر ان احدهما انه بعيد والاخر انه عظیم کثیر لکن القرب فی عذاب الدنیا هو الذی یصلح للتخويف فان العذاب العاجل وان کان قليلاً قد یحترق منه بعض الناس اکثر مما یحترق من العذاب الشدید اذا کان اجلاً و کذا الشراب العاجل قد یرغب فیہ بعض الناس ویستبعد الشراب العظیم الاجل و اما فی عذاب الاخرة فالذی یصلح للتخويف به هو العظیم و اکبر لا البعید لما بینا فقال فی عذاب الدنیا العذاب الادنی لیمحترق منه العاقل عنه وقال لنذیقنهم من العذاب الاصغر ما کان یحترق عنه

لصغره وعدم فهم كونه عاجلا وقال في عذاب الاخرة الاكبر لذلك المعنى ولو قال دون العذاب الا بعد الاقصى لما حصل التخفيف به مثل ما يحصل بوصفه بالاكبر وبالجملة فقد اختار الله تعالى في العذابين الوصف الذي هو اصل للتخفيف من الوصفين الاخرين فيهما الحكمة بالغة.

یہاں بیان یہ کیا جا رہا ہے ولین یقننہم من العذاب الا بعد الاقصى بمقابلتہ العذاب الاقصى کے ہے یعنی دنیا کا عذاب قریب ہے اور آخرت کا عذاب دور ہے۔ اسی طرح العذاب الاکبر، العذاب الاصغر کے مقابلہ میں ہے مقصد یہ ہے کہ آخرت کا عذاب بڑا ہو گا جب کہ دنیا کا عذاب چھوٹا اور محضوڑا۔ اب فرماتے ہیں کہ دنیا کے عذاب کو اتنے یعنی نزدیک سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخرت کے عذاب کو بڑا کہا گیا ہے۔ اس میں یعنی نزدیک کا عذاب بمقابلہ بڑے عذاب کے ذکر کرنے میں کیا فائدہ ہے۔ علامہ رازی اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عذاب دنیا میں بھی دو وجہ کامل ہیں۔ ایک قریب ہونا اور دوسرا محضوڑا اور صغیر ہونا (شدید نہ ہونا) اسی طرح عذاب آخرت میں بھی دو صورتیں ہیں، ایک بعید ہونا اور دوسرا بہت زیادہ شدید ہونا لیکن عذاب دنیا کو ادنیٰ بمعنی قریب (نزدیک) کے ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ مقصود تو خوف دلانا ہے۔ اس میں زیادہ خوف حاصل ہو سکتا ہے۔

اس لیے کہ بعض لوگ جلدی عذاب سے زیادہ ڈرتے ہیں بے شک وہ محضوڑا ہی ہو بہ نسبت اس عذاب کے جو دیر سے آنے والا ہو بیشک وہ زیادہ بھی کیوں نہ ہو۔ یعنی دیروالے عذاب سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا جلدی والے سے ڈرتے ہیں۔ اسی طرح آخرت والے عذاب میں اس کا شدید ہونا اور زیادہ ہونا ڈرانے کا سبب بننے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے اس کا دور ہونا ڈرانے کی صلاحیت اس طرح نہیں رکھتا جس طرح اس کا زیادہ شدید ہونا۔ اسی وجہ سے دنیا کے عذاب کو نزدیک کا عذاب کہا ہے تاکہ عقلمند آدمی اس سے بچے۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ہم چکھائیں گے محضوڑا عذاب تو اس سے اس عذاب کا جلدی ہونا تو سمجھ نہ آتا اور اس کے محضوڑے ہونے کی

وجہ سے اس سے احتراز نہ ہوتا (بچا نہ جاتا)۔

اسی وجہ سے آخرت کے عذاب کو اکبر کہا ہے (بڑا عذاب) اقصیٰ نہیں کہا (دور کا عذاب) کیونکہ آخرت کے عذاب کو جو بڑا عذاب کہنے کی وجہ سے خوف دلانے والا مقصد حاصل ہو سکتا ہے وہ دور کا عذاب کہنے سے نہیں حاصل ہوتا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ کا یہ تقاضا ہے اس نے دونوں عذابوں کے ان وصفوں کو ذکر کیا ہے جس میں خوف دلانے کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ ان وصفوں کو نہیں ذکر کیا جن میں یہ صلاحیت نہیں۔

اب علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ کی اس تقریر دلیلیہ کے بعد بھی کوئی شخص اعلحضرت کے ترجمہ کی خوبی کا منکر ہے اور آپ کی علمی بصیرت کو نہ تسلیم کرے تو یہی دعویٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کے عذاب کو دور کرے ورنہ کسی منصف شخص سے یہ امید کرنا ممکن نہیں کہ وہ اعلحضرت کے ترجمہ کو کامل ترین نہ ملے۔ توجہ فرمائیں کہ اعلحضرت نے العذاب لا دئی کا ترجمہ نزدیک کا عذاب اور دون کا ترجمہ پہلے کیا ہے اور دیگر مترجمین نے العذاب لا دئی کا ترجمہ محضوڑا عذاب اور دون کا ”دوسرا“ (سوا) کیا ہے کون سا ترجمہ حکمت باری تعالیٰ کے مطابق ہے اور کون سا مخالف۔

فَاَخَوَانُكُمُ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ (پہلے)

- تو دین میں تمہارے بھائی اور دوست ہیں (فتح محمد)۔
- پس بھائی تمہارے ہیں بیچ دین کے اور چیلے تمہارے ہیں (شاہ فریح الدین)
- تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق ہیں (مولانا محمود الحسن)۔
- تو تمہارے بھائی ہیں دین میں اور رفیق (شاہ عبدالقادر)۔
- وہ تمہارے دین میں بھائی ہیں اور دوست (اشرف علی)۔
- وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں (مودودی)۔
- وہ تمہارے دین کے تو بھائی ہیں اور تمہارے دوست (عبدالمجید ریاضی)

تو دیکھیں تمہارے بھائی ہیں اور بشریت میں تمہارے چچا زاد (علی حضرت)
حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبقی لے پاک
بیٹے تھے اور لوگ ان کو ابن محمد کہنے لگے۔ اسی وجہ سے جب نبی کریم نے حضرت زینب
بنت جحش سے نکاح کیا تو یہود و منافقین نے یہ کہا کہ دیکھو محمد صلی اللہ علیہ وسلم
نے اپنے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح کر لیا۔ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ کسی کو بیٹا کہنے سے
وہ حقیقتاً بیٹا نہیں بنتا اور جمیع احکام بیٹے والے اس پر جاری نہیں ہوتے کہ جس طرح
حقیقی بیٹے کی مطلقہ یا بیوہ زوجہ سے نکاح نہیں ہو سکتا اسی طرح اس سے بھی نہ ہو۔
اس آیت کریمہ میں یہ ذکر فرمایا کہ تم ان کو اپنے باپوں کے ناموں سے ہی پکارو۔ یہ ہی اللہ
تعالیٰ کو پسند ہے۔

یعنی جس طرح تم زید بن محمد کہتے ہو ایسے نہ کہو بلکہ زید بن حارثہ کہو۔ اسی طرح
اور کسی کو پکارنا ہو تو اس کے باپ کے نام سے پکارو اگر تم ان کے باپوں کو نہیں جانتے
تو وہ تمہارے دین میں بھائی ہیں اور بشریت میں چچا زاد۔ و مولیکم بنو عبدکم
(جلالین) ”اور تمہارے چچا زاد ہیں۔“ اس پر حمل میں اس طرح ذکر کیا
گیا ہے :- و قولہ بنو عبدکم تفسیر للموالی فان الموالی یطلق علی
معانی من جملتها بنو عبدکم ای فاذا لم تعرفوا ابائشخص
تنسبوا الیہ و اسو دم خطاب بقولہ یا ابن عمی یعنی بنو عبدکم سے
مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے موالی کی تفسیر کی ہے کیونکہ موالی کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے
یہاں چچا زاد کے معنی میں استعمال ہے کیونکہ اس کے معانی میں سے یہ بھی ہے۔
مقصد بیان یہ ہے کہ اگر تم کسی شخص کے باپ کو نہیں پہچانتے جس کی طرف اسے
منسوب کر سکو اور اس کا بیٹا کہہ کر اسے پکارو اور تم اسے پکارنا چاہتے ہو، اس سے
کوئی خطاب کرنا چاہتے ہو تو اسے چچا زاد کہہ کر پکارو یعنی اے میرے چچا کے بیٹے
اے میرے چچا زاد کہو۔ یا پہلے جو ذکر ہو چکا ہے فاخوانکم فی الدین کہ وہ تمہارے
دین میں بھائی ہیں، تو ان کو اے میرے بھائی کہہ کر پکارو۔

اس پر کمالین کی عبارت یہ ہے :- بنو عبدکم فان آدم علیہ السلام
جد کی نبی آدم والمرئی یطلق علی بنی العم ومنہ قول ذکر ربی
والی خفت الموالی من ورائی یعنی مولیکم کا معنی تمہارے چچا زاد کیوں ہے
اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام تمام انسانوں کے جدِ امجد ہیں اور مولیٰ کا معنی چچا
آتا رہتا ہے جس طرح حضرت زکریا علیہ السلام نے بارگاہِ ایزدی میں عرض کیا والی
خفت الموالی من ورائی۔ یہاں بھی موالی چچا زاد کے معنی میں ہی ہے۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تفسیر کی تائید موجود ہے اور آپ کا ترجمہ آپ
کے کمالِ علمیّت پر دل ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ (پہلے)

• نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے (محمود الحسن)۔
• ”شہ عبد القدیر“
• یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے۔ (علی حضرت)
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید تفسیر مدارک میں اس طرح ہے :- و هو
اولیٰ بہم ای روف بہم واعطف علیہم وانفع لہم کقولہ تعالیٰ
بالمؤمنین روف رحیم وفی قراءۃ ابن مسعود۔ النبی اولیٰ بالمؤمنین
وہو اب لہم قل مجاہد کل نبی فہو ابوامتہ ولذلك صار المؤمنون
لنوع لان النبی صلی اللہ علیہ وسلم ابوہم فی الدین۔
آپ مومنوں پر اولیٰ ہیں۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ آپ ان پر مہربان
اور رحمدل اور ان کے لیے نافع ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ مومنوں
پر مہربان اور رحیم ہیں۔
حضرت ابن مسعود کی قرأت میں ہے النبی اولیٰ بالمؤمنین
من انفسہم و هو اب لہم۔ نبی مومنوں پر مہربان ہیں اور ان کے مالک ہیں

ان کی جان سے زیادہ کیونکہ وہ ان کے باپ ہیں۔

حضرت مجاہد نے کہا کہ ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے اسی وجہ سے سب لوگ ایک دوسرے کے بھائی ہیں کیونکہ ان کے نبی کریم دینی لحاظ سے ان کے باپ ہیں۔
روح المعانی میں اس طرح ہے جو اختصاراً ذکر کیا جا رہا ہے :-

النبی اولی بالمؤمنین اى لحق واخا ب الیهم من انفسهم
واشد ولایت ونصرة لهم منها فانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام
لایا مرهم ولا یرضی منهم الا بما فیہ صلاحهم وینجاہم عن
الجریرۃ عند صلی اللہ علیہ وسلم انه قال وما من مؤمن الا وانا اولی
الناس بحافی لادنیاء الاخرة۔ نبی کریم مومنوں پر ان کی جان سے زیادہ
حق رکھتے ہیں اور ان کے قریب ہیں۔ یا ان پر آپ کو ولایت حاصل ہے یعنی آپ ان
کی جان سے زیادہ مالک ہیں اور ان کے ناصر ہیں اس لیے کہ نبی کریم نے جو حکم
بھی فرمایا اس میں مومنوں کی بہتری اور کامیابی کو مد نظر رکھا۔

حضرت ابو ہریرہ نبی کریم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ کوئی مومن نہیں
مگر یہ کہ میں تمام لوگوں سے زیادہ اس پر ولایت مالکیت رکھتا ہوں۔
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر مذکورہ تفاسیر کی تائید ہے اور یہ زیادہ قریب الفہم بھی
ہے۔ اگرچہ دیگر تراجم پر بھی تفسیر کبیر سے تائید ملتی ہے تاہم ذکر کرنے کی وجہ یہ
ہے کہ کوئی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو اس مقام پر مورد طعن نہ بنا سکے۔

مَنْ يَأْتِ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ مُّبِينَةٍ (پارا آخری آیت)

- جو کوئی آئے تم میں سے ساتھ بے حیائی ظاہر کے (شاہ رفیع الدین)
- جو کوئی کر لائے تم میں کام بے حیائی کا صریح (مولانا محمود الحسن)
- (شاہ عبد القادر)
- جو کوئی تم میں کھلی ہوئی بے ہودگی کرے گی (مولانا اشرف علی)۔

• تم میں سے جو کوئی کھلی ہوئی بے ہودگی کرے گی (عبدالماجد دریا آبادی)

• جو تم میں صریح خیال کے خلاف کوئی جرات کرے (اعلیٰ حضرت)

اس آیت میں خطاب نبی کریم کی ازواج مطہرات کو ہے جو ائمہ اہل المؤمنین ہیں
ایک ہی مضمون کو ترجمہ کرتے وقت مختلف الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت
کے ترجمہ اور دوسرے تراجم میں کتنا فرق نمایاں ہے۔ آپ نے ایسے الفاظ ترجمہ میں لائے
ہیں جو ادب احترام پر دلالت ہیں جب کہ دیگر حضرات ازواج مطہرات کی شان میں الفاظ
ادب کو پیش نہ کر سکے۔ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے نواز دے وہی بزرگ ہستیوں کی
شان کا پاس کرتا ہے۔

وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (پارا ۲۳)

• اور ڈرنا تمھارے لوگوں سے اور اللہ بہت لائق ہے اس کا کہ ڈرے تو اس
سے (شاہ رفیع الدین)۔

• اور ڈرنا تمھارے لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہیے ڈرنا (محمود الحسن)

• اور تو ڈرنا تمھارے لوگوں سے اور اللہ سے زیادہ چاہیے ڈرنا تمھارے۔

(شاہ عبد القادر)۔

• اور آپ لوگوں سے اندیشہ کرتے تھے اور ڈرنا تو آپ کو خدا ہی سے
زیادہ سزاوار ہے۔ (مولانا اشرف علی تھانوی)

• اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ خدا اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس
سے ڈرو (فتح محمد)۔

• اور تمھیں لوگوں کے طعنہ کا زیادہ اندیشہ تھا اور اللہ زیادہ سزاوار ہے کہ

اس کا خوف رکھو۔ (اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو علم عطا فرمادیا تھا کہ آپ کے نکاح میں حضرت
زینب آئیں گی۔ آپ نے اس کو مخفی رکھا اور لوگوں کے طعنہ کا اندیشہ ہوا کہ لوگ

کہیں گے اپنے نے پاک بیٹے کی زوجہ (مطلقہ) سے نکاح کر لیا ہے۔ نبی کریم کو اس کا پہلے ہی علم تھا کہ حضرت زینب میرے نکاح میں آئیں گی۔ اس پر روح البیان کی عبات ملا حظہ ہو: وهو علم بان شایعہ سیطنتھا و سیکھھا یعنی انت تخلص بما اعلمت انت انھا ستكون زوجتك و انت تخفی فی نفسك هذا المعنی واللہ یرید ان یخزلک وعدہ و یرید انھا زوجتک بقولہ زوجناکما یعنی نبی کریم جانتے تھے کہ حضرت زینب کو طلاق دیدیں گے اور وہ آپ کے نکاح میں آئیں گی یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں علم عطا فرمایا کہ وہ آپ کی زوجیت میں آئیں گی لیکن آپ نے اسے مخفی رکھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا ارادہ فرمایا۔ وہ آپ کی زوجیت میں آگئیں اور اللہ تعالیٰ نے زوجناکما کہہ کر اس کو ظاہر فرمادیا

یہاں تک تو صرف سمجھانے کے لیے آیت کریمہ کا مفہوم پیش کیا۔ اب تراجم میں فرق کی طرف توجہ کی جائے۔ باقی تراجم میں ذکر کو عام رکھا گیا، تو ڈرتا تھا، یا تجھے لوگوں کا اندیشہ تھا۔ اس قسم کے تراجم اوہام باطلہ کا سبب بنتے ہیں جن سے یہ بتا چلتا ہے کہ نبی کریم لوگوں سے ڈرتے تھے حالانکہ آپ نے اکیلے ہوتے ہوئے قوم کو اللہ کی وحدانیت کا پیغام دیا شعب ابی طالب میں قوم کی قطع تعلق کے سبب سے ہے لیکن پائے استقامت میں بچنے آئی۔ ایک مرتبہ اپنے سر پرست چچا ابوطالب کو بھی کہہ دیا کہ آپ میری سرپرستی بیشک چھوڑ دیں میں اللہ کی وحدانیت بیان کرنے سے نہیں مرگ سکتا۔

مطلقاً یہ کہہ دیا جائے تو ڈرتا تھا تو نبی کریم کی شان کے خلاف ہے لیکن علیٰ حضرت نے ایک خاص صوت میں ڈر اور اندیشہ کا ذکر کیا ہے یعنی آپ لوگوں کے طعنہ سے اندیشہ کرتے تھے کہ لوگ کہیں گے کہ اپنے نے پاک بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔ ذکر کا تعلق فقط اسی صورت میں ہے۔

جلالین میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے: وتخشى الناس ان یقولوا تزوج

میں مدخل و جتہ ابنہ۔ آپ لوگوں کے اس طعنہ کی فکر کرتے ہیں کہ لوگ کہیں گے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔

روح المعانی میں ہے: وتخشى الناس تخاف من اعتراضهم وقيل ای تسخى من قولهم ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم تزوج زوجة ابنه والمراد بالناس الجنس والسماء فقوب۔ آپ لوگوں کے اعتراض کی فکر تھی اور کہا گیا ہے کہ آپ انکی باتوں سے شرم محسوس فرماتے تھے کہ یہ کہیں گے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے نکاح کر لیا۔ لوگوں سے مراد بھی منافقین ہیں یعنی یہ فکر منافقوں کی کلام کی تھی۔

علیٰ حضرت کے ترجمہ کی یہی خصوصیت ہے کہ آپ نے ہر پہلو کو مد نظر رکھا اور متوقع خدشات کو پہلے ہی دور فرمادیا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا (آپ ص)

- ہم نے تجھے کو بھیجا بنانے والا (مولانا محمود الحسن)۔
- (شاہ عبدالقادر)۔
- ہم نے آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا کہ آپ گواہ ہوں گے (اشراف علی)۔
- ہم نے تجھے بھیجا گواہ بنا کر (مولانا مودودی)۔
- بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے بطور گواہ (عبدالماجد دریا آبادی)۔
- بے شک ہم نے تجھے بھیجا حاضر و ناظر (اعلیٰ حضرت)۔

اعلیٰ حضرت کے اس ترجمہ پر معترضین نے بڑے غصہ میں کہا کہ حاضر و ناظر کسی لفظ کا ترجمہ نہیں۔ حاضر و ناظر معنی غلط ہے۔ قرآن پاک کے مفہوم سے نا بلند ہونے کی علامت ہے لیکن اس سے یہ ہے کہ معترضین تفاسیر سے نا بلند ہونے کی وجہ سے علیٰ حضرت کے ترجمہ کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ تفاسیر کو دیکھ کر جو بات نہ ملے پھر اعتراض کرے۔ تفسیر روح المعانی میں دیکھا جائے

اس طرح ذکر ہوتا ہے :-

انما ارسلناک شاهد اعلیٰ من بعثت الیہم لتراقب اعمالہم
وتشاهد اعمالہم - ہم نے آپ کو شاہد بنا کر بھیجا یعنی آپ جن کی طرف مبعوث
ہیں ان کے احوال کے محافظ اور ان کے اعمال کے ناظر ہیں۔ روح المعانی میں اور اس
طرح ذکر کیا گیا ہے : انہ صلی اللہ علیہ وسلم حی بروحہ وجسدہ یسریر
حیث شاء فی اقطاس الارض وال ملکوت یعنی نبی کریم اپنے روح اور جسم کے ساتھ زندہ
ہیں اور آپ جہاں بھی چاہیں زمین و آسمان کے اطراف میں جاسکتے ہیں : و انتشار
بعض السادة الصوفیة لی ان الله تعالى قد اطلع صلی اللہ علیہ وسلم
على اعمال العباد فنظر الیہما و لذلک اطلق علیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام
شاهد قال مولانا جلال الدین الرومی قدس سرہ العزیز فی مثنویہ :-
در نظر بودش مقامات العباد زان سبب نامش خدا شاہ نہاد
قابل ولا تغفل بعض سادات صوفیائے کرام نے یہ فرمایا کہ آپ بندوں کے
اعمال پر مطلع ہیں، ان پر نظر فرماتے ہیں۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد
کہا گیا ہے۔ علامہ رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مثنوی میں فرمایا :
”بندوں کے مقامات آپ کی نظر میں ہیں اسی وجہ سے آپ کا نام اللہ تعالیٰ نے
شاہد رکھا۔“

آگے علامہ آکوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سوچ اور غافل نہ ہو مطلب یہ
ہے کہ غافل کو یہ بات سمجھ نہیں آ سکتی۔ اعلیٰ حضرت اپنے ترجمہ میں منفرد ہیں بلکہ تفسیر
میں بھی معنی پیش کیا گیا ہے اور اولیائے کرام بھی اسی معنی کے قابل ہیں۔ البتہ یہ
خیال رہے کہ اہلسنت و جماعت کا حضور کے حاضر و ناظر میں یہ عقیدہ نہیں کہ حضور
اپنے جسم ظہر کے ساتھ ہر جگہ موجود ہیں اور ہر ایک کے سامنے ظاہر ہیں بلکہ عقیدہ
یہ ہے کہ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم میں جاری و ساری ہے حضور صلی
اللہ علیہ وسلم اپنی روحانی طاقت سے بیک وقت کئی مقام پر موجود ہوتے ہیں۔ اسی

وجہ سے اولیائے عظام نبی مخرم کو حالت بیداری میں دیکھتے ہیں اور آپ کی تجلیات کا
مشاہدہ کرتے ہیں حضور کا سامنے ہونا بمعنی حاضر کے ہیں اور آپ کا اپنی اثر اور امت
کے احوال کو دیکھنا بمعنی ناظر کے ہے۔ علامہ عبدالحی لکھنوی نے تشریح و قاریہ کے حاشیہ
سعایتہ میں تحریر فرمایا : السیر فی خطاب التثمدان الحقیقۃ المحمدیۃ
کانہا ساریۃ فی کل وجود و حاضرة فی باطن کل عبد و انکشاف
ہذہ الحالۃ علی الوجه الاکم فی حالت الصلوٰۃ فخص محل الخطاب یعنی علامہ عبدالحی
لکھنوی فرماتے ہیں کہ تشہد میں السلام علیک ایہا النبی میں نبی کریم کو خطاب میں یہ راز
ہے کہ حقیقت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وجود میں جاری ہے اور ہر بندے کے باطن
میں موجود ہے اور یہ حالت کامل طور پر نماز میں حاصل ہوتی ہے اور اسی وجہ سے
محل خطاب حاصل ہو گیا۔

اسی طرح اشعۃ اللمعات شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

”بعضہ از عرفا رگفتہ اند کہ ای خطاب بچہت سر بیان حقیقتہ محمدیہ

است در ذرات موجودات و افراد ممکنات پس آنحضرت در ذوات مصلیٰ

موجود و حاضر است پس مصلی را باید کہ ازین بارگاہ باشند و ازین شہود

غافل نبود تا بہ انوار قرب و اسرار معرفت متنور و فائز گردند“

بعض عارفین نے التّجلیات میں نبی کریم کے خطاب میں یہ وجہ بیان کی ہے کہ حقیقتہ

محمدیہ تمام موجودات کے ذرات اور ممکنات کے افراد میں موجود ہے پس نبی کریم

کی حقیقت نمازیوں میں موجود ہوتی ہے۔ اس لیے نمازیوں کو اس سے باخبر ہونا چاہیے

تاکہ نبی کریم کی موجودگی سے بیخبر نہ رہیں اور نبی کریم کی تجلیات کے انوار سے متنور

ہو سکیں اور کامیابی حاصل کر سکیں۔

اب یہ واضح ہوا کہ اہلسنت و جماعت کا نبی کریم کے حاضر و ناظر ہونے کا

جو عقیدہ ہے اس کو مخفیین و مختصرین کے اپنے ہی ممدوح مولانا عبدالحی لکھنوی نے

بھی تحریر فرمایا ہے۔ امید ہے کہ ان کی وجہ سے ہمیں بھی کوئی تمام کا نو حیدر اپنے

شُرک کے فتویٰ سے بچائے گا یا پھر اپنے امام کو بھی اپنے فتویٰ کی لپیٹ میں لائے گا۔

يَجِبُ اَوْ يَمَعُ (پ ۲۸)

- اے پہاڑو! خوش آوازی سے پڑھو اس کے ساتھ (مولانا محمود الحسن)
 - اے پہاڑو! داؤد کے ساتھ بار بار تسبیح کرو (مولانا اشرف علی)
 - اے پہاڑو! اس کے ساتھ ہم آہنگی کرو (مودودی)
 - اے پہاڑو! ان کے ساتھ تسبیح کرو۔ اے پہاڑو! اس کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرو (اعلیٰ حضرت)۔
- حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر ہے کہ آپ جب اللہ کا ذکر فرماتے، تسبیحات پڑھتے، آپ کے ساتھ پہاڑ بھی پڑھتے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ خوبی ہے کہ مقصد بیان اور لغوی معنی دونوں کو شامل ہے کیونکہ اَوْ یٰی کا لغوی معنی رجوع کرنا ہے آپ نے ترجمہ فرمایا "اللہ کی طرف رجوع کرو" یعنی اللہ کی طرف راجع ہو کر اس کا ذکر کرو۔
- روح المعانی میں ہے: وَالظَّاهِرُ اِنَّهُ عَرَبِيٌّ مِنَ التَّوَابِيْعِ وَالْمُرَادُ رَجَعِي مَعَهَا تَسْبِيحٌ وَرَدَّدِيَةٌ وَقَالَ ابْنُ عَطِيَّةٍ اِنْ اَصْلُ مَا حَضَرَتْ اَبَ وَضَعْفٌ لِّلْمَبَالِغَةِ وَتَعْقِبُهُ فِي الْجَوْرِ بَقَوْلِهِ وَيُظْهِرُ اَنَّ التَّضْعِيفَ لِلتَّعْدِيَةِ لِاَنَّ اَبَ بِمَعْنَى رَجَعٍ لَّا زَمَ صِلَةُ السَّلَامِ فَهَدَى بِالتَّضْعِيفِ اِذْ شَرَحُوهُ بِقَوْلِهِمْ رَجَعِي مَعَهُ التَّسْبِيحُ يَرَوْنَ اِنَّهُ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ اِذَا سَبَّحَ سَبَّحَتِ الْجِبَالُ مِثْلَ تَسْبِيحِهِ بِصَوْتٍ يَسْمَعُ مِنْهَا وَلَا يَعْرِضُ اَمَّا عَزَّ وَجَلَّ اَنْ يَجْعَلَهَا بِحَيْثُ تَسْبِيحُ بِصَوْتٍ يَسْمَعُ وَقَدْ سَبَّحَ الْحَصَى فِي كَفِّ نَبِيْنَا عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَسَمِعَ تَسْبِيحَهُ وَكَذَلِكَ فِي كَفِّ ابْنِ بَكْرٍ رَضِيَ اَمَّا عَنْهُ - يَعْنِي ظَاهِرُهُ يَحْتَمِلُ اَنَّ اَوْ يٰی عَرَبِيٌّ لَفْظُهُ اَوْ اس سے مراد یہ ہے کہ پہاڑو! اللہ کی طرف رجوع کرو یعنی ذکر کرتے ہوئے تسبیحات پڑھتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرو۔

ابن عطیہ نے کہا ہے کہ اصل ماضی آب تھی پھر عربی کلمہ کو مشدّد کیا۔ بالتفصیل پر لے گئے مبالغہ کے لیے۔ اور بحر میں یہ کہا گیا ہے کہ تضعیف متعدي بنانے کے لیے ہے۔ آب لازم ہے رَجَع کے معنی میں ہے۔ اس کے بعد اس کا صلہ لام آتا ہے جب متعدی کیا گیا تو معنی ہوا اللہ کی طرف رجوع کرو تسبیح کرتے ہوئے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیحات کے ساتھ پہاڑ بھی تسبیح کرتے اور ان کی آواز سنائی دیتی تھی۔ (حضرت داؤد علیہ السلام کی تسبیحات سے مراد تلاوت زبور ہے کیونکہ زبور میں صرف ذکر، اذکار اور تسبیحات تھیں، اور وہ اسی نہیں تھے) اللہ تعالیٰ کو مشکل نہیں کہ وہ پہاڑوں کو تسبیحات کی طاقت عطا فرمائے اور ان کی آواز سنائی دے جیسا کہ نبی کریم کے ہاتھ مبارک میں کنکریوں نے کلام کی۔

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ رجوع مع تسبیحات کو مشتمل ہے کیونکہ اللہ کی طرف رجوع اس کے ذکر اور تسبیحات کے بغیر نہیں۔ مدارک میں بھی اسی طرح اَوْ یٰی مَعَهُ مِنَ التَّوَابِيْعِ اِی رَجَعِي مَعَهُ التَّسْبِيحُ - یعنی مع تسبیحات کے رجوع کرو مطلب یہ کہ اللہ کی طرف رجوع کرو۔

فَلَمَّا خَرَّ (پ ۲۹)

- پھر جب وہ گر پڑا (مولانا محمود الحسن، شاہ عبد القادر)۔
 - اسی طرح جب سلیمان گر پڑا (مودودی) • سو وہ جب گر پڑے (عبد المجاہد)
 - پس جب گر پڑا (شاہ رفیع الدین)۔
 - پھر جب سلیمان زمین پر آیا۔ (اعلیٰ حضرت)
- حضرت سلیمان علیہ السلام جتنوں سے بیت المقدس کی تعمیر کرائی تھی۔ آپ پر تو کا وقت آگیا۔ ابھی تک بیت المقدس کا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ آپ کی خواہش پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو اسی طرح عصا پر سہارا لے کر جس طرح کھڑے تھے ثابت رکھا جب عصا کو دیکھنے لگا تو زمین پر تشریف لے آئے تو بیت المقدس کا کام بھی مکمل ہو

چکا تھا۔

یہاں تراجم میں فرق یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم کو مختلف انداز میں پیش کیا گیا ہے لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں ادب کا لحاظ ہے غور فرمائیں ”جب وہ گر پڑا یا زمین پر آیا۔ ان دونوں میں کتنا نمایاں فرق ہے۔

إِنَّ أَصْحَابَ الْجَنَّةِ الْيَوْمَ فِي شُغْلٍ فَاكِهِونَ (پ ۳۴)

تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک دھندے میں ہیں باتیں کرتے (شاہ عبدلقادری)۔
تحقیق بہشت کے لوگ آج ایک مشغلہ میں ہیں باتیں کرتے (مولانا محمود الحسن)۔
اہل جنت بے شک اس روز اپنے مشغلہ میں خوش دل ہوں گے (عبدلماجد)۔
بے شک جنت والے آج دل کے بہلاؤ میں چین کرتے ہیں (اعلیٰ حضرت)۔
اعلیٰ حضرت نے فاکہون کا ترجمہ کیا ہے ”چین کرتے ہیں“ اس کی تائید میں تفسیر مدارک کی عبارت اس طرح ہے :- وَالْفَاكِهَةُ وَالْفَاكِهَةُ الْمُسْتَعْمِلَةُ الْمُسْتَلْذِذُ وَمِنْهُ الْفَاكِهَةُ مِمَّا يَتْلُذُّ بِهِ۔
یعنی فاکہہ اور فکہہ کا معنی چین میں رہنا اور لذت دینا۔ اسی وجہ سے پھلوں کو جولت دینے والے ہوتے ہیں فاکہہ کہا جاتا ہے۔
جلالین میں ہے :- فَاكِهونَ نَاعِمونَ وہ چین میں ہونگے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت پر تفاسیر دال ہیں کیونکہ مقصود یہی ہے کہ وہ اپنے دل کے بہلاؤ میں چین کرتے ہوں گے۔ آپ کا ترجمہ مقصد بیان سے مطابقت رکھتا ہے جو اس کے درجہ کمال پر صراحت دال ہیں۔

بَلْ هُمَ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمونَ (پ ۳۵)

بلکہ وہ آج کے دن فرماں بردار ہیں (شاہ رفیع الدین)

کوئی نہیں وہ آج آپ کو کپڑے لٹاتے ہیں۔ (شاہ عبدلقادری)۔

اے آج تو یہ اپنے آپ کو (اور ایک دوسرے کو) حوالے کئے دے رہے ہیں۔

بلکہ آج تو وہ فرمانبردار ہیں (فتح محمد)

بلکہ وہ آج گردن ڈالے ہیں۔ (اعلیٰ حضرت)۔

اس مقام پر ہتھیوں کا ذکر ہے کہ جب ان کو جہنم کی طرف بھیجا جائے گا، رب تعالیٰ فرمائے گا ان کو ٹھہراؤ۔ ان سے پوچھنا ہے کہ آج تم ایک دوسرے کی مدد کیوں نہیں کرتے؟ تو وہ کوئی جواب دینے کی طاقت میں تو نہیں ہوں گے، ندامت و ذلت سے سر جھکا لیں گے۔ گردن ڈالے ہوئے ہوں گے۔

اعلیٰ حضرت نے مستسلمون کا ترجمہ کیا ہے ”گردن ڈالے ہیں“ جبکہ دیگر تراجم میں ”کوئی نہیں“ کسی عربی لفظ کا ترجمہ نہیں۔ ان کے نزدیک تو جو عربی لفظ مذکور میں ان کے بغیر ترجمہ میں کوئی لفظ آجائے تو قرآن پاک کی معاذ اللہ تحریف لازم آتی ہے۔ کیا وہ اپنے بزرگوں کو بھی محرف کہنا پسند کریں گے یا کہ دوسروں کو ہی اپنے فتوؤں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ پھر مستسلمون کا ترجمہ اپنے آپ کو کپڑے لٹاتے ہیں یا آپ کو کپڑے لٹاتے کس لذت کا ترجمہ ہے؟ اور فرماں بردار ترجمہ کرنا بھی مقصد کے خلاف ہے۔

آئیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کی روشنی میں انصاف کی نظر سے دیکھیں تو بلاشبہ اس کی افادیت کا انکار نہیں ہو سکے گا۔ مدارک میں ہے :-

مُسْتَسْلِمونَ مُنْقَادونَ اَوَاسِلُ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ وَخَزْلَةٌ عَنْ عِزِّهِمْ مُسْتَسْلِمونَ غَيْرُ مُنْتَصِرٍ۔

یعنی وہ گردن ڈالے سر جھکائے ہوں گے ایک دوسرے سے بھی ندامت اٹھا رہے ہوں گے۔ سب اپنے عجز کی وجہ سے رُسا ہوئیں گے۔ تمام کے تمام سر کھائے ہوں گے۔ کوئی کسی کی امداد نہیں کر سکے گا۔

جلالین میں ہے :- مُنْقَادونَ اِذْ لَا ذِلَّةَ سَے گردن ڈالے ہوں گے۔

خطیب میں ہے :- مُنْقَادونَ اِذْ لَا اِمْشِئَةَ لَهُمْ فِي دَفْنِهِمْ الْمَضَارِ۔
ذلت سے گردن ڈالے ہوں گے اس عذاب سے بچنے کے لیے کوئی حیلہ نہیں ہوگا۔

روح المعانی میں ہے: مستسلمون منقادون لعجزهم
وانفسداد الحیل علیہم واصل الاسلام طلب السلام
والافتیاء لازم لذلك عرفا فلذا استعمال فيه وہ اپنے عجز اور کوئی حیلہ نہ چلنے کی وجہ
سے گردن ڈالے ہوں گے۔

اصل میں استسلام کا مطلب سلامتی کی طلب ہے۔ اور سر جھکانا، گردن ڈالنا یا
اطاعت کرنا اسی کے عرف میں لازمی معانی ہیں۔ اسی وجہ سے اس میں استعمال ہے۔
تفسیر کبیر میں ہے: يقال استسلم للشيء اذا القادله وخضعه ومعه
في الاصل طلب السلامة بتزك النازعة والمقصود انهم صاروا
منقادين لا حيلة لهم في دفع تلك المضار لا العابد والمحبود۔
استسلم للشيء کہا جاتا ہے جب کہ کوئی اس کے سامنے سر جھکائے اور عاجزی
کرے۔ اصل میں اس کا معنی جھگڑا کو چھوڑنا اور مسالمت طلب کرنا۔ اور مقصود یہ ہے
گردن ڈالے ہوں گے۔ عاید اور مجبور میں سے کسی کو بھی اس عذاب کے مندرجہ ذیل
میں حیلہ کرنے کی طاقت نہیں ہوگی۔

تفاسیر کی عبارات دیکھنے کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر نظر ڈالیں تو یقیناً
عظیم الشان ترجمہ نظر آئے گا۔ اور موذی صاحب کا ترجمہ مقصد سے بہت ہی
دور ہے۔

فراغ علیہم ضرباً باليمين (پ ۲۴)

- پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے (عبدالماجد دریا آبادی)
- پھر ان کو داہنے ہاتھ سے مارنا (اور توڑنا) شروع کر دیا (فتح محمد)۔
- پھر گھسا ان پر مارتا داہنے ہاتھ سے (شاہ عبدالقادر)۔
- پھر گھسا ان پر مارتا ہوا داہنے ہاتھ سے (محمود الحسن)۔
- پھر ان پر قوت کے ساتھ جا پڑے اور مارنے لگے۔ (مولانا اشرف علی)

- اس کے بعد وہ ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں (موذی)
- تو لوگوں کی نظر بچا کر انہیں داہنے ہاتھ سے مارنے لگا (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بتوں کو توڑنے کا ذکر ہے۔ آپ نے اپنی قوم
کی نظر بچا کر بتوں کو توڑ دیا۔ اعلیٰ حضرت نے فراغ علیہم کا ترجمہ کیا ہے ”لوگوں کی نظر
بچا کر“ جب کہ دیگر مترجمین نے ”پھر گھسا ان پر“ یا ”پھر ان پر قوت سے جا پڑے“
اور ”ان پر پل پڑا“ ترجمہ کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفاسیر کی تائید حاصل ہے۔
مدارک کا حوالہ ذکر کر رہا ہوں ملاحظہ ہو۔ فاقبل علیہم ضرباً فاقبل
علیہم مستغفياً کانہ قال فضر بهم ضرباً لا منہ سراغ
علیہم آپ ان کی طرف مخفی طور پر متوجہ ہوئے، گویا کہ یہ کہا گیا ہے
ان کی نظر بچا کر (قوم کی) ان کو مارا۔

تفسیر کبیر میں ہے: فراغ الى الهتهم يقتل داخل اليه اذ امال اليه في السر
على سبيل الخفية ومنه دوغان الشلب تھیل رہے کہ تفسیر کبیر یہ عبارت اس
لیے پیش کی جا رہی ہے کہ دونوں جگہ لفظ فراغ استعمال ہے جو دونوں مقاموں پر
ایک ہی معنی میں استعمال ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فراغ الیہ کہا جاتا ہے جب کہ وہ
کسی چیز کی طرف پوشیدہ مخفی طور پر مائل ہو۔ اسی معنی میں دوغان الشلب بھی
ہے ”لومڑی کا آہستہ طور پر مخفی ہو جانا“ کبیر میں ہی ہے: فراغ علیہم ضرباً
فاقبل علیہم مستغفياً۔ ان کی طرف مخفی طور پر متوجہ ہوئے۔

واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے مقصود بھی یہی ہے کہ
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لوگوں کی نظر بچا کر بتوں کو مارا۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ
بھی یہی ہے جو مقصود پر دال ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فوقیت ظاہر رہا پھر
ہو گئی۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ قَالَ يَبْنِيْ اِلَيَّ اَرَى فِي الْمَنَامِ الْاَيَةَ

(پتہ ۳۴)

• پھر جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں تجھ کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے۔ شاہ عبد القادر • سو جب وہ لڑکا ایسی عمر کو پہنچا ابراہیم کے ساتھ چلنے پھرنے لگا تو ابراہیم نے فرمایا کہ بر خور دار میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تم کو ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو تمہاری کیا رائے ہے۔ (مولانا اشرف علی)۔

• پس جب پہنچا اس کے ساتھ دوڑنے کو کہا اے بیٹے میں دیکھتا ہوں خواب میں تم کو ذبح کرتا ہوں پھر دیکھ تو تو کیا دیکھتا ہے (مولانا محمود الحسن) • جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا۔ (فتح محمد) • پس جس وقت پہنچا دوڑنے کو کہا اے چھوٹے بیٹے میرے تحقیق میں دیکھتا ہوں بیچ خواب کے تحقیق میں ذبح کرتا ہوں تجھ کو پس دیکھ کیا دیکھتا ہے تو (شاہ ریح الدین)۔

• پھر جب وہ اس کے ساتھ کام کے قابل ہو گیا کہ اے میرے بیٹے میں نے خواب دیکھا میں تجھے ذبح کرتا ہوں۔ اب تو دیکھ تیری کیا رائے ہے؟

(اعلیٰ حضرت)

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا جا رہا ہے جب کہ آپ نے خواب میں اپنے بیٹے کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا تو بیٹے سے مشورہ کیا کہ اس معاملہ میں تمہاری رائے کیا ہے۔ آپ نے خواب آٹھ ذراچ کو دیکھا اور دس ذراچ کو ذبح پر عمل کر دیا۔

اب تراجم میں فرق دیکھیں۔ علحضرت نے ”سعٰی“ کا معنی کام کرنے کے قابل کیا ہے۔ باقی حضرات نے دوڑنا یا چلنا پھرنا کیا ہے۔ تفاسیر کے حوالے سے

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں ایک دن دیکھا اسی دن تردد میں رہے کہ کیا واقعی اس پر عمل کرنا ہے۔ دوسرے دن یقین آنے پر تیسرے دن اس پر عمل کیا۔ اور حضرت اسمعیل علیہ السلام کے ذبح کا واقعہ جب درپیش آیا تو آپ کی عمر اس وقت تیرہ سال تھی۔ مقصد یہ ہے کہ جب خواب دیکھی تو اسی وقت ذبح کا واقعہ درپیش آیا۔ یہ نہیں کہ خواب پانچ چھ سال پہلے دیکھی ہو اور عمل بعد میں کیا ہو۔

اب اس بات کے سمجھنے کے بعد یہ واضح ہوا کہ یہ خواب والا معاملہ اس وقت درپیش آیا جب کہ حضرت اسمعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال تھی اور تیرہ سال کا لڑکا باپ کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اگر معنی چلنے پھرنے والا کیا جائے تو تین سال میں بھی اس پر عمل کرنا ممکن ہے کیونکہ تین سال میں عمر میں لڑکا اچھی طرح چل پھر سکتا ہے اور اگر دوڑنے والا معنی کیا جائے تو پانچ سال کی عمر میں بھی اس پر عمل ہو سکتا ہے کیونکہ پانچ سال کی عمر میں لڑکا اچھی طرح دوڑ سکتا ہے۔ اگر معنی کام کے کیا جائے قابل تو اسی وقت تیرہ سال کی عمر درست ہو سکتی ہے کیونکہ کام کے قابل اس عمر میں ممکن ہے اس سے پہلے صحیح طور پر نہیں ہو سکتا۔ اب اس پر تفاسیر کی عبارات پیش کرنا ہوں تاکہ بیان کردہ مضمون کی توثیق ہو سکے :-

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيُ بَلَغَ اَنْ يَّسْعِيَ مَعَ اَبِيْهِ فِي اشْغَالِهِ وَحَالِهِ

وَكَانَ اِذَا ذَاكَ ابْنُ ثَلَاثِ عَشْرَةَ سَنَةً (المختصر من المدارك)

یہ جب وہ اپنے باپ کے ساتھ ان کے کاموں اور حاجتوں میں کام کرنے کے قابل ہوئے۔ یہ اس وقت ہوا جبکہ آپ کی عمر تیرہ سال تھی۔ فلما بلغ معه السعی

ای ان یسعی معه ویعیینہ - (جلالین) جب وہ آپ کے ساتھ

کوشش کرنے لگے اور ان کی امداد کرنے لگے یعنی ان کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوئے۔

فلما بلغ معه السعی الذی یسعی مع ابيه فی امور دنیاہ معینا له

علیٰ اعمالہ (جمل) یعنی جب وہ امور دنیا اور معاملات میں اپنے باپ کے ساتھ کام کرنے کے قابل ہوتے۔

تراجم میں دوسرا فرق یہ ہے کہ ماذاتری کا اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "تیری کیا رائے ہے؟" جبکہ دوسرے بعض حضرات نے ترجمہ کیا ہے "تو کیا دیکھتا ہے؟" مفسرین کرام نے دیکھنے والے معنی کو رد کیا ہے اور رائے والے معنی کو پسند کیا ہے۔ مدارک میں ہے: ماذاتری الراۃ علی وجه المشاورۃ لا من رؤیت

العین ولم يشاوره لیوجع الی دایہ ومشورۃ ولكن لیعمل۔ ایجنع ام یمسیر مشورہ کے طور پر ان سے رائے لی کہ تمھاری کیا رائے ہے؟ تری کو الراۃ سے لیا ہوا ہے رویت یعنی دیکھنے والا معنی نہیں کہ تم کیا دیکھتے ہو بلکہ معنی یہ ہے کہ تمھاری رائے کیا ہے؟ باقی آپ کا رائے لینا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کے مشورہ اور رائے پر عمل کریں گے بلکہ مشورہ اس لیے تھا تاکہ آپ کا صبر یا بے صبری ظاہر ہو جائے۔ جلالین میں ہے: ماذاتری من الراۃ شاوہ لیاہن بالذہم وینقاد لہ مرہ۔ یعنی تری ماخوذ ہے الراۃ سے آپ نے مشورہ کیا حضرت اسماعیل علیہ السلام سے تاکہ ان کو ذبح سے اُٹس ہو جائے اور اُمر کو ماننے کے لیے مطیع ہو جائیں کیونکہ اس پر عمل تو ضروری تھا اس لیے کہ امر حتمی تھا کیونکہ وحی خفی سے ثابت تھا۔ روح المعانی میں ہے: ماذاتری من الراۃ وانما شاوہ فی ذلک وهو حتم لیعلم ما عندہ۔ یعنی ماذاتری میں تری کو راۃ سے لیا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے رائے لی کہ تمھاری رائے کیا ہے اور آپ نے ان سے مشورہ صرف اس لیے لیا کہ ان کی رائے بھی ظاہر ہو جائے ورنہ آپ نے اس کام کو ضروری کرنا تھا۔

تفصیل کی مذکورہ بالا عبارات سے ظاہر ہوا کہ اسمعیٰ اور اسی طرح ماذاتری کا جو ترجمہ اعلیٰ حضرت نے کیا ہے اس کو تفاسیر کی تائید حاصل ہے اور مقصد بیان کے مطابق

ہونے کی وجہ سے اس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے جس کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو حسن و خوبی حاصل ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

عطر آں باشد کہ خود بیوید نہ کہ عطار بگوید

وَقَالَ لِلْحَبِیْنِ (۳۳)

• اور بچھاڑ اس کو مانتھے کے بل (مولانا محمود الحسن)۔

• ابراہیم نے بیٹے کو مانتھے کے بل گرا دیا (مودودی)۔

• اور باپ نے بیٹے کو مانتھے کے بل لٹایا (اعلیٰ حضرت)۔

جب کہ اس سے پہلے قُلْنَا اٰتٰیٰکَ اے جس کا معنی ہے دونوں باپ اور بیٹے نے اللہ کے حکم کے سامنے گردن جھکا لی دونوں فرماں بردار ہو گئے تو باپ نے بیٹے کو مانتھے کے بل لٹایا مطلب یہ ہے کہ جب دونوں باپ اور بیٹا اللہ تعالیٰ کے حکم کو مانتے ہوئے اس کی فرمانبرداری میں اس کام کو مکمل کرنے لگے تو پھر گرا نایا بچھاڑنا کیسے؟ اس لیے کہ عرفی معنی بچھاڑنا یا گرا نانا کا یہ ہوتا ہے کہ کسی کو زبردستی گرا دیا جائے لیکن کسی کے فرمانبرداری ہوتے ہوئے اس کو زمین پر لٹانا ہی ہوتا ہے، بچھاڑنا یا گرا نانا مراد نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے اعلیٰ حضرت نے لٹانا ترجمہ کیا ہے اور یہ معنی ہی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شان کے لائق ہے۔

اِذَا بَقِيَ اِلَى الْفُلِّ الْمَشْحُوْنِ (۳۴)

- جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر (محمود الحسن)۔
- جس وقت بھاگ گیا طرف کشتی بھری ہوئی کے (شاہ رفیع الدین)۔
- جب بھاگ کر پہنچا اس بھری کشتی پر (شاہ عبدالقادر)۔
- جب کہ بھاگ کر کشتی کے پیس پہنچے (مولانا اشرف علی)۔
- اور جب وہ ایک بھری کشتی کی طرف بھاگ نکلا۔ (مودودی)

• جب وہ بھاگ کر بھری ہوئی کشتی کے پاس پہنچے (عبدالماجد)۔

• جب کہ بھری کشتی کی طرف نکل گیا (العلحضرت)۔

حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے۔ نبی کا بھاگ کر جانا نبی کی شان کے لائق نہیں۔ اسی وجہ سے العلحضرت نے یہ ترجمہ نہیں کیا کہ وہ بھاگ کر کشتی کی طرف چلے گئے۔ بلکہ آپ نے ترجمہ کیا ہے کہ وہ کشتی کی طرف نکل گئے، چلے گئے۔ یعنی گویا کہ العلحضرت نے اُن کا ترجمہ کیا ہے کہ وہ نکل گئے۔ باقی حضرات نے ترجمہ کیا ہے کہ وہ بھاگ گئے۔

حضرت یونس علیہ السلام کے جانے کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ فظن ان لن نقدر علیہ کے ماتحت تفسیر کبیر کے حوالہ سے بحث گزر چکی ہے کہ آپ کے جانے میں آپ خطا کار نہیں تھے کیونکہ آپ نے اجتہاد سے کام لیا۔ آپ نے یہ خیال کیا کہ شاید مجھے جانے اور رہنے میں ایک جیسا اختیار حاصل ہے۔ آپ رب تعالیٰ سے حکم طلب کرنے کے بغیر اور حکم کے آنے کے انتظار کے بغیر چلے گئے۔

اس مقام پر لوگوں نے حضرت یونس علیہ السلام کے بھاگنے والا معنی لے کر کچھ وجہ بیان کی تھی لیکن صاحب کبیر نے اس کو رد کیا۔ بعض حضرات نے آپ کے بھاگنے کو اس سے تعبیر کیا کہ آپ اپنے سید، مالک یعنی اللہ تعالیٰ سے بھاگے۔ لیکن علامہ رازی نے فرمایا کہ یہ بعید بات ہے کہ اللہ کا نبی اللہ ہی سے دور بھاگے اور اس کی مخالفت کرے بعضوں نے کہا تھا کہ آپ کے بھاگنے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو حکم دیا گیا تھا کہ تم بنی اسرائیل کی طرف جاؤ لیکن آپ نے اس حکم کو نہ مانا، اس لیے آپ اللہ تعالیٰ کے غضب و غضب سے ڈر کر بھاگے۔

علامہ رازی نے اس کو بھی رد فرما دیا اور کہا کہ یہ بھی بعید ہے۔ اللہ کا نبی ایسا نہیں کر سکتا۔ بعض نے کہا تھا کہ آپ کے بھاگنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنی قوم کو تبلیغ کرنی چھوڑ دی تھی لہذا اس کو بھاگنے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کو بھی رد کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جب انبیاء کے کرام کو بھیجا ہی

اسی مقصد کے لیے جاتا ہے تو ان کا تبلیغ کو چھوڑنا ممکن نہیں۔

اب مقصد یہی ثابت ہوا کہ آپ اپنے اجتہاد کی وجہ سے وہاں سے کشتی کی جانب نکل گئے تاکہ یہاں سے نکل سکیں۔ یہ معنی ہی اللہ کے نبی کے منصب کے مطابق ہے کہ آپ بھاگے نہیں، ڈرے نہیں، اللہ کے حکم کو عمداً چھوڑا نہیں۔ ایسی باتیں اللہ کے نبی کی شان کے مناسب نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو فوقیت حاصل ہے کہ آپ نے نبی کی شان کے لحاظ سے ترجمہ کیا جب کہ باقی حضرات اس مقام کی گہرائیوں کو نہ پاسکے۔

وَاجْتَبَيْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّنْ يَقْطِينٍ (پ: ۹۶)

• اور ہم نے ان پر ایک بیل دار درخت بھی لگا دیا (عبدالماجد دریا آبادی)

• اور اگایا ہم نے اس پر ایک درخت بیل کا (شاہ عبدالقادر)۔

• اور ہم نے اُن پر ایک بیلدار درخت بھی اگایا تھا (مولانا اشرف علی)

• اور اس پر ایک بیلدار درخت اگادیا (مودودی)۔

• اور ہم نے اس پر کدو کا پیڑ اگادیا (اعلیٰ حضرت)۔

حضرت یونس علیہ السلام جب مچھلی کے پیٹ سے باہر تشریف لائے تو آپ کا جسم نرم اور خفیف ہو گیا تھا۔ آپ پر سایہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر کدو کا درخت اگایا جو آپ پر سایہ کرتا تھا۔ اگرچہ کدو کی بیل ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت اور آپ کے اعجاز کے سبب کدو کو ایک درخت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اعلیٰ حضرت نے یقیناً کا ترجمہ کدو کا پیڑ کیا ہے اگرچہ یقیناً کا معنی صرف

بیل ہے جیسا کہ روح المعانی میں ہے کل شجرة لاساق لمراد ذہو یقطين۔ یعنی بیل جس میں تنہا نہیں اس کو یقیناً کہتے ہیں لیکن اس بیل سے مراد کدو ہی ہے۔ اس لیے العلحضرت کے ترجمہ میں وضاحت کی گئی ہے کہ بیل سے مراد کدو کی بیل ہے اور وہ بھی اس وقت فقط بیل نہیں تھی بلکہ ایک درخت تھا۔

اب روح المعانی سے عبارت پیش کر رہا ہوں جس سے پتا چلتا ہے کہ وہ کدو کا درخت مراد ہے یعنی قدرت الہی سے اسے درخت بنا دیا گیا تھا:

والمراد به علي ما جاء عن الحسن البسط وابن عباس في رواية
وابن مسعود وابن هريرة وعمر بن ميمون وقتادة وعكرمة
وابن جبير ومجاهد في إحدى الروايتين عنهما الدباء وهو القرم
المعروف وكان النبي صلى الله عليه وسلم لم يحب وانبتها الله تعالى
مظلة عليه لانهما تجمع خصا لا برد الظل والملمس وعطر الورق
وان الدباب لا يقع عليها ما قيل وكان عليه السلام لورقة جلده بمكة
في بطن الحوت يودب الدباب ومما ساء ما فيه خشونة ويؤلمه
حر الشمس ويستطيب بارح الظل فلطف الله تعالى به بذلك
وذكر ان ورق القرم انفع شجر لمن ينسلخ جلده واشتهر ان
الشجر ما كان على ساق من عود فيشكل تفسير الشجرة هنا بالبدن واجاب
ابو حيان بانه يحتمل ان الله تعالى انبت بها على ساق
لتظله خرقا للعادة - يعني اس جگہ لفظین سے مراد ان تمام
حضرات کے نزدیک جن کے اسمائے گرامی عربی عبارت میں موجود ہیں (دیا ہے)
دباء سے مراد مشہور و معروف ہے وہ کدو ہے جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پسند
فرماتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام پر اس کو اس لیے اگایا تاکہ
آپ پر سایہ کرے اور آپ کو ٹھنڈک پہنچائے اور آپ کو ان کے پتے مس کریں اور
اس کے بڑے پتے آپ پر رہیں تاکہ آپ پر مکھیاں نہ بیٹھ سکیں کیونکہ بیان کیا جاتا ہے
کہ کدو کے پتوں پر مکھیاں نہیں بیٹھتیں۔ حضرت یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ
میں رہنے کی وجہ سے چڑا نرم ہو گیا تھا۔ آپ کے لیے مکھیاں باعث تکلیف بن
سکتی تھیں اور سخت چیز کا مس کرنا اور سوج کی گرمی آپ کے لیے تکلیف کا باعث
بن سکتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے آپ کو اس کے سایہ سے آرام

پہنچایا اور بیان کیا جاتا ہے کہ کدو کے پتے اترے ہوئے چمڑے کے لیے بھی مفید ہوتے
ہیں۔ تو گویا آپ کے لیے بھی مفید تھے۔

اب اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ شجرۃ اور لفظین دونوں کو جمع کیا گیا ہے اور مراد
کدو لیا ہے حالانکہ کدو کو شجرہ نہیں کہا جاسکتا۔ اس لیے کہ شجرۃ تو اس درخت کو
کہتے ہیں جس میں لکڑی کا تنہا ہو حالانکہ کدو کی سیل میں لکڑی کا تنہا نہیں ہوتا۔ اس کا
جواب ابو حیان نے یہ دیا کہ اس میں یہ احتمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خلاف عادت
کدو کی سیل کو تنے والا درخت بنا دیا ہوتا کہ سایہ کرے۔ اس مقام پر یہ واضح ہوا کہ
مراد کدو کا درخت ہی ہے اور یہی قول مفید ہے اور وہ بھی فقط سیل نہیں رہی تھی
بلکہ اس کو تنے والا بنا دیا تھا۔

مدارک میں ہے: قيل لرسول الله صلى الله عليه وسلم انك
لتحب القرم قال اجل هي شجرة اخي يونس نبی کریم سے عرض کیا گیا کہ آپ کدو
کو پسند کرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں! اس لیے کہ یہ میرے بھائی یونس کا درخت
ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مقصود زیادہ ظاہر ہے۔

لَئِنْ أَشْرَكَتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ (پہلے)

• کہ اگر تو نے شریک مان لیا تو اکارت جائیں گے تیرے عمل اور تو ہوگا ٹوٹے
میں ٹرا (مجموع الحسن)۔

• اگر تو نے شریک مانا، اکارت جاویں گے تیرے کئے اور تو ہوگا ٹوٹے
میں آیا (شاہ عبدالقادر)

• اگر تم نے شریک کیا تو تمہارے عمل برباد ہو جائیں گے۔ (فتح محمد)

• اگر شریک لاؤ گے تو الینہ ناپید ہو جاویں گے عمل تیرے (شامی الدین)

• کہ اے سننے والے! اگر تو نے اللہ کا شریک کیا تو ضرور تیرا سب کیا دھرا

اکارت جائے گا اور ضرورتاً ہمارے رہے گا (۱) علیٰ حضرت
 اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے ”اے سننے والے الفاظ زیادہ کہئے ہیں جب کہ دوسرے
 مترجمین نے ایسے الفاظ کی زیادتی نہیں کی۔ حالانکہ زیادتی ضروری تھی کیونکہ بظاہر مطلقاً
 یہ خطاب نبی کریم کو نظر آتا ہے اور نبی کریم سے شرک کا سرزد ہونا ممکن نہیں بجا نبی
 کریم صغائر و کبائر سے پاک ہیں تو شرک جیسا جرم عظیم سرزد ہونا محال ہے۔ اور
 مولوی فتح محمد کے ترجمہ میں شرک کی نسبت جمیع انبیائے کرام کی طرف کی گئی ہے لہٰذا
 یہ بھی درست نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ میں یہ واضح کر دیا کہ یہ خطاب
 نبی کریم کو نہیں بلکہ آپ کی امت کو ہے اگرچہ بظاہر خطاب نبی کریم کو بھی ہو پھر بھی
 مراد آپ کی امت ہے۔ اور اگر خطاب نبی کریم کو مانا جائے اور مراد بھی آپ ہی لیے
 جائیں تو بالفرض کے الفاظ نہ آئیں اور ”اے سننے والے“ الفاظ بھی نہ آئیں تو کیسے
 نبی کریم کی طرف اس خطاب کو منسوب کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مفسرین
 کرام نے مذکورہ توضیحات کو بیان کیا ہے اور اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی ان کے مطابق
 ہے۔ جلالین میں ہے :-

لئن اشرکت یا محمد فرضاً

اس پر صاوی میں اس طرح ہے :-

فرضاً ای علی سبیل التقدير وفرض المحال
 وهو جواب عن سوال مقدر - کیف یقع الشوک من
 الانبیاء مع عصمتهم وقیل المقصود بالخطاب

اممهم لعصمتهم من ذالک -

یعنی اے نبی کریم اگر بالفرض محال آپ شریک ٹھہرائیں۔ صاوی نے بیان کیا
 کہ علی سبیل الفرض کیوں کہا ہے؟ اس لیے کہ ایک سوال کا جواب دینا مقصود ہے
 سوال یہ ہے کہ انبیائے کرام سے شرک کیسے واقع ہو سکتا ہے حالانکہ وہ معصوم
 ہوتے ہیں؟ تو اس کا ایک جواب علی سبیل الفرض سے دیا کہ یہ کلام بالفرض پر مبنی

ہے۔ دوسرا جواب اس کا یہ دیا کہ مقصود اس قسم کے خطاب سے انبیائے کرام نہیں
 ہوتے بلکہ ان کی امتیں ہوتی ہیں کیونکہ انبیائے کرام تو معصوم ہوتے ہیں۔ مدارک میں ہے۔
 وانما مع هذا الکلام مع علمہ تعالیٰ بان رسالہ لا یشترکون لان الخطاب
 للنبی صلی اللہ علیہ وسلم والمراد بغيره ولائہ علی سبیل
 الفرض والمحال لا یصح فرضہا -

یعنی یہ کلام صحیح ہے باوجود اس کے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس کے
 رسول شرک نہیں کرتے۔ اس لیے کہ یہ خطاب بظاہر نبی کریم کو ہے لیکن حقیقتاً آپ کی
 امت کو ہے۔ اور یہ کلام علی سبیل الفرض ہے اور محالات کو فرض کرنا صحیح ہوتا ہے
 تفسیر مدارک میں اس طرح ہے :- کیف مع هذا الکلام مع علم اللہ تعالیٰ
 انہ رسالہ لا یشترکون ولا تحبط اعمالہم والیہ ان قولہ
 لئن اشرکت لیحبطن عملک قضیۃ شرطیۃ والقضیۃ الشرطیۃ
 لا یلزم من صدقہا صدق جزأیہا الا تری ان قولہ لئن
 لوکانت الخمستہ زواجاً لکانت منقسمۃ بمساویین قضیۃ
 صادقۃ مع ان کل واحد من جزأیہا غیر صادق قال اللہ تعالیٰ
 لوکانت فیہما الہتہ الا الہتہ لفسدتا ولم یلزم من
 هذا صدق القول بان فیہما الہتہ وبانہما
 قد فسدتا -

یعنی یہاں سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ کلام کس طرح صحیح ہے جبکہ
 اسے معلوم ہے کہ اس کے رسول نہ شرک کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے اعمال ضائع ہوتے
 ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لئن اشرکت
 لیحبطن عملک قضیۃ شرطیۃ ہے اور قضیۃ شرطیۃ کے سچا ہونے کے لیے یہ
 ضروری نہیں کہ اس کی جزاء میں بھی سچی ہوں۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ تمہارا قول لوکانت
 الخمستہ زواجاً لکانت منقسمۃ بمساویین (اگر پانچ جفت ہوتے

تو برابر برابر کی طرف منقسم ہوں گے) یہ قضیہ سچا ہے حالانکہ اس کی جزائیں سچی نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی لو کان فیہما الہمتہ الا اللہ لفسدتا قضیہ شرطیہ ہے اور سچا ہے لیکن اس کے سچا ہونے سے یہ لازم نہیں ہوتا کہ زمین و آسمان میں متعدد خدا واقع بھی ہوتے ہوں اور فساد لازم آیا بھی ہو یعنی نہ خدا متعدد ہوتے اور نہ فساد لازم آیا۔ اسی طرح یہ کلام بھی بالفرض پر مبنی ہے نہ شرک ہوا اور عمل کا ضیاع لازم آیا۔ یہ بات بخوبی واضح ہوتی۔ قرآن پاک میں خطاب نبی کریم کو بلا واسطہ ہے۔ امت کو بلا واسطہ یا خطاب امت کو ہوگا بلا واسطہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اور یا خطاب خود نبی کریم کو ہوگا جب تک کسی قید کا اضافہ نہ کیا جائے ظاہر یہی سمجھا جائے گا کہ خطاب نبی کریم کو ہے اور شاید نبی سے بھی شرک سرزد ہو سکتا ہے اور عمل ضائع ہو سکتے ہیں۔

عام ذہن رکھنے والے لوگ جو علمی مقام نہیں رکھتے، تفاسیر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں ہوتی وہ اسی قسم کے تراجم کو دیکھ کر ایسی آیات کا سہارا لے کر خود تو بھٹک جاتے ہیں لیکن غیروں کو بھی بھٹکاتے رہتے ہیں اور یہی اردو تراجم کو دیکھ کر جہل مرکب کے مصداق علمییت کے دعوے دار، علمائے کرام کے لیے بھی دردِ سر بن رہتے ہیں۔

لیکن بقیۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت کے ترجمہ کو دیکھ کر کسی شخص کو اس قسم کا وہم نہیں ہوتا۔ وہ راہِ راست سے بھٹکتا نہیں۔ اس سے بڑھ کر اور ترجمہ کی خوبی کیا ہو سکتی ہے!

وَجِئْنَا بِالنَّبِيِّينَ وَالشُّهَدَاءِ وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۶۲)

• اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (عبدالماجد دریا آبادی)

- اور حاضر آئیں پیغمبر اور گواہ اور فیصلہ ہو ان میں انصاف سے اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (مولانا محمود الحسن) (شاہ عبدالقادر)۔
- اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور سب میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا جائے گا اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (اشرف علی)۔
- انبیاء اور تمام گواہ حاضر کر دیے جائیں گے لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا (مودودی)۔
- اور لائے جائیں گے انبیاء اور یہ نبی اور اس کی امت ان پر گواہ ہوں گے۔ اور لوگوں میں سچا فیصلہ فرما دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا (اعلیٰ حضرت) اس مقام پر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ وضاحت کہ انبیائے کرام پر گواہی دے والے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی امت ہوگی۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ وضاحت پائی جاتی ہے کہ وہ فیصلہ لوگوں میں ہوگا یعنی انبیائے کرام کی امتوں میں ہوگا، لیکن صرف اتنا کہنے سے کہ ان میں انصاف ہوگا بات واضح نہیں ہوتی کہ فیصلہ کن میں ہوگا۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں جو وضاحت پائی گئی اس کی تاثیر میں جلالین کی عبارت ملاحظہ ہو: وجیئ بالنبیین والشہداء ای بمحمد صلی اللہ علیہ وسلم وامتہ شہدون المرسل بالبلاغ۔ یعنی انبیائے کرام کی تبلیغ فرمانے پر (کہ اے اللہ انبیائے کرام نے میرے پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیئے تھے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کو اہی دیں گے۔ اسی کو حاشیہ میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے :- وجیئ بالنبیین ای لیسدعوا علی اممہم انہم بلغرہم الرسالت وذلک لان امثہ یجمع الخلاق الاولین والآخرین فی صعید واحد ثم یقول کفار الامم الم یاتکم منذیر فینکرون ویقولون ما جاءنا من نبیذیر فیسأل اللہ الانبیاء عن ذلک فینقولون کذبوا فربما ہم فیسألہم البیتہ وھو اعلم بہم اقامۃ

للمحجة فيقولون امة محمد تشهدون فيؤتيها مائة محمد صلى الله عليه وسلم فيشهدون
 لهم انهم قد بلغوا فتقول الامم المعاصية من اين علموا وانما كان بعد نافي سال هذه
 الامة فيقولون ارسلت اليها رسولا وانزلت علينا كتابا واخبرتنا فيه بتبليغ
 الرسيل وانت صادق فيما اخبرت ثم يؤتي بمحمد صلى الله عليه وسلم فيخبر
 الله عاينته فيؤتيه فيشهد (مصدق) انبياء كرام كودر بار الهى في اس ليح حاضر کیا جائیگا
 تاکہ وہ اپنی امتوں پر دعویٰ کریں کہ انھوں نے ان لوگوں کو احکام پہنچا دیے ہیں۔ یہ
 اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق اگلے اور پچھلے لوگوں کو ایک بلند جگہ پر جمع کرے گا
 اور کافروں کے گروہوں کو کسے گا، کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے والے نہیں آئے
 تھے؟ اور وہ کہیں گے ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا، پھر اللہ تعالیٰ
 انبیائے کرام سے اس کے متعلق سوال کریگا۔ وہ کہیں گے اے اللہ! یہ لوگ جھوٹے
 ہیں۔ ہم نے تو ان کو تمام احکام پہنچا دیے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ انبیائے کرام
 سے گواہ پیش کرنے کا مطالبہ کرے گا حالانکہ اسے معلوم ہے کہ انبیائے کرام نے
 تو تبلیغ فرمادی لیکن اس مطالبہ سے کافروں پر حجت قائم کرنا مقصود ہوگا۔ پس
 انبیائے کرام نبی کریم کی امت کو بطور گواہ پیش کریں گے جو ان کے حق میں گواہی
 دے گی کہ اے اللہ! ان انبیائے کرام نے تو تبلیغ فرمادی تھی۔ تب وہ پہلی امتیں
 کہیں گی اے اللہ! ان کو کیا معلوم ہے۔ یہ تو تمھارے بعد آئے۔ تو اس وقت
 تو اللہ تعالیٰ نبی کریم کی امت سے پوچھے گا، تم نے کس طرح گواہی دی ہے؟ تو
 یہ لوگ عرض کریں گے اے اللہ! تو نے ہماری طرف رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا
 اور ہماری طرف بواسطہ رسول اللہ کتاب کو نازل فرمایا اور اس کتاب میں تو نے
 ہمیں انبیائے کرام کی تبلیغ کی خبر دی کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کی لیکن ان کی امتوں نے
 انکار کیا اور اے اللہ تیری خبر سچی ہے۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لایا جائے گا اور ان سے آپ کی امت کے
 متعلق سوال ہوگا تو آپ اپنی امت کی پاکیزگی کا ذکر فرمائیں گے اور امت کی سچائی

کی گواہی دیں گے۔

تو اس طرح کافروں کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ ان کو جہنم میں بھیجا ان سے الصا
 ہوگا ظلم نہیں ہوگا کیونکہ وہ اس کے اہل ہوں گے۔ اب واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے
 اس آیت کریمہ میں جن گواہوں کا ذکر فرمایا ان سے ملاد نبی کریم اور آپ کی امت ہے۔
 اس مقصد کو اعلیٰ حضرت کے فقہ عظیمین واضح طور پر پیش کیا گیا ہے جبکہ
 دیگر تراجم وضاحت کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کے ترجمہ میں یہ خوبی کامل طور پر
 پائی جاتی ہے کہ مقصد کو واضح کیا جاتا ہے اور تفاسیر کے مطابق ہوتا ہے جس
 مقام پر مفسرین کرام مقصد کو سمجھانے کے لیے بعض الفاظ کو نکالتے ہیں۔ اعلیٰ
 حضرت کا ترجمہ اسی کے مطابق ہوتا ہے۔

ذِي الطَّوْلِ (پط ۶)

مقدور کا صاحب (شاہ عبدالقادر) • مقدور والا (محمود الحسن)

• قدرت والا (مولانا اشرف علی) • قدرت والا (عبدالماجد ریابادی)

• بڑے انعام والا (اعلیٰ حضرت)۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کا ذکر فرمایا، ان میں ایک یہ صفت بھی ہے۔

اعلیٰ حضرت نے اس کا معنی کیا ہے ”بڑے انعام والا“۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید
 جلالین میں دیکھیں :-

ذِي الطَّوْلِ اى الانعام الواسع - يعنى واسع النعم والا، بڑے انعام

والا۔ حاشیہ میں ہے : ذِي الطَّوْلِ اهل بالفتح الافضل يقال لفنون

على فلان طول اى زيادة و فضل و سمي الغنى ايضا طر لا لانه ينال

به من المروءات ما لا ينال عند الفقر (روح) وفى الصراح طول بالفتح

منت نهادن و فرونى کردن بر کسی و غالب آمدن در فضل و منت فالطولی

فى اللغة الزيادة و التفضيل و الظاهر من الله انه بال ثواب

والانعام وبردنا افعال الشارح الانعام الواسع وفسر الاخر وبيان
المراد ههنا الفضل بتوث العقاب المستحق. یعنی لفظ طول کے ط
پر زبر ہے اور اس کا معنی زیادتی فضیلت ہے جس طرح کہا جاتا ہے لنلان
على فلات طول۔ اس کا یہ معنی ہوتا ہے کہ فلاں کو فلاں پر برائی اور
فضیلت ہے۔ اسی وجہ سے غنی کو بھی ذوالطول کہا جاتا ہے کیونکہ جو مروت
اس سے حاصل ہو سکتی ہے وہ فقیر سے نہیں ہو سکتی۔ اور صراح میں ہے طول
ظاہر کی زبر کی صورت میں اس معنی میں آتا ہے، کسی پر احسان کرنا، کسی کا کسی پر
فضیلت حاصل کرنا، کسی کا کسی پر فضیلت میں غالب آنا۔ طول کا لغوی معنی
زیادتی اور فضیلت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت میں ظاہر ہی ہے کہ اس کا
معنی ثواب اور انعام عطا کرنا۔ اسی وجہ سے شارح نے بڑے انعام والا معنی کیا
ہے۔ اور حضرات نے یہ تفسیر بھی کی ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ
عذاب کے مستحقین سے عذاب کو ترک فرما کر ان پر اپنا فضل فرماتا ہے۔ کبیر میں ہے
ذی المول ای ذی التفصیل یقال طال علینا طولا ای
تفضل علینا تفضلا۔ یعنی ذوالطول کا معنی صاحب تفضل ہے کہا جاتا
ہے۔ طال علینا طولا اس کا معنی یہ ہے کہ اس کو ہم پر فضیلت حاصل ہے
اللہ حضرت کا ترجمہ واضح ہے اور مقصد بھی یہی ہے۔

مَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ (پہلے پڑھو)

- کوئی نہیں گنہگاروں کا دوست اور نہ سفارش کہ جس کی بات مانی جائے۔
- (محمود الحسن)
- کوئی نہیں گنہگاروں کا دوست اور نہ کوئی سفارش (ث) حمید القادر
- اور ظالموں کا نہ کوئی دوست نہ کوئی سفارش جس کا کہا جاتا جائے
- (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت نے ظالمین کے ترجمہ میں بھی لفظ ظالموں کو ہی استعمال کیا ہے یعنی
ظالموں کا نہ کوئی دوست ہوگا نہ سفارش کیونکہ ظلم کا اطلاق شرک پر بھی ہے: ان
الشرك لظلم عظیم۔ بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے اور ترجمہ میں ظالم کو لانے
میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ظالمین سے مراد مشرکین، کافرین ہیں۔ لیکن گنہگار کہنے
میں حرج ہے کہ شاید کسی گنہگار کا کوئی سفارشی، شفاعت کرنے والا نہیں ہوگا۔
حالانکہ یہ غلط ہے۔ پہلے دوسرے مسئلہ شفاعت کو ذکر کیا جا چکا ہے اور اس
آیت کریمہ کی تفسیر میں بھی علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا کہ گنہگاروں کے لیے
شفاعت کے منکر معتزلہ ہیں: اذبح اکثر الہ محتزلہ فی نفع الشفاعت
عن المذنبین بقولہ تعالیٰ ما للظالمین من حمیم ولا شفیع
یطاع قالوا نفی حصول شفیع لهم یطاع فوجب ان لا یحصل لهم
هذا الشفیع۔ اجاب اصحابنا عنہ من وجہ الاول انہ تعالیٰ نفی ان
یحصل لهم شفیع یطاع وهذا لا یدل علی نفی الشفیع الا تری
انک اذا قلت ما عندی کتاب یباع فہذا یقتضی نفی کتاب
یباع ولا یقتضی نفی الکتاب یعنی اکثر معتزلہ نے اس آیت کریمہ ما للظالمین
من حمیم ولا شفیع یطاع سے دلیل پکڑی ہے کہ گنہگاروں کے لیے شفا
نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب ایسا شفیع جس کی بات مانی جائے اس کی نفی ثابت ہوئی
تو اس سے پتا چلا کہ کوئی شفیع نہیں ہوگا۔ اس کا جواب کئی وجہ سے دیا گیا ہے:
ایک یہ ہے کہ یہاں نفی اس شفیع کی ہے جس کی بات کو مانا جائے۔ اس سے
مطلقا شفیع کی نفی نہیں کی تھیں معلوم نہیں کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرے پاس
کوئی کتاب نہیں جس کو بیچا جائے تو اس کلام سے کتاب کی نفی نہیں بلکہ کتاب کے
بیچنے کی نفی ہے۔

اس کا دوسرا جواب علامہ رازی نے اس طرح دیا ہے ما ان المراد من
الظالمین ہهنا الکفار والدلیل علیہ ان هذه الایۃ وسر دست

فی زجر الکفار الذین یجادون فی آیات اللہ فریب ان یکون مختصا بهم وعدنا ان لا شفاعة فی حق الکفار یعنی اس آیت میں ظالموں سے مراد کفار ہیں اور دلیل اس پر یہ ہے کہ یہ آیت کفار کو زجر و توبیخ کرنے کے لیے نازل ہوئی جن کفار کا ذکر اللہ تعالیٰ نے جہادون فی آیات اللہ (وہ جو اللہ کی آیات میں جھگڑا کرتے ہیں) میں ہے۔ پس واجب ہے کہ یہ آیت ان کے ساتھ ہی مختص ہے۔ ہمارے نزدیک یہ ہی ہے کہ شفا کا فروں کے لیے نہیں ہوگی۔

اس سے واضح ہو کہ مطلقاً گناہ کرنے سے مقصد حاصل نہیں ہوتا، البتہ ظلم کرنے سے مقصد حاصل ہے کیونکہ ظالم سے مراد خود اللہ تعالیٰ نے کافر ہی لیے ہیں۔

وَإِنْ يَكْذِبْكَ بِأَفْعَلِكِ كَذِبُهُ (پہ ۲۳)

• اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ اُس پر پڑے گا (عبدالماجد دریا آبادی)

• اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس کے جھوٹ کا ضرر اسی کو ہوگا (فتح محمد)۔

• اگر وہ جھوٹا ہوگا تو اس پر پڑے گا اس کا جھوٹ (محمود الحسن)۔

• " " " " (شاہ عبدالقادر)۔

• اگر وہ جھوٹا ہی ہو تو اس کا جھوٹ اس پر پڑے گا (اشرف علی)۔

• اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اسی پر ملے گا (مودودی)۔

• اور اگر بالفرض وہ غلط کہتے ہیں تو ان کی غلط گوئی کا وبال اُن پر (الحضرت)

الحضرت کے ترجمہ پر خود قرآن پاک شاہد ہے کیونکہ اس آیت کریمہ کا مکمل مفہوم

یہ ہے کہ آل فرعون سے ایک شخص جو ایمان کو چھپاتا تھا، اس نے کہا، کیا تم اس

شخص کو قتل کرتے ہو جو کہتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ بے شک وہ تمہارے رب

کی طرف سے تمہارے پاس روشن دلیل لایا ہے۔ اگر وہ بالفرض جھوٹے ہیں تو ان کی

غلط گوئی کا وبال ان پر، اور اگر وہ سچ کہتے ہیں تو جس کا تمہیں وعدہ دیتے ہیں

تمہیں بھی ایضاً پہنچ جائے گا۔

اب قرآن پاک سے ہی واضح طور پر یہ سمجھ میں آگیا کہ یہ کلام اس شخص کی ہے جو درپردہ ایمان رکھتا تھا اور کلام موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے۔ لہذا یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ وہ شخص جو ایمان دار تھا وہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حقیقتاً یہ خیال کرتا تھا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر پڑے گا جھوٹ۔ بلکہ اس کا مطلب ہی تھا کہ اگر وہ بالفرض غلط کہتے ہیں تو غلط کہنے کا وبال اُن پر۔ (الحضرت کا ترجمہ حقیقت اور ادبِ ہر امت پر مبنی ہے۔)

وَمَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ (پہ ۲۴)

• تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان (مولینا محمود الحسن)۔

• " " " " (شاہ عبدالقادر)۔

• آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور یہ خبر تھی کہ ایمان کیا چیز ہے۔

(مولینا اشرف علی)

• متعین کچھ بتا نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان کیا ہوتا ہے (مودودی)۔

• (نزول وحی سے پہلے) آپ کو نہ یہ خبر تھی کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ کہ

ایمان کیا چیز ہے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)۔

• اس سے پہلے نہ تم کتاب جانتے تھے نہ احکام شرع کی تفصیل (الحضرت)

اس مقام پر تمام مترجمین نے نزول وحی سے قبل ایمان کے علم کی بھی نفی کر دی

کہ نبی کریم وحی سے پہلے ایمان کو نہیں جانتے تھے۔ یعنی آپ کو بتا ہی نہیں تھا کہ

ایمان کیا چیز ہے۔ حالانکہ نبی کریم کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کہیں : وَاَنَا

أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ کہ میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی ذات کو ماننے والا ہوں۔

صاوی میں ہے : وَأَنَّا أَوَّلُ الْغَائِبِينَ لَعَالَمٌ ذُو حَقِيقَةٍ - یعنی

آپ فی الواقع حقیقتاً سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننے والے

تھے۔ اس سے پتا چلا کہ آپ ایمان کو تو پہلے سے ہی جانتے تھے۔ یہ کہنا کہ

آپ وحی سے پہلے ایمان بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا چیز ہے، یہ غلط ہے۔
جلالین میں ہے: وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ شَرِيعَتُهُ وَمَعَالِمُهُ يَعْنِي إِيْمَانًا
سے مراد احکام شرع کی تفصیل ہے۔

الخطیب میں ہے: وَلَنْ كَانَ قَبْلَ الْبَشَرِ قَدْ كَانَ مِقْدَارُ الْوَاحِدِ الْإِلَهِيِّ
اللَّهُ تَعَالَى وَعَظَمَتِهِ يَعْنِي إِيْمَانًا كَمَا مَعْنَى أَحْكَامِ شَرْعٍ كِيْفِيَّةً لِيُفْصِلَ كَيْفِيَّةً
اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے قبل بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت
وعظمت کا اقرار فرماتے تھے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا أَوْ مِنْ وَدَّ حِجَابٍ
(۲۶۰)

- اور نہیں ہے کسی آدمی کو کہ بات کرے اس سے اللہ مگر وحی میں ڈال کر یا
پیچھے پردے کے سے (شاہ رفیع الدین)۔
- یہ کسی بشر کا مرتبہ نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر ہاں یا تو وحی سے یا
کسی آڑ سے (عبد الماجد دریا آبادی)۔
- اور کسی آدمی کے لیے ممکن نہیں کہ خدا اس سے بات کرے مگر الہام کے
ذریعے سے یا پردے کے پیچھے سے (فتح محمد)
- اور کسی آدمی کی طاقت نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارے سے
یا پردہ کے پیچھے سے (مولانا محمود الحسن)۔
- اور کسی آدمی کی حد نہیں کہ اس سے باتیں کرے اللہ مگر اشارے سے یا
پردہ کے پیچھے سے (شاہ عبد القادر)۔
- کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام فرماوے مگر یا تو الہام
سے یا حجاب کے باہر سے (مولانا اشرف علی)۔
- کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رو برو بات کرے۔ اس

کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے یا پردے کے پیچھے سے
(مودودی)

• اور کسی آدمی کو نہیں پہنچتا کہ اللہ اس سے کلام فرمائے مگر وحی کے طور پر
یا یونکہ وہ بشر پردہ عظمت کے ادھر ہو (اعلیٰ حضرت)۔

یہاں تراجم میں فرق یہ ہے کہ باقی حضرات نے ترجمہ یہ پیش کیا ہے کہ اللہ
تعالیٰ پردے کے پیچھے سے کلام کرتا ہے یا یہ کہا ہے کہ حجاب کے باہر سے لیکن
اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا ہے "یا یونکہ پردہ عظمت کے ادھر ہو" اعلیٰ حضرت کا
ترجمہ ایک اعتراض کو اٹھا رہا ہے جو علامہ رازی نے تفسیر کبیر میں ذکر کر کے پھر
اس کا جواب دیا ہے تفسیر کبیر میں جو ذکر کیا گیا ہے اس کا مضمون یہ ہے :-

قوله تعالى او من وراء حجاب واذ ما يصح ذلك لو كان مختصا
بمكان معين وجهة معينة والجواب ان ظاهر اللفظ وان اوهم
ما ذكرتم الا انه دلت الدلائل العقلية والنقلية على انه تعالى
يتمكن حصوله في المكان والجهة فوجب حمل هذا اللفظ على
التأويل والمعنى ان الرجل اذا سمع كلاما مسموعا لا يرى ذال المكلّم
كان ذلك تشبيها بما اذا تكلم من وراء حجاب التشابه بسبب الجواز المجاز

یہاں اعتراض یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد و من وراء حجاب یہ اس
وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ ایک معین مکان سے اور ایک معین جہت سے مختص
ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ مکان و جہت سے پاک ہے تو یہ کیسے صحیح ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ظاہر الفاظ سے تو اگرچہ ایسا ہی و ہم ہوتا ہے جیسا
نے ذکر کیا ہے لیکن عقلی اور نقلی دلائل اس پر دال ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے مکان و
جہت ثابت کرنا منع ہے۔ اس لیے اس لفظ کی تاویل ضروری ہے۔ اب بعد از
تاویل معنی یہ ہو گا کہ جب کوئی شخص کلام کو سنے اور متکلم کو نہ دیکھتا ہو تو اس کو
مشابہت حاصل ہے۔ اس سے جو پردے کے پیچھے سے کلام کرے اور مشابہت

مجاز کے جواز کا سبب ہے۔

علامہ رازی کی اس تقریر سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ پردے کے پیچھے سے کلام نہیں فرماتا اور نہ اس کی شان کے لائق ہے کہ وہ پردے کے پیچھے ہو۔ البتہ انسان جو اس کو نہ دیکھ سکے تو وہ سمجھتا ہے کہ گویا وہ پردے کے پیچھے ہے۔ اب اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں کہ وہ بشر پردہ عظمت کے ادھر بولیں انسان خود اللہ تعالیٰ کے پردہ عظمت کے ایک طرف ہے۔ یہ نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ انسان سے پردے میں کلام فرماتا ہے جب اس کا پردے میں ہونا جائز نہیں تو یہ ترجمہ کرنا کہ وہ پردے سے پیچھے کلام کرتا ہے، یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ (پہلے)

• کہہ اگر ہوتی واسطے رحمن کے اولاد، پس میں پہلا عبادت کرنے والا ہوں۔

(شاہ رفیع الدین)

• ان سے کہو اگر واقعی رحمان کی کوئی اولاد ہوتی تو سب سے پہلے عبادت کرنے والا میں ہوتا (مودودی)۔

• کہہ دو اگر خدا کے اولاد ہوتیں سب سے پہلے اس کی عبادت کرنے والا ہوں (فتح محمد)

• تو کہہ اگر ہر رحمن کے واسطے اولاد تو میں سب سے پہلے پوچوں (محمود الحسن)

• " " " " " (شاہ عبد القادر)

• آپ کہیے کہ اگر خدائے رحمن کی اولاد ہو تو سب سے اول اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں۔ (مولانا اشرف علی)۔

• آپ کہہ دیجیے اگر خدائے رحمن کی اولاد ہو تو سب سے اول عبادت کرنے والا تو میں ہوں (عبد الماجد دریا آبادی)۔

• تم فرماؤ بغرض مجال رحمن کے کوئی بچہ ہوتا تو سب سے پہلے میں پوچتا (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں بغرض مجال کے الفاظ ہیں جب کہ دیگر تراجم میں نہیں۔ صحیح بھی یہی ہے کہ بغرض مجال کی قید ہونی چاہیے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے کہ: مَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمَنِ أَنْ يَتَخَذَ لَدُنْهُ سَجْدَةً أَنْ يَكُونَ لَدُنْهُ اللّٰهُ تَعَالٰی اَوْلَادٌ سِوَاكَ ہ۔ جب اس کی اولاد کا ہونا ممکن ہی نہیں تو پھر یہی صحیح ہے کہ یہ کلام بغرض مجال پر مبنی ہے۔

خیال ہے کہ عربی کے قواعد و ضوابط سے باخبر آدمی جو تفسیر سے بھی باتبر ہے اسے اسے اردو ترجمہ کے سہارا کی بھی ضرورت نہیں اور جو اردو تراجم کا محتاج ہے اس سے اس قسم کے مقامات پر جب صحیح راستہ کی نشاندہی نہ کی جائے تو اس کا راہ راست سے بھٹک جانا عین ممکن ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید میں تفسیر مدارک کی عبارت دیکھیں جو اس طرح ہے:

وهذا كلام وارد على سبيل الغرض والسمراء نفى الولد وذلك انه علق العبادة

بكيون الولد وهو محال في نفسها فكان المعلق بها

محال مثلها۔ یعنی یہ کلام بغرض مجال کے طریقہ پر وارد ہے اور مراد

نفی ولد ہے کیونکہ عبادت کو اولاد کے ہونے پر معلق کیا ہے۔ اور اولاد کا ہونا فی

ذاتہا محال ہے جو اس کے ساتھ معلق ہے وہ بھی اسی طرح محال ہو گا جلالین

میں ہے: قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَلَدٌ فَأَنَا أَوَّلُ الْعَابِدِينَ

للولد لكن ثبت ان لا ولد له تعالى فانتفت عبادة یعنی آپ فرمادیں کہ اگر باغرض

رحمن کا کوئی بچہ ہوتا تو سب سے پہلے میں اس بچے کو پوچتا۔ لیکن یہ تو یقیناً ثابت

ہے کہ اس کی اولاد نہیں تو اس کی اولاد کی عبادت بھی خود بخود منتفی ہے۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کا حسن و کمال ظاہر ہے۔ اٹھتے بیٹھتے توحید، توحید کے

نعرے لگاتے والے شانِ انوکھیت کو بھی اس طرح نہ سمجھ سکے جس طرح ایک

محبت مصطفیٰ نے سمجھا۔ حب مصطفیٰ ہی تو باعثِ علم و فضل و کمال اور بشرط

توحید ہے۔

إِنَّا كُنَّا مُنْذِرِينَ فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ ﴿٣٤﴾

• ہم ہیں کہ سنانے والے اس میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا (محمود الحسن)
• " " " " " " (شاہ عبدالقادر)
• بے شک ہم ہیں ڈر سنانے والے اس میں بانٹ دیا جاتا ہے ہر حکمت والا

کام (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر تراجم میں فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے مُنْذِرِينَ کا ترجمہ ڈر سنانے والے کیا ہے جبکہ دیگر حضرات نے "کہہ سنانے والے" کیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ لخت اور تفاسیر کے مطابق۔ دوسرے تراجم لخت اور تفاسیر سے دور ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اعلیٰ حضرت نے کل اُمُرِ حَکِیم کا ترجمہ کیا ہے "ہر حکمت والا کام" جب کہ دیگر مترجمین نے ترجمہ کیا ہے "ہر کام جانچا ہوا"۔ یہ معنی بھی لغوی نہیں اور نہ ہی تفاسیر اس کی تائید کرتی ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تفاسیر میں مدارک کی عبارت پیش کی جا رہی ہے :-
كَانَ خَيْرَ مَنْزِلٍ لَّنَا لَنَافِعَ لَنَا مِنَ شَأْنِ الْأَنْذَارِ وَالتَّحْذِيرِ مِنَ الْعِقَابِ
وَكَانَ الْأَمْرُ لَنَا بِإِيَّاهِ فِي هَذِهِ السَّلِيلَةِ خُصُوصًا لَّنَافِعَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ الْحَكِيمِيَّةِ وَهَذِهِ السَّلِيلَةِ مَفْرُوقٌ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ وَمَعْنَى يُفْرَقُ
يُفَضَّلُ وَيَكْتَبُ كُلُّ أَمْرٍ مِنْ أَرْزَاقِ الْعِبَادِ وَاجَالِهِمْ وَجَمِيعِ أَمْرِهِمْ
مِنْ هَذِهِ السَّلِيلَةِ إِلَى السَّلِيلَةِ الْقَدْرِ النَّفِيسَةِ فِي السَّنَةِ
الْمُسْتَقْبَلَةِ حَكِيمٌ ذِي حِكْمَةٍ أَيْ مَفْصُولٌ عَلَى مَا يُقْتَضِيهِ
السَّلِيلَةُ وَهُوَ مِنَ الْأَسْنَادِ الْمَجَازِيِّ لِأَنَّ الْحَكِيمَ صِفَةً صَاحِبِ
الْأَمْرِ عَلَى الْحَقِيقَةِ وَوَصْفِ الْأَمْرِ بِمَجَازٍ

یعنی اللہ تعالیٰ کی اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے فرمایا: قرآن ہم نے اتارا اور ہماری ہی شان ہے کہ ہم عذاب سے ڈرائیں۔ اور قرآن پاک

اس رات (سلیتہ) القدر یا سلیتہ البرات (کو ہی ہم نے اس لیے اتارا کہ قرآن پاک کا اتارنا حکمت والے کاموں میں سے ایک کام ہے اور تمام حکمت والے کام اس رات کو بنائے جاتے ہیں کیونکہ یُفْرَقُ کا معنی بانٹ جانا، علیحدہ کیا جانا۔ بندوں کے تمام اُمور رزق، اجل، آئندہ سال اس رات کے آنے تک لکھے جاتے ہیں حکیم کا معنی حکمت والا۔ یہاں اُمُر کو حکمت والا مجازاً کہا گیا ہے کیونکہ حقیقت میں حکیم صاحبِ امر اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے: کل امر حکیم فالْحَكِيمُ مَعْنَاهُ ذُو الْحِكْمَةِ وَذَلِكَ لِأَنَّ تَخْصِيصَ اللَّهِ تَعَالَى كُلَّ أَحَدٍ بِحَالِهِ مَعِينَةً مِنَ الْعَمَلِ وَالرِّزْقِ وَالْفِعْلِ وَالسَّعَادَةِ وَالشَّقَاوَةِ يَدُلُّ عَلَى حِكْمَةٍ بِالْغَةِ لِلَّهِ تَعَالَى فَلَمَّا كَانَتْ تِلْكَ الْأَفْعَالُ وَالْأَقْصِيَّةُ دَالَّةً عَلَى حِكْمَةِ فَاعِلِهَا وَصِفَتِ بِلَوْزِيَا حَكْمِيَّةٍ وَهَذَا مِنَ الْأَسْنَادِ الْمَجَازِيِّ لِأَنَّ الْحَكِيمَ صِفَةً صَاحِبِ الْأَمْرِ عَلَى الْحَقِيقَةِ وَوَصْفِ الْأَمْرِ بِمَجَازٍ -

یعنی کل اُمُرِ حَکِیم میں حکیم کا معنی حکمت والا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے ایک حال کو معین کیا۔ ہر ایک کی عمر، رزق، اجل، نیک بختی، بد بختی، کو خاص کرنا یہ اللہ تعالیٰ کی کامل حکمت پر دال ہے جب کہ یہ افعال اور فیصلے فاعل کی حکمت پر دال ہیں تو ان کو بھی حکمت والے کہا جائیگا۔ البتہ یہ اسناد مجازی ہے کیونکہ حکیم صاحبِ امر کی صفت ہے اور اُمور کو حکمت سے منصف کرنا مجاز ہے۔

تفاسیر کے بیان سے یہ واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ مترجم کی علمی بصیرت کو روز روشن کی طرح ظاہر کر رہا ہے۔

وَأَسْتَغْفِرُ لَذُنُوبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ﴿٣٥﴾

• اور بخشش مانگ واسطے گناہ اپنے کے اور واسطے ایمان والوں کے اور

ایمان والیوں کے (شاہ رفیع الدین)۔

- اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی (فتح محمد)
- اور معافی مانگو اپنے قصور کے لیے بھی اور مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی (مولانا مودودی)۔
- اور معافی مانگ اپنے گناہ کے واسطے اور ایمان دار مردوں اور عورتوں کے لیے (محمود الحسن)۔
- اور معافی مانگ اپنے گناہ کو اور ایمان دار مردوں کو اور عورتوں کو (شاہ عبدالقادر)۔
- اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے اور سب مسلمان مردوں اور سب مسلمان عورتوں کے لیے (مولانا اشرف علی)۔
- اور اپنی خطا کی معافی مانگتے رہیے اور سارے ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے بھی (عبدالماجد دریابادی)۔
- اور اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو (اعلیٰ حضرت)
- اس مقام پر مترجمین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف گناہوں کی نسبت کی ہے کہ آپ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ یہ سراسر غلط ہے۔ نبی گنہگار نہیں ہوتا کہ وہ گناہ کرنے کے بعد گناہوں کی معافی مانگیں لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں گناہوں کی نسبت نبی کریم کے خصوصی اہل قرابت کی طرف ہے نبی کریم کی طرف نہیں حق تو یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کی علمییت اور آپ کے ترجمہ کی برتری کا اقرار کیا جاتا اور کہا جاتا کہ اگرچہ نظریات کا اختلاف ہے لیکن مولانا احمد رضا خاں بریلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا ترجمہ مبنی بر حقیقت ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ان الفاظ سے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا۔

”اے محبوب اپنے خاصوں اور عام مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگ“ ایسا بے بنیاد ترجمہ ہے جس سے کلام الہی کے روح کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فاضل بریلوی نے الفاظ قرآنی سے بالکل ہٹ کر اس کا ترجمہ عام مردوں و عورتوں وغیرہ کر کے کتنا بڑا گناہ کیا ہے۔ اگر ایسے ہی اپنی مرضی سے جو شخص قرآنی مفہوم متعین کرنے لگے تو قرآن کی امتیازی حیثیت کس طرح برقرار رکھے گی؟

مترجمین کے اس اعتراض کا اندفاع اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی تقاسیر کے حوالے سے پیش کی جا رہی ہے کہ یہ ترجمہ اعلیٰ حضرت کی اپنی اختراع نہیں بلکہ تقاسیر سے منقول ہے۔ اگر کسی کی علمییت کا محور ہی اردو تراجم یا اردو تفسیر بیان القرآن ہو تو اس کا اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی خوبی سے بے خبر رہنا حقیقت ہے۔ اس کی علمی کمزوری کا ہم انکار نہیں کرتے۔ اب خیال یہ کیا جائے کہ ذنب کی نسبت نبی کریم کی طرف جو بظاہر نظر آتی ہے اس کی مفسرین کرام نے مختلف تاویلات پیش کی ہیں جس سے یہ واضح ہے کہ اس کا معنی اردو زبان میں گناہ کرنا غلط ہے کیونکہ عام آدمی اتنا ہی جانتا ہے کہ گناہ کی دو قسمیں ہیں، صغیرہ اور کبیرہ جبکہ انبیائے کرام صغائر اور کبائر سے پاک ہیں تو پھر گناہ کی نسبت کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔

مرقاۃ باب الایمان یا القدر میں بیان کیا گیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف خواہش اور معصیت کی نسبت صرف بمعنی مخالفت کے ہے اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں۔ اس پر دلیل قائم کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے: لا حصۃ الامت من اللہ انزل الصغار قبل النبوة وبعدها۔ یعنی انبیائے کرام نبوت سے پہلے اور بعد میں بھی تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محصوم ہوتے ہیں۔

تفسیر کبیر میں علامہ رازی فرماتے ہیں :-

۱۔ لو صدر الذنب عنهم لكانوا اقل درجة من عصاة الامت و ذللت غیر جائز ولا يجوز ان يكون النبي اقل حالا من عدول الامت۔

۲۔ لو صدر الذنب عن النبي فلا يكون مقبول الشهادة لقوله تعالى ان

ان جاء كرفاسق بنيا وختبينوا لكنه مقبول الشهادۃ لقوله
تعالى ويكون الرسول عليكم شهيدا -

۳۔ ان محمد اصرى الله عليه وسلم لرائى بالمعصية لوجب
عليه الاقتداء به فيها لقوله تعالى فاتبعونى فيفض الى
الجمع بين الحرمة والوجوب وهو محال واذا ثبت ذلك فى
حق محمد صلى الله عليه وسلم ثبت ايضا فى سائر الانبياء -

۴۔ قوله تعالى انهم كانوا يسارعون فى الخيرۃ ولفظ الخيرۃ للعمى
فيستأول الكل ويدخل فيه فعن ما يندفع وترى ما لا ينبغي فثبت
ان الانبياء كانوا فاعلموا ذلك ما يندفع وترى ما لا ينبغي فثبت
ينبغي مرفوعا والى ما يندفع وترى ما لا ينبغي فثبت

۵۔ انه تعالى قسم الخلق قسمين وقال اولئك حزب الشيطان الا ان
حزب الشيطان هم الخاسرون وقال فى المصنف الاخر اولئك
حزب الله الا ان حزب الله هم المفلحون ولا شك ان حزب
الشيطان - هر الذى يفعل ما يرضى الشيطان
والذى يرضى الشيطان هو الذى يصدر من عصي الله
تعالى كان من حزب الشيطان فلو صدرت المعصية
من الرسول لصدق عليه انه من حزب الشيطان ويصدق عليه
انه من الخاسرون ويصدق على زهاد الامة انهم من حزب
الله وانهم من المفلحين فحينئذ يكون ذلك الواحد من
الامة افضل بكثير عند الله من ذلك الرسول وهذا لا يقول للمسلم
۶۔ ان الرسول افضل من الامة ^{المسلمة} فوجب ان لا يصدر الذنب
عن الرسول لانه تعالى وصف الملائكة بترك الذنب فقال
لا يعصون الله ما امرهم ويعملون ما يأمرون فلو صدرت

المعصية عن الرسول لا مستمم كونه افضل من الملائكة لقوله تعالى
ام نجعل الدين امرا وعملوا الصالحات كما الحمد سدين فى الارض ام نجعل الدين
كما انفجار - (التمت من الكبير - الجزء الاول فى ذكر آدم)

تفسير كبير من علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے عصمت انبیاء پر بہت سے دلائل
قائم کئے۔ ان میں سے چند بطور خاص نقل کئے گئے ہیں :-

۱۔ ایک دلیل یہ ہے : اگر نبی سے گناہ سرزد ہو تو نبی اپنی امت کے گناہگاروں
سے بھی کم درجہ ہوگا کیونکہ جتنا مقرب ہو اسی طرح اس کے گناہ بھی بہ نسبت عوام
کے بڑے سمجھے جائیں گے۔ اور یہ جائز نہیں کیونکہ نبی تو اپنی امت کے برگزیدہ
آدمیوں سے بھی کم درجہ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اور یہ دلیل دی گئی ہے کہ اگر نبی سے گناہ سرزد ہو تو نبی کی شہادت قبول
نہیں ہو سکے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر قاسم تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو اس
کی تفتیش کر لیا کرو حالانکہ نبی کریم تو مقبول شہادت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد
گرامی ہے : ويكون الرسول عليكم شهيدا۔ اور نبی کریم آخرت میں تم پر گواہ
ہوں گے۔

۳۔ اور یہ دلیل دی گئی کہ اگر نبی کریم سے گناہ سرزد ہو تو ہمیں بھی اس گناہ میں
آپ کی اقتدار لازم ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فاتبعوني" یعنی نبی کریم سے
امت کو کھلوایا کہ تم میری تابعداری کرو۔ اس طرح حرمت اور وجوب جمع ہو جائیں
گے اور یہ تو محال ہے۔

۴۔ اور دلیل اس طرح ذکر کی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیائے کرام کی تعریف اس
طرح کی ہے کہ وہ خیرات میں جلدی کرتے ہیں۔ خیرات کا لفظ عام ہے۔ کل کو شامل
ہے جس کام کا کرنا اچھا ہے اس کو کرنا یا جس کام کا کرنا اچھا نہیں اس کو چھوڑنا۔
اس سے پتا چلا کہ انبیائے کرام بھلائی کے کام کرتے ہیں اور بُرے کاموں کو
چھوڑتے ہیں جب اللہ تعالیٰ اُن کے اس عمل کی تعریف فرماتا ہے تو ان سے گناہ کا

سرزد ہونا منع ہے۔

۵۔ اسی طرح اور دلیل پیش کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو دو قسموں پر منقسم فرمایا۔ ایک گروہ کو شیطان کی جماعت کہا ہے کہ شیطان کی جماعت خناسے ہیں اور دوسری جماعت کو اللہ کی جماعت کہا ہے کہ اللہ کی جماعت ہی کامیاب ہے شیطان کی جماعت تو یقیناً وہ ہوگی جو وہ کام کرے گی جس کو شیطان پسند کرتا ہو اور شیطان تو گناہوں کو پسند کرتا ہے جو شخص گناہ کرے گا، اللہ کی نافرمانی کرے گا وہی شیطان گروہ میں داخل ہوگا۔ اگر انبیائے کرام سے بھی گناہ سرزد ہو تو محاذ اللہ ان پر شیطان گروہ میں داخل ہونا سچا آئے گا اور ان کا خصلے میں ہونا لازم آئے گا اور یقیناً اُمت کے نیک لوگ اللہ کے گروہ میں ہونگے۔ تو اُمت کی ناسی سے اللہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ ہونا لازم آئے گا۔ اس کا کوئی مسلمان قائل نہیں ہو سکتا۔

اب اس بیان کے بعد واضح ہوا کہ انبیائے کرام تمام صفات و کمالات گناہوں سے پاک ہیں۔ لہذا ایسا ترجمہ ”کہ معافی مانگ لینے گناہ کے واسطے“ کتنا ہی حقیقت سے دور ہے۔ انبیائے کرام کی شان کا لفظ نہیں کیا گیا۔ اردو ترجمہ بھی وہی صحیح ہو سکتا ہے جس سے مفسرین کرام کی پیش کردہ تاویلات واضح سمجھ آئیں۔ اپنے غلط تراجم کو صحیح کرنے کی کوشش میں گمراہ کن الزامات اور حد سے تجاوز اور یہ کہنا کہ اعلیٰ حضرت نے غلط ترجمہ کیا ہے اور اس ترجمہ میں گناہ کیا ہے۔ یہ بہت بڑا الزام ہے۔ اپنی بے علمی کا واضح اعلان کر دیا۔ گویا دوسرے لفظوں میں یوں کہا گیا ہے کہ ہمیں صرف مخالفت کے پیش نظر اعتراض کرنا آتا ہے اور الزام تراشی ہمارا وظیفہ ہے۔ تفاسیر کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا، کتب کی ورق گردانی، عرق ریزی یہ کام ہم سے مشکل ہے۔ کیونکہ ہم سمجھنے کی اہلیت سے عاری ہیں۔

آئیے! اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو تفسیر کبیر کے آئینہ میں دیکھیں۔ علامہ رازی اس آیت کریمہ کی توجہات میں بیان فرماتے ہیں :- *وقال بعض الناس*
لذین ای الذین یسوا منک باهل بیتک ولہ مؤمنین ولہ مؤمنات

ای الذین یسوا منک باهل بیتک۔ یعنی اس میں ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ لذینک سے مراد اہل بیت کے گناہ ہیں اگرچہ اس سے مراد بھی خلاف اولیٰ کا ارتکاب) آپ اپنے اہل بیت اور مؤمن مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی مغفرت طلب کریں۔

اب علامہ رازی کے اس بیان کے بعد کسی کو ہوش نہ آئے اور عناد کی کدورت کو دل سے نہ نکالے اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو غلط کہے تو اس پر کیا اعتراض کیا جاسکتا ہے؟ جب کہ انبیائے کرام کو بھی لوگوں نے جادو کر اور جھوٹے کہہ دیا ہے۔ اب تفسیر کبیر کی بھی عبارت کو سامنے رکھ کر اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو دیکھیں اور اے محبوب! اپنے خاص اور عام مسلمانوں مردوں اور عورتوں کے گناہوں کی معافی مانگو۔ تو کتنا صحیح ترجمہ نظر آئے گا اور نبی کریم کی شان کے عین مطابق سمجھ آئے گا۔ اگرچہ اس کی اور توجہات بھی پیش کی گئی ہیں لیکن اردو میں انکا ترجمہ بھی یہ نہیں کہ آپ اپنے گناہوں کی معافی مانگیں۔

مفسرین کرام کی پیش کردہ توجہات کو دیکھ کر خود اندازہ کریں کہ ترجمہ کیا ہونا چاہیے :- *وجعل الاستغفار کناہ*۔ *وما یلزم من التواضع*
وہضم النفس والاعتزاز بالقدس *صلی اللہ علیہ وسلم*
 معصوم و معفو (روح المعانی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم و معفو ہونے کے باوجود معجزانہ طور پر استغفار کرتے رہتے تھے کیونکہ خود نبی کریم کا ارشاد ہے :-
ما صحبت غداة قط الا استغفرت *صلی اللہ علیہ وسلم* *ما سائمة*۔

”کوئی ایسی صبح ہرگز نہیں آئی کہ جس میں میں نے اللہ تعالیٰ سے ایک سو مرتبہ استغفار نہ کی ہو۔“

اب اس تاویل کے مطابق اردو ترجمہ یہ ہوگا کہ اے نبی کریم آپ استغفر اللہ پڑھتے رہا کیجیے (یہ آپ کے مدارج کی بلندی کا سبب ہے)۔
 دوسری توجہات یہ پیش کی گئی ہے :-

وقد ذكروا ان نسبنا في
كل لحظة عروج الى مقام اعلى مما كان
فيه فيكون ما عرج منه في نظره الشريف
ذنب بالنسبة الى ما عرج اليه فيستغفر
منه وحملا على ذلك قوله عليه السلام وانه
ليغان على قلبي - (الحديث)
انه ليغان على قلبي واني لا استغفر الله كل يوم مائة
مرة - (روح المعاني)

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدارج میں لحظہ یہ لحظہ عروج تھا اور آپ
جن مدارج سے دوسرے مدارج کی طرف ترقی فرماتے تو آپ کے دل میں ایک
خلش سی پیدا ہوتی۔ اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میرے
دل میں ایک پکس اور ٹرپ سی ہوتی ہے تو میں ہر دن ایک سو مرتبہ استغفار
کرتا ہوں۔

اب اس تاویل کے مطابق اردو ترجمہ یہ مناسب ہوگا کہ اے محبوب! آپ اپنے مدارج کی بلندی کے لیے استغفار (دعا) کرتے رہیں۔
تفسیر کے اس بیان ذی شان سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کا ذی شان ہونا
ظہر من الشمس ہوا۔ اور ایسا ترجمہ کرنا جس میں نبی کریم کو معاذ اللہ گنہگار ٹھہرایا
جائے۔ ہزار عیبوں سے بھی ایک عیب برابر ہے۔

اللهم ثبتنا على حب رسول الله
صلی اللہ علیہ وسلم۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (پ ۹)

تاکہ خدا تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے
(فتح محمد)
تو کہ بخشے واسطے تیرے خدا جو کچھ ہوا تھا پہلے گناہوں تیرے سے
اور جو کچھ پیچھے ہوا۔
(شاہ رفیع الدین)
تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے
(مولانا محمد الحسن)

تاکہ معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے
(شاہ عبدالقادر)
تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے (مولانا اشرف علی)
تاکہ اللہ تمہاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے (مورد رمی)
تاکہ اللہ آپ کی (سب) اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے (عبدالاجل دیوبند)
تاکہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں کے اور تمہارے
پچھلوں کے۔
(اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر بھی اعلیٰ حضرت نے گناہوں کی نسبت نبی کریم کی طرف
نہیں کی۔ یہ ترجمہ نہیں کیا کہ تمہارے اگلے پچھلے گناہ بخش دے۔ لیکن دوسرے
حضرات نے نبی کریم کو معاذ اللہ گنہگار ٹھہراتے ہوئے ترجمہ کیا تاکہ تمہارے
اگلے پچھلے گناہ، خطائیں، کوتاہی معاف کر دے۔ پھر اپنے غلط تراجم پر اترتے
ہوئے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ان الفاظ سے مورد طعن و تشنیع بنایا گیا "اس آیت
میں تمہارے اگلے پچھلے کالفظ مولانا بریلوی کی ذاتی اختراع ہے، سبحان اللہ
کیسا سارق اور شاطر کہ اپنے غلط تراجم کے عیوب پر پردہ ڈالنے کیلئے اعلیٰ حضرت کے
ترجمہ کو مورد الزام ٹھہرایا لیکن ایسی فریب کاریوں سے مسلمانوں کو دھوکا میں نہیں ڈالنا

جاسکتا کیونکہ سب مسلمان عصمتِ انبیاء کو جانتے ہیں کہ انبیاء کو کرام سے گناہ سرزد نہیں ہوتے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ذاتی اختراع کہنے والے اگر تفاسیر کو دیکھنے کی تکلیف کرتے تو یہ بہتان نہ باندھتے اور جو عظیم الکاتب نہ کرتے۔ اسیے اگر تفاسیر کو سمجھنے کی اہلیت نہیں تو میں اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید پر تفاسیر کی عبارات پیش کر کے مطلب سمجھا دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ضد اور عناد کی کدورت کو دل سے نکالے اور ربِ قدوس تمہیں سمجھنے کی توفیق دے۔

جلالین میں ہے وهو مؤول لعصمة الانبياء عليهم الصلوة والسلام
کہ یہ آیت کریمہ اپنے ظاہر پر نہیں کہ نبی کریم کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دیئے گئے
بلکہ اس آیت کریمہ کی ضروری طور پر تاویل کی جائے گی۔ اس لئے کہ انبیاء کرام معصوم
ہیں ان سے گناہ نہیں ہوتے جب وہ گناہ نہیں کرتے تو اگلے پچھلے گناہوں کے
معاف کرنے کا کوئی مقصد نہیں جبکہ جلالین کے مطابق آیت کریمہ کی تاویل ضروری ہے
تو وہ تاویل کیا ہوگی وهو مؤول ای اسعاد الذنب لا صلی علیہ وسلم مؤول
امکان الموات ذنوب امتك (صاوی) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ذنوب نسبت
مؤول ہے اس کی تاویل ضروری ہے یہ تاویل کی ہے لیکن ان میں سے ایک ہے کہ ذنوب
سے مراد نبی کریم کے لئے ذنوب؛ ذنوب نہیں بلکہ امت کے ذنوب ہیں۔ اب اعلیٰ حضرت
کے ترجمہ پر غور فرمائیں کہ اللہ تمہارے سبب سے گناہ بخشے تمہارے اگلوں اور
پچھلوں کے۔ صاوی کی اس تاویل کے کتنا ہی مطابق ہے یعنی آپ کی امت کے بعد
میں آنیوالے لوگ اور تمہارے زمانے کے لوگ جو نسبت بعد میں آنیوالوں کے اگلے
ہیں تمہاری وجہ سے اللہ تعالیٰ ان تمام کے گناہ بخشے اسی طرح تفسیر کبیر میں ہے
لم یکن للنبي ذنب فمأذليخضله قلنا الجواب من وجوه
احدها المراد ذنوب المؤمنين یعنی تفسیر کبیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ نبی کریم کے
گناہ جب نہیں ہیں تو گناہوں کے معاف کرینیکا کیا مطلب اور یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا
کہ تاکہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کر دے۔ تو فرماتے ہیں اس کا جواب

کئی وجہ سے دیا گیا ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ گناہوں سے مراد مومنوں کے گناہ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب سے تمہارے انگلوں اور پچھلوں کے گناہ معاف فرما دے۔ کمالین میں اسی طرح پیش کیا گیا ہے وعن بعض ما تقدم هو ذنب ابويك آدم وحواء ما خروا من ذنوب امتك یعنی بعض حضرات نے یہ کیا ہے کہ ما تقدم سے مراد ذنب آدم وحواء ہے اور ما خروا سے مراد آپ کی امت کے ذنوب ہیں اگرچہ یہاں بھی یہ ترجمہ کرنا صحیح ہوگا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے سبب سے آپ کے انگلوں اور پچھلوں کے ذنوب معاف فرمائے لیکن خیال رہے کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس تاویل کے مطابق جو تفسیر کبیر اور صادی سے پیش کی جا چکی ہے کمالین کی اس تاویل کے مطابق نہیں کیونکہ جمیع انبیاء کرام معصوم ہیں اس لئے اس تاویل کے مطابق بھی اردو زبان میں آپ کے انگلوں اور پچھلوں کے گناہ معاف فرما دے درست نہیں۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کی یہ بھول تھی گناہ نہیں تھا البتہ اس تاویل کو اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر جو اعتراض اس طرح کیا ہے کہ اگلے اور پچھلے مولانا بریلوی کی ذاتی اختراع ہے ان کو سمجھایا جاسکے کہ یہ اختراع نہیں بلکہ تفسیر کا بیان ہے سمجھنے کے لئے علمیت ضروری ہے مذکورہ بالا تفسیر کے بیان کی روشنی میں صاحب ایمان کو یہ سمجھنے میں کوئی استحالہ درپیش نہیں کہ انبیاء کرام معصوم ہیں لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ نبی کریم کے اگلے اور پچھلے گناہ معاف کرنے کا ذکر ہے بلکہ آپ کی امت کے اگلے اور پچھلے لوگوں کے گناہ معاف کرنے کا ذکر ہے۔ مدارج النبوی میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تصریح فرمائی ہے کہ انبیاء کرام معصوم ہیں صفائے کبار گناہوں سے پاک ہیں آپ فرماتے ہیں لیخفرك الله ما تقدم من ذنبك وما تاخر اقرار درینجا بسا راست یعنی گفتہ اند مراد چیز نیست کہ واقع شد در بابت پیش از نبوت و امام سبکی گفتہ این مردود است زیرا کہ نبوہ و پیغمبر خدا را صلی اللہ علیہ وسلم جاہلیت و وی صلی اللہ علیہ وسلم معصوم است پیش از نبوت و بعد از وی زعمشہی در کف اف گفتہ و بیضاوی نیز درینجا تبہیت وی کردہ کہ مراد جمیع انچہ گذشتہ از فرطات کہ توانہ کہ

وَالنَّجْمُ إِذَا هَوَىٰ

تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے
 قسم تارے کی جب گرے
 قسم تارے کی جب گرے
 قسم تارے کی جب گرے
 قسم تارے کی جب گرے
 قسم تارے کی جب وہ غروب ہونے لگا۔
 قسم تارے کی جب وہ غروب ہوا۔
 قسم تارے کی جب وہ ڈوبنے لگے۔
 اس پیارے چمکتے تارے محمد کی قسم جب معراج سے اترے (علی حضرت)
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے پتہ چلتا ہے کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی
 اللہ علیہ وسلم ہیں اور ہوی سے مراد آپ کے معراج سے واپس نزول فرمانا
 اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی تائید روح المعانی سے ملتی ہے وقال جعفر الصادق
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ هو النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو نزولہ من السماء لیلۃ المعراج وجوز
 علی هذا ان یروی بھویہ صمدیہ و عروجه علی الصلوة والسلام الی منقطع الایمن
 حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ
 علیہ وسلم ہیں اور ہوی سے مراد آپ کا شب معراج آسمانوں سے نزول فرمانا
 ہے اور فرماتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ ہوی سے مراد آپ کا آسمانوں پر
 وہاں تک عروج فرمانا جہاں مکان کی حدود ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح تفسیر
 سراج المنیر میں ہے وقال جعفر الصادق یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اذ نزل
 من السماء لیلۃ المعراج والخری النزول خری یجری حریبا
 حضرت امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ النجم سے مراد محمد مصطفیٰ
 صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جبکہ آپ نے آسمانوں سے شب معراج کو نزول فرمایا
 اٹھوئی کا معنی اترنا ہے اس سے ہوی بھوی ہو یا ہے البحر المحيط میں
 ہے وقال ابن جریر الصادق هو النبی صلی اللہ علیہ وسلم وہ یہ نزولہ لیلۃ المعراج

(فتح محمد)

(شاہ رفیع الدربز)

(محمد الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

(مولانا اشرف علی)

(مردودی)

(عبدالماجد دریا آبادی)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

(علی حضرت)

حضرت ابن جریر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ النجم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 ہیں اور ہوی سے مراد آپ کا شب معراج کو اترنا ہے۔ الجامع لاحکام البیان للقرطبی
 میں اسی طرح ہے والنجم یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اذا ہوی اذا نزل من
 السماء لیلۃ المعراج النجم سے مراد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں
 جب آپ نے شب معراج کو آسمانوں سے نزول فرمایا۔

ان مذکورہ بالا تفاسیر کی عبارات سے یہ واضح ہوا کہ النجم سے مراد
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ کو تارے سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ لیکن فہم
 کہ تفاسیر کو دیکھنے کی تکلیف کے بغیر ہی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو طعن و تشنیع
 کا نشانہ ان الفاظ میں بنایا گیا ہے۔ والنجم اذا ہوی اس آیت میں نجم
 کا معنی اے پیارے چمکتے تارے سر اسر غلط اور من گھڑت ہے۔ معترض کے
 اعتراض سے اس کا یہ مطلب ہوا کہ جتنی تفاسیر کا ادب ذکر کیا ہے وہ سب غلط
 اور من گھڑت ہیں۔ خدا سمجھنے کی توفیق دے۔ حالانکہ اس سورۃ طیبہ میں نبی کریم
 کے معراج کو ہی بیان کیا گیا ہے آپ کا قریب ہونا اور دیدار باری تعالیٰ
 سے مشرف ہونا۔ گویا کہ انیوالا بیان بھی اس پر دلیل ہے کہ النجم سے مراد
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ ہی پیارے چمکتے تارے ہیں۔ معترض
 صاحب کی علمیت کا اندازہ تو یہاں سے ہی ہو جاتا ہے کہ اعتراض کرتے
 ہوئے نجم بغیر الف لام کے ذکر کیا ہے حالانکہ الف لام اس پر لازم ہے
 بغیر الف لام کے نجم جس تارے کے معنی میں نہیں آتا بلکہ تھوڑا اٹھ کر عام تارے کے معنی
 دیتا ہے اس کے بعد انیوالی آیات کا ترجمہ اعلیٰ حضرت نے اس طرح فرمایا
 جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معراج کی رات نبی کریم کو رب قدوس کا
 بہت زیادہ قرب حاصل ہوا جو بلا کیف صورت تھی۔ اسی طرح رب تعالیٰ کو
 بلا کیف آپ نے دیکھا، مشاہدہ فرمایا۔ پہلے تو آپ چند آیات کے تراجم کا فرق
 دیکھیں پھر ان پر تفاسیر کی رائے۔

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى

اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے زور آورنے پھر سیدھا بیٹھا۔
(مولانا محمد الحسن)
ان کو نہایت قوت والے نے سکھایا یعنی جبرائیل طاقتور نے پھر وہ پورے
نظر آتے۔ (فتح محمد)

اس کو سکھایا سخت قوتوں والے نے زور آورنے پھر سیدھا بیٹھا۔

(شاہ عبدالقادر)

ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے پیدائشی طاقت ور
ہے وہ فرشتہ اصلی صورت میں نمودار ہوا۔ (مولانا اشرف علی)

انہیں بڑی قوت والا (فرشتہ) سکھاتا ہے پیدائشی طاقتور پھر وہ اصلی
صورت پر ظاہر ہوا۔ (عبدالماجد دریا آبادی)

انہیں سکھایا سخت قوتوں والے طاقتور نے پھر اس جلوہ نے قصد فرمایا
(اعلیٰ حضرت)

ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى

(پ ۶)

پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا۔
پھر نزدیک ہوا اور لٹک آیا۔
پھر وہ فرشتہ نزدیک آیا۔
پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا۔
پھر وہ نزدیک ہوا اور زیادہ نزدیک ہوا۔
پھر قریب ہوا اور آگے بڑھے۔
پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا اور خوب اتر آیا۔
(مولانا محمد الحسن)
(شاہ عبدالقادر)
(مولانا اشرف علی)
(مودودی)
(عبدالماجد دریا آبادی)
(فتح محمد)
(اعلیٰ حضرت)

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ

(پ ۶)

پھر وہ گیا فرق دو کمان کی برابر یا اس سے بھی نزدیک۔ (محمد الحسن)
تو دو کمان کے فاصلے پر یا اس سے بھی کم۔ (فتح محمد)
پھر وہ گیا فرق دو کمان کا میان یا اس سے بھی نزدیک۔ (شاہ عبدالقادر)
پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم۔ (اشرف علی)
یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا (مودودی)
سو دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم۔ (عبدالماجد دریا آبادی)
تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے بھی کم
(اعلیٰ حضرت)

وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ

(پ ۶)

اور اس نے اس کو دیکھا اترتے ہوئے ایک بار اور بھی۔ (مولانا محمد الحسن)
انہوں نے اسی کو ایک اور بار بھی دیکھا۔ (فتح محمد)
اور اسی کو اس نے دیکھا ہے ایک دوسرے تارے میں (شاہ عبدالقادر)
اور انہوں نے اس فرشتہ کو ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے (مولانا اشرف علی)
اور ایک دفعہ پھر اس نے سدرۃ المنتہی کے پاس اس کو اترنے دیکھا (مودودی)
اور انہوں نے اس (فرشتہ) کو ایک بار اور بھی دیکھا ہے۔ (عبدالماجد دریا آبادی)
انہوں نے تو وہ جلوہ دوبار دیکھا۔ (اعلیٰ حضرت)

ان مذکورہ بالا آیات مبارکہ کے ترجمہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ
اعلیٰ حضرت نے واقعہ معراج مراد لیا ہے اور رب تعالیٰ کے قریب ہونا
اور اللہ تعالیٰ کا دیدار کرنا مراد لیا ہے جبکہ دیگر مترجمین نے جبرائیل کی ملاقات

مراد لی ہے۔ اگرچہ تفسیر میں اس کا ذکر بھی ہے لیکن راجح قول وہی ہے جو اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ظاہر ہے۔ دوسرا قول مرجوح ہے۔ تفسیر طبری میں ہے ثمود نافذ لی وقال اخرون بل معنى ذلك ثمودنا الرب من محمد صلى الله عليه وسلم فتدلى حدثنا يحيى بن سعيد الاموي قال حدثنا محمد بن عمرو عن ابني سلمة عن ابن عباس ثمودنا فتدلى قال دني رب فتدلى حدثنا الربيع قال حدثنا ابن وهب عن سليمان بن بديل عن شريك بن ابني نمر قال سمعت انس بن مالك يحدثنا عن ليلة المسرى برسول الله صلى الله عليه وسلم انه عرج جبرائيل برسول الله صلى الله عليه وسلم الى السماء السابقة ثم علابه بما لا يعلم الى الله حتى جاء سدرة المنتهى ودنا الجبار رب العزة فتدلى حتى كان منقاب قوسين او اذني فاوحى الله اليه فيما وحي خمسين صلوة على امته كل يوم وليلة وذكر الحديث تفسیر طبری نے اس طرح بیان کیا کہ ثمود نافذ لی سے مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ نبی کریم کے قریب ہوا اور زیادہ قریب ہوا (چونکہ رب تعالیٰ کا قرب بلا کیف تھا اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا پھر وہ خوب اتر آیا) حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم کے معراج کی رات کا ذکر فرمایا کہ جبرائیل امین نبی کریم کو ساتویں آسمان تک اوپر لے گئے پھر آپ کو اور اتنی بلندی حاصل ہوئی جس کو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کو سدرة المنتهى پر رب قدوس کے جلوے کا قرب حاصل ہوا وہ اتنا زیادہ قرب حاصل ہوا کہ محبوب اور اس کے جلوے میں دو ہاتھ کا

فاصلہ رکھ گیا یا اس سے بھی کم تو اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کے لئے ہر رات اور دن میں سچا سنا زول کا حکم فرمایا آپ کو وحی فرمائی تفسیر طبری میں ہے قال البغوی روينا في قصة المعراج عن شريك بن عبد الله بن انس ودني الجبار رب العزة فتدلى حتى كان منقاب قوسين او اذني قال حدثنا محمد بن عمرو عن ابني سلمة عن ابن عباس ثمودنا فتدلى قال دني رب فتدلى حدثنا الربيع قال حدثنا ابن وهب عن سليمان بن بديل عن شريك بن ابني نمر قال سمعت انس بن مالك يحدثنا عن ليلة المسرى برسول الله صلى الله عليه وسلم انه عرج جبرائيل برسول الله صلى الله عليه وسلم الى السماء السابقة ثم علابه بما لا يعلم الى الله حتى جاء سدرة المنتهى ودنا الجبار رب العزة فتدلى حتى كان منقاب قوسين او اذني فاوحى الله اليه فيما وحي خمسين صلوة على امته كل يوم وليلة وذكر الحديث تفسیر طبری نے اس طرح بیان کیا کہ ثمود نافذ لی سے مراد یہ ہے کہ رب تعالیٰ نبی کریم کے قریب ہوا اور زیادہ قریب ہوا (چونکہ رب تعالیٰ کا قرب بلا کیف تھا اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا پھر وہ خوب اتر آیا) حضرت ابن عباس سے بھی اسی طرح مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رب تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا۔ اسی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم کے معراج کی رات کا ذکر فرمایا کہ جبرائیل امین نبی کریم کو ساتویں آسمان تک اوپر لے گئے پھر آپ کو اور اتنی بلندی حاصل ہوئی جس کو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔ یہاں تک کہ آپ کو سدرة المنتهى پر رب قدوس کے جلوے کا قرب حاصل ہوا وہ اتنا زیادہ قرب حاصل ہوا کہ محبوب اور اس کے جلوے میں دو ہاتھ کا

ربہ قال عکرمۃ قلت ایس اللہ یقول لا تدرك الا بصار
وهو میدرك الا بصار قال ويحك ذاك اذا تجلّی بنوره
الذی هو بنوره وقد رأى ربہ مرتین ترجمہ
حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے
رب کا دیدار کیا۔ عکرمہ (آپ کے شاگرد) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کیا
اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں لا تدرك الا بصار وهو میدرك
الا بصار کہ آنکھیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں آپ نے فرمایا افسوس
تم سمجھے نہیں یہ اس وقت ہے جبکہ وہ اس نور کے ساتھ تجلی فرماتے جو اس
کا نور ہے حضور نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا حضرت شیخ عبدالحق رحمہ
اللہ علیہ کہتے ہیں۔

ابن عمر دریں مسئلہ مراجعت ہوئے کردہ پر سید کہ صل رائی
محمد رب پس گفت راه پس ابن عمر تسلیم نموده و قطعاً براه
تردد انکار نرفتہ۔ (اشعۃ اللمعات چہارم ص ۱۳)

ترجمہ حضرت ابن عمر نے حضرت ابن عباس سے اس مسئلہ کے
بارے میں رجوع کیا اور پوچھا کیا حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا تو آپ نے دیکھا حضرت
ابن عمر نے ان کے اس قول کو تسلیم کیا اور تردد و انکار کا راستہ اختیار
نہیں کیا۔ علامہ بدر الدین عینی شرح بخاری میں مندرجہ ذیل روایات
نقل کرتے ہیں روی ابن خزیمۃ باسناد قوی عن
النس قال سمی محمد ربہ وبہ قال سائر اصحاب
ابن عباس و کعب الاخبار و الزہری و صاحبہ
معمّر۔ ترجمہ ابن خزیمہ نے قوی سند سے حضرت انس رضی
اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے کہا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے اپنے رب کو دیکھا اسی طرح ابن عباس کے شاگرد کعب اخبار زہری

اور عمر کہا کرتے تھے۔ راخرج النسائی باسناد صحیح و صحیحہ الحاکم ایضاً من طریق
عکرمۃ عن ابن عباس ان تجبون ان تكون الخلة لابن اہیم و الکلام لموسی
والرویۃ لمحمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ یہ روایت نسائی نے سند
صحیح کے ساتھ اور حاکم نے بھی صحیح کے ساتھ عکرمہ کے واسطے سے حضرت ابن عباس
سے نقل کی ہے۔ آپ کہا کرتے کہ کیا تم لوگ اس پر تجویب کرتے ہو کہ خلّت کا
مقام ابراہیم علیہ السلام کے لئے اور کلام کا شرف موسیٰ علیہ السلام کے لئے اور
دیدار کی سعادت محمد رسول اللہ کیلئے ہو۔ امام مسلم حضرت ابو ذر سے روایت کرتے
ہیں۔ قال سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم هل رأیت ربک قال لا
اراه اس لفظ کو دو طرح سے پڑھا گیا ہے نورانی ارہ اور دوسرا نورانی ارہ
پہلی صورت میں اس کا معنی یہ ہوگا۔ ابو ذر کہتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم سے پوچھا کیا حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا ہے آپ نے فرمایا وہ نور
ہے میں اسے کیونکر دیکھ سکتا ہوں۔ دوسری صورت میں معنی یہ ہوگا۔ کہ وہ سراپا نور
ہے میں نے اسے دیکھا۔ مسلم کے اسی صفحہ پر ایک روایت ہے۔ عن
عبد اللہ بن شقیق قال قلت لابی ذر لو رأیت رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم فسألتہ فقال عن ای شیئ کنت تسألہ قال کنت
اسألہ هل رأیت ربک قال ابو ذر قد سألتہ فقال رأیت نوراً
کہ میں نے نور دیکھا ہے یہ روایت بھی دوسری توجہ کی تائید کرتی ہے۔
حکى عبدالرزاق عن معمر عن الحسن انه حلف ان محمد
رأى ربہ (عمدة القاسمی ص ۱۹ جلد ۱۹)
حسن بصری اس بات پر قسم کھاتے تھے کہ حضور نے اپنے رب کا دیدار کیا
واخرج ابن خزیمہ عن عروہ بن زبیر ان ابنا عروہ بن زبیر
سے ابن خزیمہ نے نقل کیا ہے کہ وہ بھی روایت کے قائل تھے۔ علامہ
ابن حجر نے امام احمد کے بارے میں لکھا۔ فروی الخلال فی کتاب السنۃ

عن المروزی قلت لا حمدانہم یقولون ان عائشہ قالت
من ثم عم ان محمداً رای ربہ وقد اعظم علی اللہ الفرائیة فبای
شیء یرفع قولہا قال بقول النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
رائت ربی - قول النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اکبر من
قولہا - (فتح الباری ص ۴۹۴ جلد ۸) ترجمہ

مروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد سے کہا کہ لوگ کہتے ہیں ام المؤمنین یہ کہا
کرتیں کہ جس نے یہ کہا کہ حضور نے اپنے رب کو دیکھا ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ
پر بڑا بہتان باندھا ہے تو حضرت عائشہؓ نے لکھا جواب دیا جائے گا آپ نے
فرمایا حضور کے اس ارشاد کے ساتھ رایت ربی کہ میں نے اپنے رب کو دیکھا
حضرت عائشہ کے قول کا جواب دیں گے۔ اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا
ارشاد حضرت عائشہ کے قول سے بہت بڑا ہے یہ مختلف اقوال ہیں جو قائلین روایت
کی طرف سے بطور استدلال پیش کئے جاتے ہیں ان میں فحول صحابہ مثلاً ابن عباس
کوب۔ احبار۔ انس، ابی ذر کے علاوہ کبار تابعین عروہ، بن زبیر، حسن بصری، عکرمہ
جیسے اکابر تابعین بھی موجود ہیں حضرت امام احمد کا قول بھی آپ پڑھ چکے ہیں ان اقوال
کے علاوہ متعدد احادیث بھی ذکر کی گئی ہیں ان تمام دلائل کو بالتفصیل پیش
کر نیچے بعد علامہ نووی لکھتے ہیں اذا صحت الروایات عن ابن عباس

فی اثبات الرؤیہ وجب المصیر علی اثباتہا فانہا لیست مما یدرك
بالعقل ویؤخذ بالظن فانہا یتلقى بالسماع ولا یتجیز احد
ان یظن بابن عباس انہ متکلم بہذہ المسئلۃ بالظن
والاجتہاد ثم ان ابن عباس اثبت شیئاً نہ فہا غیرہ والمثبت
مقدم علی المنافی - ترجمہ حضرت ابن عباس سے جب صحیح روایات ثبوت
کو پہنچ گئیں کہ انہوں نے ایسا کہا ہے تو اب ہم یغیال نہیں کر سکتے کہ آپ نے
اتنی بڑی بات محض اپنے قیاس اور ظن کے بنا پر کہی ہو لہذا انہوں نے کسی

مرفوع حدیث کی بنا پر ایسا کہا ہوگا نیز ابن عباس ایک چیز کو ثابت کر رہے ہیں دوسرے
حضرات نفی کر رہے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ مثبت کا قول نافی پر مقدم ہوتا ہے خلاصہ
کلام کو علامہ نووی اس طرح بیان کرتے ہیں - الحاصل ان الراحم
عند اکثر العلماء ان رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
رائی ربہ بعینی واسہ لیلۃ الاسراء و ہذا مما لا ینبغی
ان یتشکک فیہ - کہ حاصل بحث یہ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک صحیح قول
یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے شب معراج اللہ تعالیٰ کو اپنے
سر کی انگلیوں سے دیکھا اور اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں علامہ نووی نے
یہ بھی کہا ہے کہ حضرت ابن مسعود اور حضرت صدیق نے اپنے موقف کی تائید میں
کوئی حدیث مرفوع پیش نہیں کی لیکن بعض نے اپنے قیاس اور اجتہاد سے کام لیا
اس پر علامہ ابن حجر نے کہا کہ صحیح مسلم جس کی شرح علامہ نووی کر رہے ہیں
اسی کے لکھے صفحہ پر حدیث مرفوعہ موجود ہے ام المؤمنین نے فرمایا کہ میں ولقد راہ
بالافق المبین اور ولقد راہ نزلة اخری کے بارے میں حضور سے پوچھا تو حضور
نے فرمایا وہ جبرائیل امین تھے جب مسلم میں یہ حدیث موجود ہے تو حیرت ہے
کہ شارح مسلم علامہ نووی نے کیسے انکار کیا

علامہ ابن حجر کے اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حضرت صدیق نے و
لقد راہ بالا فوق المبین کے بارے میں حضور سے استفسار کیا اور
حضور نے فرمایا کہ وہ جبرائیل ہیں اور یہ بلاشبہ درست ہے کیونکہ یہ آیت لوقۃ تکویر
کی ہے اور وہاں حضرت جبرائیل کا ہی ذکر ہے - ارشاد ہے وانہ لقول
رسول کریم ذی قوۃ عند ذی العرش مکین مطاع
ثم امین وما صا - بکم بمجنون ولقد راہ بالا فوق
المبین - یہ سارا ذکر جبرائیل امین کہنے ہم پہلے بتا آتے ہیں (ضیاء القرآن
میں دیکھیں کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انہیں ان کی اصلی صورت

دیکھنے کی خواہش کی تو آپ آسمان کے افق پر نمودار ہوئے۔ وہ افق جہاں جبرائیل نمودار ہوئے اسے افق مبین کہا گیا ہے لیکن یہاں جس افق کا ذکر ہو رہا وہ ہوا بلا افق لاعلیٰ ہے۔ آسمان اور زمین کے افق کو افق مبین نہ کہہ سکتے ہیں لیکن افق اعلیٰ وہ ہو گا جو تمام آفاق سے بلند تر ہو یعنی فلک الافلاک کا کنارہ۔ اس لئے امام نووی کا قول ہی درست ہے کہ شب محراج لینی رویت کے بارے میں کوئی حدیث مرفوع نہیں ہے علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کی تشریح و تفسیر سے فارغ ہونے کے بعد دیدار الہی کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کو یوں پیش کرتے ہیں وانا نقول بروایتہ صلی اللہ علیہ وسلم ربہ سبحانہ و بدوہ منہ سبحان علی الوجہ اللائق (روح المعانی) اور میں یہ کہتا ہوں کہ سرور عالم اپنے رب کریم کے دیدار سے مشرف ہوئے اور حضور کو قرب الہی نصیب ہوا لیکن اس طرح جیسے اس کی شان کبریائی کے لائق ہے حضرت امام محمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب دریافت کیا جاتا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کا دیدار کیا تو آپ جواب میں فرماتے رہ راہ حتیٰ یقطع نفسہ (روح المعانی) ہاں حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہاں حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ یہ جملہ اتنی بار دہراتے کہ آپ کا سانس ٹوٹ جاتا مولانا سید انور شاہ کشمیری صاحب اس مسئلے پر مکمل بحث کر چکے بعد قیصرانہ میں ولکنہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وسلم تشریف بروایتہ تعالیٰ ومن علیہ ربہ بہا وکرمہ و تفضل علیہ بنوالہ و افاض علیہ من افضالہ فراہ فراہ کما قال احمد رحمۃ اللہ مرتین الا انہ راہ کما یرى الحبيب الى الحبيب والعبد الى مولاه لاهو بملك ان یکف عنه نظره ولا هو یستطیع ان یشخص الی بصره وهو قوله تعالیٰ ما زاغ البصر وما طغی (فیض الباری) (شرح البخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیدار الہی سے مشرف ہوئے اللہ تعالیٰ نے اس دولت سرمدی سے آپ کو نوازا اور اپنے فضل و احسان سے عزت افزائی۔ پس حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا جس طرح امام احمد نے فرمایا ہے مگر یہ دیدار ایسا تھا جیسے حبیب اپنے حبیب کا دیدار کرتا ہے نہ کہ آنکھیں بند کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ ہی اس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ کبھی باندھ کر دے دلا کر کو دیکھتا رہے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے۔ ما نزاغ البصر وما طغی (استغنی) منہ بجا بالامضون کی وضاحت سے یہ سمجھنا مشکل نہ رہا کہ النعم سے ملو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کو تارا کہا گیا ہے لہذا پیارا چمکتا ہوا تارا کہنا صحیح ہے اسی طرح آپ کو رب کا قرب حاصل ہوا اسی وجہ سے تعدد فی فتدی کا ترجمہ پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا پھر خوب اترا آیا یہی ترجمہ صحیح ہے ایسے ہی ولقد راہ نزلة اخرى کا ترجمہ اور انہوں نے تودہ جلوہ دوم ترجمہ دیکھا یہ ترجمہ ہی تفاسیر اور حدیث کے مطابق ہے اور اسی میں نبی کریم کی شان کا لحاظ کیا گیا ہے۔

قِيَامِي الْاَمْسَ بِكَ تَتَمَارِي (پ ۳)

اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلائے گا۔ (مولانا محمود الحسن)
 اب تو کیا کیا نعمتیں اپنے رب کی جھٹلاوے گا۔ (شاہ عبدالقادر)
 سو تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں میں شک کرتا رہیگا (عبدالماجد ریا آبادی)
 سو تو اپنے رب کی کون کونسی نعمت میں شک کرتا رہیگا (مولانا اشرف علی)
 تو اسے سننے والے اپنے رب کی کون سی نعمتوں میں شک کر ہیگا (اعلیٰ حضرت)
 اس مقام پر اعلیٰ حضرت نے اسے سننے والے الفاظ کا اضافہ کیا لیکن دیگر ترجمین نے ان الفاظ کا اضافہ نہیں کیا دیگر ترجمین کے ترجمہ سے شک کر نیکی نسبت نبی کریم کی طرف نظر آتی ہے کیونکہ قرآن پاک کے براہ راست

مخاطب نبی کریم میں حالانکہ نبی کریم کی طرف نسبت غلط ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر تائید تفاسیر میں موجود ہے۔ کیونکہ ان الفاظ کی زیادتی کے بغیر ترجمہ ادب و احترام کے منافی ہے تفسیر جلالین میں ہے۔ فبای الاعداء بانعمہ الدالۃ علی وحدانیۃ وقدرة تنتمی تشک ایہا الانسان۔ اے انسان تو اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں میں شک کریگا جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت پر دل میں۔ تفسیر مدارک میں ہے فبای الاعداء ایہا المخاطب تنتمی تشک بما اولادک من النعماء سننے والے مخاطب تو اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتوں میں شک کریگا۔ روح المعانی میں ہے وقیل الانسان علی الاطلاق وهو ظہر یہاں مطلق خطاب عام انسان کو ہے اور یہی قول زیادہ مناسب ہے تفاسیر کے ان بیانات سے یہ واضح ہوا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی شان بنی الانبیاء کا پاسدار ہے جبکہ دیگر تراجم اس منصب جلیل سے خالی ہیں۔

الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَ الْبَيَانَ (۲۶)

رحمن نے سکھایا قرآن بنایا آدمی پھر سکھایا اس کو بات کرنا (مولانا محمد الحسن) رحمن نے سکھایا قرآن پیدا کیا آدمی کو سکھایا اس کو بولنا

(شاہ رفیع الدین) خدا جو نہایت مہربان اسی نے قرآن کی تعلیم فرمائی اسی نے انسان کو پیدا کیا اسی نے اس کو بولنا سکھایا (مولانا فتح محمد) رحمن نے سکھایا قرآن۔ بنایا آدمی پھر سکھائی اس کو بات (شاہ عبدالقادر) رحمن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا اس کو گویائی سکھائی۔ (مولانا اشرف علی) نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے اسی

نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بولنا سکھایا (مولانا سرور دہلوی)

خدا نے رحمن ہی نے قرآن کی تعلیم دی اسی نے انسان کو پیدا کیا اس کو گویائی سکھائی۔ (عبدالہامد دریا آبادی)

رحمن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا انسانیت کی جان محمد کو پیدا کیا۔ ما کان وما یکون کا بیان انہیں سکھایا۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہو رہا ہے کہ علم کا ایک مفعول

محذوف ہے اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی رحمن نے اپنے محبوب کو قرآن سکھایا۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ خلق الانسان میں انسان سے مراد بھی نبی کریم ہیں جو انسانیت کی جان ہیں۔ نبی کریم انسانیت کی جان ہیں اس کا اردو محاورہ میں ایک مطلب یہ ہے کہ آپ تمام انسانوں کے محبوب ہیں اس پر بحث پیش لفظ میں گزر چکی ہے کہ آپ کو محبوب ماننا ہی ایمان ہے اور آپ کو اپنے والدین، اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ماننا ایمان سے دوری کی علامت ہے انسان کی جان کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ باعث تخلیق انسان ہیں۔ بلکہ آپ باعث تخلیق کائنات ہیں جیسا کہ حدیث قدسی ہے لولاک لما خلقت الافلاك۔ اے محبوب اگر آپ نہ ہوتے تو یہ کائنات کا معرض وجود میں آنے کا نظم و نسق قائم نہ ہوتا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس حدیث کو مولانا حسین احمد مدنی نے الشہاب الثاقب میں صحیح قرار دیا ہے آپ کا اصل کائنات ہونا انسانیت کی جان ہونے میں کوئی استخارہ نہیں۔ اسی طرح روح المعانی پکے میں ہے العاقل جسد و روح النبوة ولا قیام للجسد بدون روح تمام جان ایک جسم ہے اور نبی کریم اس کی روح ہیں جسم کا قیام بغیر روح کے ممکن نہیں پتہ چلا کہ نبی کریم کائنات کی جان ہیں اسی طرح اعلیٰ حضرت

کے ترجمہ سے یہ واضح ہوا کہ علمہ البیان کا مطلب یہ ہے کہ حبیب پاک علیہ الخیر والثناء کو ماکان و مایکون کا علم عطا کیا گیا لیکن دیگر مترجمین اپنے تراجم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس شان کو بیان کرنے سے قاصر رہے۔ اور یہ تین طرح کا جو فرق پیش کیا گیا ہے اس کو تفاسیر کی روشنی میں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ تفاسیر سے بے خبر لوگوں کے اس اعتراض کی حقیقت بے نقاب ہو جائے جو اپنی کم علمی کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ان الفاظ میں اعتراض کرتے ہیں کہ اس جگہ انسانیت کی جان ماکان و مایکون کسی قرآنی لفظ کا ترجمہ نہیں فاضل بریلوی نے الفاظ اپنی تسکین طبع کیلئے ناجائز طور پر قرآنی ترجمہ میں سمویئے آئیے ملاحظہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کے تائید میں تفاسیر کس طرح ماکان و مایکون کے علم کو پیش کر رہی ہیں اور انسان سے بھی نبی محترم علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں۔ روح المعانی میں ہے۔ ونصبہ (ای القرآن) علی انہ مفعول ثان بعلمہ ومفعولہ الاول محذوف۔ آپ فرماتے ہیں کہ لفظ القرآن پر نصب اس وجہ سے ہے کہ علم کا یہ مفعول ثانی ہے اور پہلا مفعول محذوف ہے اس سے آگے اقوال بیان کرتے ہوئے ایک قول نقل فرماتے ہیں۔ وقیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم یعنی وہ پہلا مفعول جس کو قرآن سکھایا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ اور ذکر کیا وقال ابن کيسان الانسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ خلق الانسان من نسیاں سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں علمہ البیان میں بیان سے مراد قرآن پاک ہے جس میں ماکان و مایکون کا علم انزل سے ابد تک موجود ہے جو پہلے انبیاء کرام کے ذکر و بیان کے مطابق ان کے احوال پر مشتمل ہے لوگوں کیلئے ہدایت اور آپ کی نبوت پر نشانی ہے۔ الجامع لاحکام البیان للقرطبی میں ہے۔ علمہ البیان وعن ابن عباس وایضا عن ابن کيسان الانسان ههنا يراد به محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی علمہ البیان میں ضمیر منصوب کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ کہ بیان سکھایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ والبیان بیان الحلال والحرام

فی القرآن وقال ابن عباس لو ضاع لی عقل بعیر لوجدت فی کتاب اللہ تعالیٰ وقال المرسى جمع القرآن علوم الاولین والاخرین۔ یعنی قرآن پاک تمام چیزوں کے علوم پر مشتمل ہے اور قرآن پاک ہمیں ہر چیز کا علم بتاتا ہے لیکن ہمارا اپنا علم قرآن پاک کو مکمل سمجھنے سے قاصر ہے حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ اگر میرے اونٹ کی رسی گم ہو جائے تو میں اسے بھی کتاب اللہ کی راہنمائی میں تلاش کر لوں۔ اور مرسی کہتے ہیں کہ قرآن پاک اولین و آخرین کے علوم کا حامل ہے اور علامہ آکوسی فرماتے ہیں۔ ولعل ابن کيسان یقدر مفعول علمہ الانسان مراد ابہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی ابن کيسان کی مراد شائد یہ ہو کہ علم کا مفعول مقدر ہے وہ ہے الانسان اور اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ اسی طرح قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں بیان فرماتے ہیں۔ وجاز ان یقال خلق الانسان یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم علمہ البیان یعنی القرآن فیہ بیان ماکان و مایکون من الانزل الی الابد مطابقا لبقا البیان من مضی من السبل ہدایۃ للناس وأیۃ علی نبوتہ۔ جائز ہے کہ یہ کہا جائے کہ خلق الانسان میں انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں علمہ البیان میں بیان سے مراد قرآن پاک ہے جس میں ماکان و مایکون کا علم انزل سے ابد تک موجود ہے جو پہلے انبیاء کرام کے ذکر و بیان کے مطابق ان کے احوال پر مشتمل ہے لوگوں کیلئے ہدایت اور آپ کی نبوت پر نشانی ہے۔ الجامع لاحکام البیان للقرطبی میں ہے۔ علمہ البیان وعن ابن عباس وایضا عن ابن کيسان الانسان ههنا يراد به محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ یعنی علمہ البیان میں ضمیر منصوب کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں۔ کہ بیان سکھایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ والبیان بیان الحلال والحرام

والهدى من الضلال وقيل ما كان وما يكون لانه بين عن
 الاولين والآخرين ويوم الدين اور علم البيان میں بیان سے مراد
 یا تو حلال و حرام کا علم اور گمراہی سے ہدایت دینا اور یا بطرح بیان کیا گیا ہے
 کہ بیان سے مراد ماکان و مایکون کا علم ہے کیونکہ حبیب پاک علیہ النجۃ و النقا
 نے اولین و آخرین اور قیامت کا ذکر فرما دیا ہے جب آپ جمیع گزشتہ ہوتے
 اور انبوالے اور واقعات قیامت سے مطلع فرما دیا تو آپ کو ماکان و مایکون
 کا علم حاصل ہے الوجیز للواحدی میں ہے الرحمن علم القرآن ای علم
 نبیہ القرآن لیس کما یقول المشرکون انما یعلمہ بشر
 خلق الانسان یعنی النبی صلی اللہ علیہ وسلم علمہ البیان
 یعنی القرآن الذی فیہ بیان کل شیء - یعنی الرحمن علم القرآن کا
 مطلب یہ ہے کہ رحمن نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سکھایا
 ایسا نہیں جیسا مشرک کہا کرتے تھے کہ ان کو کوئی بشر قرآن سکھاتا ہے اور
 خلق الانسان میں انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں علم البیان
 میں بیان سے مراد قرآن پاک ہے جس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے یعنی
 ماکان و مایکون کے بیان پر مشتمل ہے سراج المنیر میں اس طرح بیان کیا
 گیا ہے - وعن ابن عباس ایضا وابن کسبان المراد
 بالانسان ههنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم
 والمراد من البیان الحلال والحرام والهدی من
 الضلال وقيل ما كان وما يكون لانه بین عن الاولین
 والآخرین وعن یوم الدین حضرت ابن عباس اور
 ابن کسبان سے اس طرح مروی ہے کہ الانسان سے مراد یہاں
 نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور بیان سے مراد حلال و حرام اور
 گمراہی سے ہدایت دینے کا بیان مراد ہے اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ

بیان سے مراد ماکان و مایکون کا علم ہے اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 نے سب سے پہلے اور پچھلے لوگوں کا بیان فرمایا اور واقعات قیامت سے مطلع
 فرمایا لہذا یہ ماکان و مایکون کا علم ہی ہے تفسیر حسینی میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے
 علم القدران ہیامونہ است قدران مر حبیب خود را علمہ
 البیان بوجود آمد محمد را و بیا موزا سند ویرا بیان آنچه
 بود و بہت و باشد چنانچہ مضمون غلخت علم الاولین والآخرین انہی معنی خبر میدہد
 یعنی تفسیر حسینی میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ علم القرآن سے مراد یہ ہے کہ رحمن نے اپنے
 حبیب کو قرآن سکھایا یہاں اس پریشانی کا حل بھی موجود ہے کہ اعلیٰ حضرت مجرب
 کیوں ذکر کرتے ہیں علم البیان نبی کریم کو معرض وجود میں لایا اور آپ کو بیان سکھایا
 یعنی جو ہو چکا موجود ہے اور ہو گا سب کا علم عطا کیا (ماکان کا ترجمہ صاحب حسینی
 نے بود سے کیا اور مایکون کا ترجمہ است اور باشد سے کیا) اس پر نبی کریم کا
 ارشاد دالی ہے کہ مجھے تمام پہلوں اور پچھلوں کا علم عطا کیا گیا ہے تفسیر جمل میں ہے
 وقيل اراد بالانسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم علمہ
 البیان یعنی بیان مایکون و ماکان لانه صلی اللہ علیہ وسلم
 ینبئ عن خبر الاولین والآخرین وعن یوم الدین - بیان کیا
 گیا ہے کہ انسان سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور علم البیان کا مطلب
 یہ ہے کہ آپ کو ماکان و مایکون کا علم دیا گیا ہے کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
 نے تمام پہلے اور انبوالے لوگوں کے حالات سے مطلع فرمایا اور واقعات
 قیامت کا تذکرہ فرمایا - اب ان مذکورہ تفاسیر کے بیان میں یہ سمجھنا آسان
 ہو گیا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفاسیر کے مطابق ہے - ذاتی رائے نہیں - ہاں
 البتہ آپ کے ترجمہ کو مورد الزام ٹھہرانے والوں کو پریشانی صرف اس بات
 کی ہے کہ نبی کریم کی شان کو آپ نے اردو خواں کے سامنے کیونکر واضح کر
 دیا - کیونکہ آپ کی یہ شان تو معتبر تفاسیر میں موجود ہے جو ضخیم ہونے کی وجہ سے

عام آدمی کی وسعت میں نہیں کہ خرید سکے اور ہر آدمی کا ان کو سمجھنا بھی مشکل ہے اس لئے اردو مترجمین کے اذہان میں جس شان مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء کو پوشیدہ رکھنا مقصود تھا اسکو اعلیٰ حضرت نے مختصر مگر جامع انداز میں سمجھا دیا یہی پریشانی کا سبب بنا اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو ذاتی رائے اور بے ہودہ الفاظ سے ان کا ذکر کرنا شروع کیا۔ لیکن حقیقت آشکارا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسی وجہ سے مختصر تفسیر سے اس مسئلہ کو واضح کر دیا۔ اب اگر نبی کریم کی شان کسی کو نہ پسند آئے تو ہمیں اس سے کیا غرض یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے

فَاتَهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا (پہ ۲۸)

پھر پہچان پر اللہ جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ (مولانا محمود الحسن)
 پھر پہچان پر اللہ جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ (شاہ عبدالقادر)
 سوان پر خدا ایسی جگہ سے پہنچا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا۔ (مولانا اشرف علی)
 مگر اللہ ایسے رخ سے ان پر آیا جہاں ان کا خیال بھی نہ تھا۔ (مودودی)
 مگر خدا نے انکو وہاں سے آیا جہاں سے ان کا گمان بھی نہ تھا (فتح محمد)
 تو اللہ کا حکم انکے پاس آیا جہاں سے ان کا گمان بھی نہ تھا۔ (اعلیٰ حضرت)
 اللہ تعالیٰ آنے جانے سے پاک ہے یہ الفاظ اللہ تعالیٰ اگیا یہ اس کی شان کے لائق نہیں۔ اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت نے مقصد کو اپنے ترجمہ سے واضح کر دیا اور وہ الفاظ استعمال فرماتے جو اللہ تعالیٰ کی شان کے لائق ہیں اور مقصد بیان کے مطابق بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی برتری تفسیر

سے بہت زیادہ روشن ہے۔ جلالین میں ہے۔ فاتھم اللہ امرہ وعذابہ کہ اللہ کا حکم اور عذاب ان کے پاس آیا۔ ملاک میں ہے۔ فاتھم اللہ اسی امر اللہ وعقابہ۔ یعنی ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا امر اور عذاب آیا تفسیر کبیر میں ہے فی الایۃ وجہان الاول ان یکون الضمیر فی قولہ

فَاتَهُمُ اللَّهُ عَذَابُ الْيَهُودِ اِی فَاتَهُمُ عَذَابُ اللَّهِ وَاخَذَهُمْ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا وَالْثَانِی ان یکون عَابِدًا اِلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِی فَاتَهُمْ نَصْرُ اللَّهِ وَتَقْوِیَّتُهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوا یعنی اس آیت کے یہی دو احتمال ہیں ایک یہ کہ فاتھم میں ضم ضمیر کا مرجع یہودیوں کا تو اب معنی یہ ہوگا کہ ان کے پاس اللہ کا عذاب اور اس کی گرفت آئی جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ضمیر کا مرجع مؤمنین ہوں تو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ اللہ ان کو اور توفیقیت ان کے پاس آئی جہاں سے ان کو گمان بھی نہ تھا اب ترجمہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ کتنا شاندار ہے۔ کہ اللہ کا حکم انکے پاس آیا۔ حکم کا لفظ علامہ رازی رحمۃ اللہ کی دونوں توجیہات کو شامل ہے اس سے آگے علامہ رازی نے فیصد ہی فرمادیا کہ یہ کہنا غلط ہے کہ اللہ ان کے پاس پہنچا۔ بیان کرتے ہیں۔ فاتھم اللہ لا یمکن اجراء علی ظاہر باتفاق جمہور العقلاء فدل علی ان باب التاویل مفتوح وان صرف الایات عن ظواہرہا بمقتضی الدلائل العقلیۃ جائز۔ یعنی جمہور عقلاء کا اتفاق ہے کہ فاتھم اللہ کا ظاہر ہی معنی لینا کہ اللہ ان کے پاس پہنچا یہ ممکن ہی نہیں۔ تاویلات کا دروازہ کھلا ہوا ہے اس ضابطہ کے مطابق تاویل کرنی ضروری ہوتی اور آیات کو دلائل عقلیہ کے پیش نظر ظاہر سے پھیرنا جائز ہے۔

الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ (پہ ۲۹)

نکال کھڑا کر نیوالا، صورت کھینچنے والا۔ (محمود الحسن)
 نکال کھڑا کرتا، صورت کھینچتا۔ (شاہ عبدالقادر)
 پیدا کر نیوالا ہر ایک کو صورت دینے والا۔ (اعلیٰ حضرت)
 اعلیٰ حضرت کا ترجمہ فصاحت و بلاغت میں یکتا اور مقصود کو سمجھانے میں اپنی مثال

آپ ہی ہے۔ کیونکہ نکال کھڑا کرنا۔ وضاحت سے خالی ہے اور ضروری نہیں کہ اس کو "پیدا کرنا والا" کے معنی میں استعمال کیا جائے کیونکہ نکال کھڑا کرنا کا معنی تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کو ایک علاقہ، ایک جگہ سے نکال کر دوسرے علاقہ اور دوسری جگہ میں بھیج دیا جائے۔ حالانکہ یہ قصد ہی نہیں مقصد بیان تو پیدا کرنا والا ہی ہے اسی طرح المصور کے معنی صورت کھینچنے والا بھی کامل نہیں کیونکہ صورت کھینچنے والا تو نوگوں کا فر بھی ہوتا ہے بخلاف صورت دینے والا یہ کسی اور صورت میں استعمال نہیں صرف اسی صورت میں استعمال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو شکل و صورت عطا فرمانا ہے مہارک میں ہے الباری الموجد المصور فی الارحام یعنی الباری کا معنی معرض وجود میں لایا والا اور المصور سے مراد ارحام میں یعنی شکم مادر میں صورت عطا فرمانے والا۔ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام ہیں ان کا ترجمہ ایسا ہی کیا جائے جو رب قدوس کی شان کے لائق ہے۔

وَتَرْكُوكَ قَائِمًا (پ ۲۹)

اور تجھ کو چھوڑ جائیں کھڑا۔ (مولانا محمود الحسن)
 اور تجھ کو چھوڑ جاویں کھڑا۔ (شاہ عبدالقادر)
 اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جائیں۔ (اشرف علی)
 اور تمہیں کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔ (مولانا مودودی)
 اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔ (عبدالماجد وریا آبادی)
 اور تمہیں کھڑے کا کھڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ (فتح محمد)
 اور چھوڑ جاتے ہیں تجھ کو کھڑا۔ (شاہ رفیع الدین)
 اور تمہیں خطبے میں کھڑا چھوڑ گئے۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت کا ترجمہ پوری تفصیل پر مشتمل ہے آیت کریمہ کے شان نزول اور اصلی صورت حال کی وضاحت کر رہا ہے جیسا کہ تفسیر میں اس آیت کریمہ

کے شان نزول کو پیش کیا گیا ہے جلالین میں ہے۔ کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب یوم الجمعة فقدمت غیر وضرب لقد ومھا الطبل علی العادة فخرج لھا الناس من المسجد غیر انشی عشر ساجد فنزل۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے کہ ایک قافلہ اونٹوں پر غلہ لایا اور اعلان کیلئے عادت کے مطابق دف بجائی گئی تو بارہ آدمیوں کے سوا باقی سب غلہ خریدنے کی غرض سے چلے گئے نبی کریم اسی طرح خطبہ کے حال میں کھڑے تھے و ترکوک قائمًا فی الخطبة اور تمہیں خطبے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ مہارک میں بھی اسی طرح ہے و ترکوک علی المنبر قائمًا تخطب اور تمہیں منبر پر خطبے میں کھڑا چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ مقصد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے ہی واضح ہے جبکہ دیگر تراجم سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ وہ کیسے حال میں نبی کریم کو چھوڑ گئے تھے

یَوْمَ یُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ (پ ۲۹)

جس دن کہ کھولی جائے پنڈلی۔ (مولانا محمود الحسن)
 جس دن کھولی جاوے پنڈلی۔ (شاہ عبدالقادر)
 جس دن پنڈلی سے کپڑا اٹھا دیا جائیگا۔ (فتح محمد)
 جس دن ایک ساق کھولی جائے گی۔ (جس کا معنی اللہ ہی جانتا ہے)
 (اعلیٰ حضرت)

اللہ تعالیٰ جسم اور اعضاء سے پاک ذات ہے اس لئے پنڈلی کھولنے کا کیا مقصد۔ اس پر مفسرین کرام نے بہت بحثیں کی ہیں جن کا لب لباب یہ ہے وان الایۃ من المتشابه (روح المعانی) کہ یہ آیت متشابہات سے ہے جس پر اتنا ہی ایمان کافی ہے کہ جو اللہ کی مراد ہے وہ حق ہے یعنی اس کا معنی اللہ ہی جانتا ہے۔ جلالین اور مہارک میں ہے کہ اس سے مراد شرت امر

ہے ہو عبارة عن شدة الامر يوم القيمة للحساب والجزاء
یعنی قیامت کے دن حساب و جزا کیلئے شدت امر ہے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ
جس دن ساق کھولی جائے گی (جس کا معنی اللہ ہی جانتا ہے) خوب تر ہے
کیونکہ ساق سے مراد کیا ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ مشابہات پر ایمان لانا
کہ ان کا معنی اللہ ہی جانتا ہے۔ مشابہات کے نزول میں یہی حکمت ہے
اس لئے ساق کا معنی پٹلی کرنا اور اس کا کھولا جانا مقصود ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ
کی شان کے لائق ہے

اِنَّ لَقَوْلِ رَسُولٍ كَرِيمٍ (۲۹)

یہ کہا ہے ایک پیغام لانیوالے سردار کا۔ (مولانا محمد الحسن)
یہ کہا ہے ایک پیغام لانیوالے سردار کا۔ (شاہ عبدالقادر)
یہ قرآن کلام (الہی) ہے فرشتہ کا لایا ہوا۔ (عبدالماجد دریا آبادی)
بے شک یہ قرآن ایک کرم والے رسول سے باتیں ہیں (اعلیٰ حضرت)
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں یہ واضح ہے کہ ان کی ضمیر کا مرجع قرآن پاک
ہے اور رسول کریم سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو سراپا کرم ہیں لیکن دیگر
ترجمہ سے یہ مراد واضح نہیں کیونکہ یہ کہا "ترجمہ کرنا اس سے یہ نہیں پتہ چلتا
کہ مراد قرآن پاک ہے نہ ہی پیغام لانیوالے سردار سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے
حبیب پاک علیا الخیر والشر میں جو کرم والے ہیں۔ جلالین میں ہے۔ انا ہی
القرآن لقول رسول کریم اسی قالہ رسالۃ عن اللہ
سبحانہ وتعالیٰ اس پر جمل میں یہ بیان کیا گیا۔ کریم اسی
علی اللہ فہو فی غایۃ الکرم الذی ہو البعد عن
مساوی الاخلاق و ہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم
وقولہ قالہ رسالۃ اسی تبلیغ لادانہ وصف لہ کما انہ کذاک

اللہ تعالیٰ یعنی بے شک قرآن پاک کرم والے رسول پر اللہ نے نازل فرمایا اور
انہوں نے مخلوق پر پیش فرمایا۔ کریم سے مراد وہ بلند و بالا ذات جو بہت زیادہ کریم ہے
یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی کریم وہ قرآن اللہ کی طرف سے مخلوق پر پیش
فرمایا اصل میں ایک سوال کا جواب ہے کہ قرآن پاک تو اللہ کا کلام ہے اس
کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام کہنا کیسے صحیح ہے اس کا جواب یہ ہے
کہ قرآن پاک بلاشبہ اللہ کا کلام ہے لیکن اللہ نے نبی کریم پر پیش فرمایا۔ یہ مراد
نہیں کہ آپ کا اپنا کلام ہے۔ توجہ فرمائیں کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ کس طرح مقصد کے
مطابق اور واضح اور تفسیر سے کیسے مطابقت رکھتا ہے۔

لَا تَأْخُذْ بَاِمْمِنٍ بِالْيَمِينِ ثُمَّ لَقَطْعًا مِنْهُ الْوَتِينَ (۳۰)

تو ہم پکڑ لیتے اس کا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی گردن۔ (مولانا محمد الحسن)
تو ہم پکڑتے اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے اس کی ناک۔ (شاہ عبدالقادر)
تو ہم اسکا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے اور رگ گردن کاٹ ڈالتے۔ (مودودی)
تو ہم اسکا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ان کی رگ گردن کاٹ ڈالتے (فتح محمد)
البتہ پکڑتے ہم اس کا داہنا ہاتھ پھر کاٹ ڈالتے ہم اس سے
رگ گردن کی۔ (شاہ رفیع الدین)
ضرور ہم ان سے بقوت بدلہ لیتے پھر ان کی رگ ل کاٹ لیتے۔ (اعلیٰ حضرت)
اگرچہ دایاں ہاتھ سے پکڑنا لغوی معنی درست ہے لیکن مراد یہی
ہے جو اعلیٰ حضرت نے ترجمہ کیا "قوت سے بدلہ لیتے" تفسیر کبیر میں ہے ان
الیمین بمعنی القوة والقدرة۔ یعنی یمین کا معنی قوت و قدرت
ہے۔ اعلیٰ حضرت نے وتین کا ترجمہ رگ دل کیا ہے۔ اور باقی حضرات گردن، ناک
رگ گردن۔ تفسیر کی رو سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی اصح ہے تفسیر کبیر میں ہے
الوتین هو العرق المتصل من القلب بالراسن الذی

اذا قطع مات الحيوان یعنی الوتین اس رگ کو کہتے ہیں جو دل سے سر تک جاتی ہے اس کو جب کاٹ دیا جائے تو حیوان مرجاتا ہے۔ مارک میں ہے ہونیاط القلب اذا قطع مات صاحب وہ رگ دل ہے جس کی کاٹ دی جائے وہ مرجاتا ہے۔ جلالین میں ہے۔ الوتین نیاط القلب وهو عرق متصل به اذا انقطع مات صاحب رگ دل ہے جس کے کاٹنے سے موت واقع ہو جاتی ہے صراح میں نیاط القلب کا معنی رگ گردن کیا گیا ہے تفاسیر کی مذکورہ عبارات سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی ہی برتری عیاں ہے۔

إِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهُ مَمَقَاعَ دَلِ السَّمْعِ (پ ۲۱۴)

اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے ٹھکانوں میں سننے کے واسطے (مولانا محمود الحسن) اور جو کہ ہم پہلے آسمان میں سننے کیلئے کچھ موقعوں پر بیٹھا کرتے (اعلیٰ حضرت) اس جگہ منہا میں ضمیر کا مرجع السماء ہے جو انالسماء السماء میں پہلے آچکا ہے۔ مارک میں بھی وانا کنا نقعد من السماء اعلیٰ حضرت کا ترجمہ اس مقصد کو واضح کر رہا ہے کہ جن پہلے آسمان میں سننے کیلئے کچھ موقعوں پر بیٹھا کرتے تھے، صرف ٹھکانوں میں سننا، مقصد کو واضح نہیں کرتا

يَا أَيُّهَا الْمَرْغِلُ قِمِ اللَّيْلَ الْاَقْلِيلَا (پ ۲۱۴)

اے بھر مٹ ماننے والے کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات (شاہ عبدالقادر) کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات (مولانا محمود الحسن) اے بھر مٹ مارنے والے رات میں قیام فرما سوا کچھ رات کے (اعلیٰ حضرت) اس جگہ آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ نبی کریم کو اختیار دیا گیا کہ آپ رات کو عبادت فرمائیں اُدھی رات، یا اس سے کم یا اس سے زائد آپ کو اس میں

اختیار ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے یہ مقصد واضح ہے کہ آپ رات میں قیام فرمائیں سوا کچھ کے یعنی کچھ کے سوا سے کیا مراد ہے وہ اُدھی رات یا اس سے زائد یا اس سے کم۔ لیکن اگر یہ ترجمہ ہو کہ کھڑا رہ رات کو مگر کسی رات اس ترجمہ سے ہر وہ شخص جو اردو زبان سے واقف ہو گا وہ یہی سمجھے گا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کئی راتیں قیام کریں اور کئی راتیں قیام نہ کریں حالانکہ یہ مفہوم معتبر نہیں۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مقصد کے مطابق ہے تمام تفاسیر اس مقصد کو ظاہر کرتی ہیں جو اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ الاقلیل استثناء من اللیل وقولہ تعالیٰ نصف بدل من قلیل بدل الکل والنقص منه عطف علی امر السابق قلیل ای نقصاً قلیلًا او مقداراً قلیلًا بحیث لا یخط عن نصف النصف او زد علیہ عطف کما سبق وهو تخیرہ صلی اللہ علیہ وسلم بدین ان یقوم نصف اللیل او اقل من النصف او اکثر (روح المعانی مختصراً) یعنی الاقلیل، لیل سے مستثنیٰ ہے اور نصف قلیل سے بدل الکل ہے اور محطوف علیہ ہے اور نقص اور اوزد علیہ اس کے معطوف میں یعنی وہ جو مستثنیٰ ہے وہ کیا ہے وہ نصف رات یا اس سے کم یا زائد ہے دوسرا جو لفظ قلیل ہے اس سے مراد محطوف ہی مقدار ہے یعنی نصف سے کم تو ہو لیکن محطوف ہی مقدار تاکہ جو حقانی حصہ سے کم نہ ہو۔ اب اس تفصیل کے بعد اعلیٰ حضرت کے ترجمہ اور دیگر تراجم میں فرق کی طرف توجہ کریں خود بخود واضح ہو گا کہ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی مقصد کے مطابق ہے دیگر مذکورہ تراجم مقصد کی وضاحت سے قاصر ہیں

وَالْتَزَعْتَ غَرْقًا (پ ۲۱۴)

قسم ہے گھسیٹ لانے والوں کی ڈوب کر (شاہ عبدالقادر)

(مولانا محمد الحسن)

(امودودی)

(فتح محمد جالندھری)

(اعلیٰ حضرت)

قسم ہے عسیر لائے والوں کی غوطہ لگا کر۔
قسم ہے ان فرشتوں کی جو ڈوب کر بھیجتے ہیں۔
ان فرشتوں کی قسم جو ڈوب کر بھیج لیتے ہیں۔
قسم ہے ان کی کہ سختی سے جان بھیجیں۔
اس مقام پر ان ملائکہ کی قسم اٹھائی گئی ہے جو روح قبض کرتے ہیں
یعنی عزرائیل اور اس کے ساتھ آئیوالے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے مطلب آسانی
سے اخذ کیا جاسکتا ہے لیکن دوسرے تراجم سے مطلب کو حاصل کرنا نہایت دشوار
بلکہ یوں کہا جائے کہ ظاہر طور پر صرف ترجمہ سے مطلب حاصل کرنا ممکن ہی نہیں اور تفسیر
میں بھی اسی طرح بیان کیا گیا جس طرح اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے۔ جلالین میں ہے۔ والسنزعت
الملائكة تنزع ارواح الكفار غرقاً منزعاً جشدة۔ اسی طرح کبیر میں ہے
والنزع غرقاً۔ ہی الملائكة الذين ينزعون نفوس بني آدم فاذا انزعول
نفوس الكفار منزعوا جشدة۔ نیز مولوی فتح محمد صاحب اور مولانا مودودی کے تراجم
فرشتوں کس عربی لفظ کا ترجمہ ہے؟

وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ (پ ۴)

(مولانا محمد الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

(فتح محمد)

(شاہ رفیع الدین)

(امودودی)

(عبدالماجد)

(اعلیٰ حضرت)

یہاں قیامت کے احوال کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر

یہ مفہوم جو مقصود ہے وہ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے واضح ہے کہ چونکہ میلے ہونے سے یہ پتہ
نہیں چلتا کہ وہ اپنی جگہ ہوتے ہی بے نور ہو جائیں گے یا کہ گر پڑیں گے اور گرنے کی
وجہ سے بے نور ہوں گے بیان کا مقصد بھی یہ کہ ستارے زمین پر ٹوٹ ٹوٹ کر گر
پڑیں گے۔ اعلیٰ حضرت کا ترجمہ بھی اس کو ظاہر کرتا ہے کہ جب تارے بھڑ پڑیں گے
اور تفسیر کی تائید بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو حاصل ہے مدارک میں ہے واذ النجوم
انكسرت تساقطت۔ جب تارے بھڑ پڑیں گے جلالین میں ہے واذ النجوم
انكسرت انقضت وتساقطت۔ تارے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑیں گے تفسیر
کبیر میں ہے واذ النجوم انكسرت اى تناشرت وتساقطت۔ تارے بکھر جائیں
گے گر پڑیں گے۔

إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمُرْصَلِ (پ ۳)

(مولانا محمد الحسن)

(شاہ عبدالقادر)

(مولانا اشرف علی)

(امودودی)

(عبدالماجد دریا آبادی)

(فتح محمد)

(شاہ رفیع الدین)

(اعلیٰ حضرت)

اس جگہ عام مترجمین نے یہ ترجمہ کیا ہے، رب گھات میں ہے حالانکہ
بیشک تعالیٰ کی شان کے لائق نہیں اس لئے کہ کسی کی گھات میں ہونے کا مطلب یہ
ہوتا ہے کہ وہ دوسرے سے نظر بچا کر چھپ بیٹھا ہوا ہے اور چھپ کر دوسرے
پر حملہ کرنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ کا چھپ کر بیٹھنا گھات میں دوسرے پر حملہ کرنا، سزا دینا

بے شک تیرا رب لگا ہے گھات میں۔

تیرا رب لگا ہے گھات میں۔

بے شک آپ کا رب گھات میں ہے۔

تمہارا رب گھات لگائے ہوئے ہے۔

بے شک آپ کا پروردگار تاک میں ہے

بے شک تمہارا پروردگار تاک میں ہے۔

تحقیق تیرا رب بیچ گھات کے ہے

بے شک تمہارے رب کی نظر سے کچھ غائب نہیں۔ (اعلیٰ حضرت)

یہ اس کی شان سے کوسوں دور ہے۔ وہ بیٹھنے اور چھپنے سے پاک ہے اسی وجہ سے اعلیٰ حضرت کا ترجمہ شان الوہیت کے عین مطابق ہے آپ چونکہ زبانی کلامی توحیدی ہونے کے وجود پر نہیں تھے کہ شان الوہیت بھی نہ سمجھ آئے بلکہ آپ حقیقتہً ترجمہ و رسالت کے مراتب کا پاس کر نیوالے تھے۔ اسی وجہ سے آپ کا ترجمہ کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف تفاسیر کی تائید بھی اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کو حاصل ہے۔ جلالین میں ہے۔ یرصد اعمال العباد فلا یفوتہ منها شیء لیجازیہم علیہا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے اعمال کو نگاہ میں رکھتا ہے اس سے کچھ بھی مخفی نہیں وہ ان کو ان کے مال کی جزا دے گا۔ روح المعانی میں ہے۔ وفي الکلام استعارة تمثيلية شبه کونه تعالیٰ حافظا لعمال العصاة۔ یہ کلام استعارہ تمثیلیہ کے طور پر ہے مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو عذاب دے گا کیونکہ وہ ان کے اعمال کو نظر میں رکھتا ہے۔

لَا أَقِيمُ بِهَذَا الْبَلَدِ وَأَنْتَ حِلٌّ بِهَذَا الْبَلَدِ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ ۝

قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور تجھ کو قید نہ رہے گی اس شہر میں اور جننے کی اور جو بنا۔ (شاہ عبدالقادر)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور تجھ پر قید نہیں رہے گی اس شہر میں اور تم ہے بننے کی اور جو اس نے بنا۔ (مولانا محمد الحسن)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہوئی ہوئے اور قسم ہے باپ کی اور اولاد کی (اشرف علی)

میں قسم کھاتا ہوں اس شہر کی اور آپ کو اس شہر میں لڑائی حلال ہونے والی ہے اور اقم قسم ہے باپ کی اور اولاد کی۔ (عبدالماجد دریا آبادی)

مجھے اس شہر کی قسم کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو اور تمہارے باپ ابراہیم کی قسم اور اس کی اولاد کی کہ تم ہو۔ (اعلیٰ حضرت)

اعلیٰ حضرت نے و انت حل بهذا البلد کا ترجمہ کیا ہے کہ اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو اگر دیگر تراجم بھی تفاسیر سے ملتے ہیں تو اعلیٰ حضرت کا ترجمہ تفسیر کبیر کے اس قول سے مطابقت رکھتا ہے و انت مقیم بهذا البلد نازل فیہ حال بہ کا نہ تعالیٰ عظم مکتہ من جہۃ انہ علیہ الصلوٰۃ

والسلام مقیم بہا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ میں مقیم ہوئے ہیں وجہ سے اس کو عظیم سمجھتے ہوئے قسم اٹھائی کہ مجھے اس شہر کی قسم اے محبوب تم اس شہر میں تشریف فرما ہو۔ اسی طرح باقی تترجمین نے والد اور ولد کو عام رکھا۔ باپ اور اولاد کی قسم، یا جننے یا جو بنا اس کی قسم۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے والد سے مراد ابراہیم علیہ السلام اور اولاد سے مراد آپ کی اولاد جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قسم اسی لئے اٹھائی گئی ہے کہ والد سے مراد بھی معظم سہتی اور اولاد سے مراد معظم ہے روح المعانی میں ہے وقیل ابن اہیم علیہ السلام وولده اسمعیل علیہ السلام والنبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی والد سے مراد ابراہیم علیہ السلام ہیں اور اولاد سے مراد حضرت اسمعیل علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مدارج النبوة میں شیخ فرماتے ہیں

معزز و محترم است نزد حق تعالیٰ بوقت حلول دنزدول وی دریا واریجا گفتہ اند شرف المکان بالمکین۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف فرما ہونے کی وجہ سے وہ شہر معزز و محترم ہوا اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ شرف المکان بالمکین۔ کہ مکان کو رہنے والے کی وجہ سے بزرگی حاصل ہے کے متعلق فرماتے ہیں

اگر مراد بوالد آدم است و ما ولد ذریت است آنحضرت داخل است

در عموم ذریت و اگر ابراہیم علیہ السلام است مراد بذریت آنحضرت
خواہ بود صلی اللہ علیہ وسلم پس دریں صورت دو قسم است از پدر گدا
عزوجل بحیب وی صلی اللہ علیہ وسلم -

یعنی اگر والد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہوں اور ذریت سے مراد آپ کی
اولاد تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عام اولاد میں داخل ہیں اگر والد سے مراد حضرت
ابراہیم علیہ السلام ہوں تو والد سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے - بہر حال
اس پاک میں نبی کریم کی دو مرتبہ قسم اٹھائی گئی -

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ (۱۰۰)

پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ سمجھائی - (محمود الحسن)
پایا تجھ کو بھٹکتا پھر راہ دی - (شاہ عبدالقادر)
اور اللہ نے آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتلایا - (اشرف علی)
تمہیں نادان راہ پایا پھر ہدایت بخشی - (مودودی)
اور رستے سے ناواقف دیکھا تو سید ہارستہ دکھایا - (مولوی فتح محمد)
اس نے تجھ کو بھولا بھٹکا پایا پھر راہ پر لگایا - (وحید الزمان)
آپ کو بے خبر پایا سو رستہ بتا دیا - (عبدالماجد دریا آبادی)
پس پایا تجھ کو راہ بھولا ہوا پس راہ رکھائی - (شاہ رفیع الدین)
اور تمہیں اپنی محبت میں خود رفتہ پایا تو اپنی طرف راہ دی - (اعلیٰ حضرت)

اس مقام پر اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہی صحیح ہے اور اسی میں نبی کریم صلی
اللہ علیہ وسلم کی شان کا لحاظ کیا گیا ہے جبکہ دیگر تراجم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
بھٹکا ہوا، بے خبر - ناواقف کہہ کر گستاخانہ انداز اختیار کیا گیا ہے اگر نبی کریم صلی
نہوت سے پہلے محاذ اللہ بھولے بھٹکے ہوئے - شریعت سے بے خبر اور ہدایت
اور سیدی راہ سے ناواقف تھے تو اس کفر کی مرتب میں تو بیکے سامنے سجدہ ریز بھی نہ ہو سکتا

طرح محاذ اللہ عام ہر انہوں کا ارتکاب بھی کرتے - حالانکہ نبی کریم اور جمیع انبیاء کرام
نہوت سے پہلے اور بعد میں تمام صفات و کمالات سے پاک ہوتے ہیں اسی وجہ سے کہ وہ
اللہ تعالیٰ اور راہ حق سے باخبر ہوتے ہیں - اگر عیسیٰ علیہ السلام اپنے بچپن میں اپنی
عبودیت اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور اپنی نہوت اور اپنے دیگر کمالات کا اعلان فرماتے ہیں
تو کیا وہ بے خبری، ناواقفی، بھولے بھٹکے ہوئے حالات میں کرتے ہیں یا کہ سب کچھ
جانتے ہوئے یہ اعلان فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام اپنے محمد میں اپنے بعد ہونے کو
جاننے کا ذکر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے باخبر ہونے کو بیان کرتے ہیں -
اور اپنی نہوت اور اپنے کمالات اور کئی شرعی احکام سے علم رکھنے کا برملا اعلان
کرتے ہیں تو یقیناً نبی محترم جمیع انبیاء کرام سے افضل ہونے کی وجہ سے عیسیٰ
علیہ السلام سے زیادہ علم رکھتے ہیں - حق تو یہ تھا کہ ہر مخالف بھی اعلیٰ حضرت کی برتری
کو تسلیم کرتا لیکن خدا اور عناد نے اس مقام پر جا بھڑکایا کہ صحیح غلط اور غلط صحیح نظر
سمجھ آنے لگا اور اعلیٰ حضرت کے ترجمہ پر ان الفاظ سے اعتراض کیا گیا - ووجدك
ضالاً اس جگہ اپنی محبت اور اپنی طرف کے چلنے من گھڑت میں - افسوس کہ اگر
تفسیر کا مطالعہ کیا ہوتا تو یہ کہنے کی جرأت نہ ہوتی - تفسیر کی عبارت ملاحظہ فرمائیں جن سے
اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی فحشیت واضح ہے فہم فیہ میں علامہ ملازمی نے اس آیت کریمہ
کی بیس توجیہات بیان کی ہیں لیکن ان میں سے وہ وتر جس سے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ کی برتری
سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے - الضلال بمعنی المحبة كما في قوله انك
لنفي ضلالك القديم اي محبتك ومعناه انك محب فهدى يتلوه
الى الشرائع التي بها تتقرب الى خدمة محبوبك يعني اسبغ
ضلال بمعنی محبت ہے جس طرح انك لنفي ضلالك القديم میں ضلال کا معنی محبت
ہے - یہاں معنی یہ ہوگا کہ بے شک آپ محب ہیں یعنی آپ کو اپنی محبت میں وارفتہ پایا
تو اپنی طرف ہدایت دی ان راستوں کی راہنمائی کی جبکہ تجھے محبوب کی خدمت کا قرب
حاصل ہوگا نبی کریم کا محبوب اللہ تعالیٰ کی ذات ہی تو ہے - روح المعانی میں ہے -

ووجدك ضالاً عن معنى محض المودة الأولى فسقاك كاساً من شراب القربة
والمودعة فهداك به إلى معرفته عز وجل وقال جعفر الصادق رضي الله
عنه كنت ضالاً عن محبتك في الدنيل فبنت عليك بمعرفتي - آپ حقیقتہ
محبت میں وارد تھے تو آپ کو شراب قرب و محبت کا جام پلایا اپنی معرفت کی راہ دی
حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اس کا مقصود یہ ہے کہ آپ کو ازل میں میری
جو محبت حاصل تھی آپ اس میں وارد تھے پھر میں نے آپ پر احسان کیا کہ اپنی
معرفت کی طرف راہ دی تفسیر ظہری میں اس طرح ہے وقال بعض الصوفية معناه
ووجدك محباً عاشقاً مغرطاً في الحب والعشق - صوفیائے کرام نے فرمایا کہ
اس کا معنی یہ ہے کہ آپ کو اپنی محبت و عشق میں وارفتہ عاشق و محب پایا الجامع الکلام
البيان للقطري میں ہے وقيل ووجدك محباً للمهادية فهداك اليها
ويكون الضلال بمعنى المحبة ومنه قوله تعالى انك لفي
ضلالك القديم آپ کو اپنی محبت کی راہ تلاش کرنے میں وارد فرمایا تو اپنی طرف
راہ دی یہاں ضلال بمعنی محبت ہے جیسا کہ انک لفي ضلالك القديم
میں ضلال بمعنی محبت ہے اس مقام کے نانک ہو نیکی وجہ سے مفسرین کہہ کر توجہ
کرتے نظر آتے ہیں ورنہ آسانی سے وہ بھی کہہ سکتے تھے تمہیں بھٹکا ہوا پایا تو ہدایت
دی - علامہ رازی کی پیش کردہ توجہات سے کچھ پیش کر رہا ہوں -

۱ - انه قد يخاطب السيد ويكون المراد قومه فقوله
ووجدك ضالاً أي وجد قوماً ضللاً - فهداهم
بك وبشرعك - یہاں خطاب آقا کو اور مراد آپ کی امت ہے کہ
آپ کی قوم کو بھٹکا ہوا پایا اور ان کو راہ دی - اس صورت میں ترجمہ
بھٹکا ہوا اگر نادرست ہے لیکن نسبت قوم کی طرف کھجائے اور ترجمہ
بھی ایسا ہی ہونا چاہئے جس میں قوم کا ذکر نہ ہو -

۲ - وجدك ضالاً عن الهبة متحيراً في يد قریش

متمنياً فراقهم وكان لا يمكنك الخروج بدون
اذنهم تعالى فلا اذن له ووافق الصديق عليه
آپ ہجرت کیلئے بیتاب تھے قریش کو چھوڑنے کی آپ تمنا رکھتے
تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر آپ کو ہجرت کرنا ممکن نہیں تھا
پس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت دی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ
کے ہمراہ ہوئے -

۳ - ضالاً عن القبلة فانه كان يتمنى ان تجعل الكعبة
قبلة له وما كان يعرف ان ذلك هل يحصل له
ام لا فهداه الله بقوله فلنولينك قبلة ترضاها
فكانه ذلك التحيين بالضلال - نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم بیت المقدس سے کوہ المکرمہ کے تبدیل ہونے کی بہت زیادہ تمنا رکھتے
تھے کہ کب قبلہ بدلے گا تو اللہ تعالیٰ نے اس تحریر و بلے قرار دی سے
راہ دی اور یہ ارشاد فرمایا فلنولينك قبلة ترضاها
آپ کی مرضی کے مطابق ہم قبلہ بدل رہے ہیں اسی تحریر و مقررہ کی
نام ضلال ہے -

اس طرح کئی توجہات پیش کی گئی ہیں - صرف اسی وجہ سے
تاکہ نبی کریم کو کوئی بھولا بھٹکا ہوا نہ کہے - لیکن افسوس کہ سننے والوں نے پھر
بھی کہہ دیا - اسی طرح مدارج النبوة میں شیخ نے کئی وجوہ بیان کی ہیں ایک
وجہ وہ ہے جس کے مطابق اعلیٰ حضرت کا ترجمہ ہے - آپ نے اس طرح ذکر فرمایا
اُنکو مراد بضال محبت است یعنی یافت ترا محب وطالب معرفت من سب
محب بضال بسیار آمدہ است کہ گم می گرد و اذ اختیار و قرار خود برنج
معقول نمی تواند رفت چنانکہ ان الذک فی ضلال میں وانک لفي ضلالك القديم

یعنی ضال کا معنی محبت ہے - مطلب یہ ہوا کہ میں نے آپ کو اپنی محبت میں وارد فرمایا (گم)

پہا پھر اپنی طرف راہ دی - ضال محب کے معنی میں بہت آتا رہتا ہے - کیونکہ محبت میں اختیار برقرار نہیں رہتا جیسے انا لکراک فی ضلال مبین اور انک لفی ضلالک القدیم میں ضلال بمعنی محب کا محبت میں گم ہونا ہے

وَالْعَصْرِ (۶۷)

قسم ہے عصر کی -
قسم ہے زمانہ کی -
زمانے کی قسم -
عصر کی قسم -
اس زمانہ محبوب کی قسم -

اگرچہ اس مقام پر تمام اقوال ملتے ہیں لیکن اعلیٰ حضرت کے ترجمہ سے محبت حبیب کبریٰ علیہ التحیۃ والثناء کا واضح ثبوت ملتا ہے اس پر تفاسیر کے اقوال بھی موجود ہیں - اسی قول کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی پسند کرتے ہوئے مدارج النبوة میں درج فرمایا - روح المعانی میں ہے وقیل المراد به عصر النبوة وکانہ عنی به وقت حیاته علیہ الصلوٰۃ والسلام فانما اشرف اعصار تشریف النبی صلی اللہ علیہ وسلم - یعنی عصر سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ نبوت کی قسم ہے - گویا کہ آپ کی زندگی مطہرہ کے زمانہ کی قسم اٹھائی گئی ہے کیونکہ وہی زمانہ سب زمانوں سے اعلیٰ و مشرف ہے تفسیر کبیر میں ہے والعصر ای والعصر الذی انت فیہ فہو تعالیٰ اقسام بزمانہ فی هذه الایۃ وبمکانہ فی قولہ وانت حل بہذا البلد وبعمرہ فی قولہ لعمرک فکانہ قال وعمرک وبلدک وجمعک - یعنی والعصر سے مراد وہ زمانہ ہے جس میں اے محبوب آپ

تشریف فرما ہیں - اس آیت میں نبی کریم کے زمانہ کی قسم ہے وانت حل بہذا البلد میں نبی کریم کے شہر کی قسم - اور لعمرک میں نبی کریم کی عمر کی قسم ہے - گویا رب تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اے محبوب آپ کے زمانہ اور شہر اور آپ کی عمر کی قسم - مدارج میں ہے پس قسم یاد کردی تعالیٰ درینجا بزمان رسول چنانکہ قسم خود ربمکان و می صلی اللہ علیہ وسلم در لا اقسام بہذا البلد وبعمری در قول خود لعمرک - اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کی قسم اور لا اقسام بہذا البلد میں کہا ہے آپ کے شہر کی قسم اسی طرح لعمرک میں ارشاد آپ کی عمر کی قسم - کلام مجید کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی قسمیں اٹھا کر اس کی شان کو بلند و بالا فرمایا اور اسی شان کو اعلیٰ حضرت فاضل بریلی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں جاہلہ سخن سے آراستہ فرمایا ہے

وہ خدا نے ہے مرتبہ تھکودیا نہ کسی کو طے نہ کسی کو ملا !!
کہ کلام مجید نے کھائی شہا تھوے شہر و کلام و بقا کی قسم
(حدائق بخشش)

تمت بالخیر

وما علینا الا البلاغ

عبد الرزاق حطاروی - محتر الوی

بروز بدھ - یکم جنوری ۱۹۸۶ء
۱۹ ربیع الثانی ۱۴۰۶ھ

فهرس

١	وَلَا تَنفِرْ فِي الْأَرْضِ لِلَّذِينَ الظَّالِمِينَ	٢٦	ابتداء سخن
١٩	قُلْ بَلْ مِثْلَ آبَائِهِمْ خَبِيثًا	٢٧	خطبه
٢٠	لَا تُفَرِّقْ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ	٢٨	بِسْمِ اللَّهِ الْحَمْدُ لِلَّهِ
٢٢	فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ	٢٩	إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
٢٣	وَيَكُونُ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا	٣٠	الْحَمْدُ لِلَّهِ
٣٢	إِلَّا لِنَعْلَمَ	٣١	وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ
٣٦	وَلَمَّا اتَّبَعَتْ أَهْوَاءَهُمْ	٣٢	وَرَأَى أَنَّ رَبَّكَ
٣٩	فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ	٣٣	إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ
٥٤	وَمَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ	٣٥	وَأُولَ الرِّكْوَةِ
٥٨	فَالَّذِينَ بَشَرُوا هُنَّ	٣٦	وَأَلَى فَصَّلَتْكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ
٦٣	أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ	٣٨	وَلَا يَقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ
٦٣	فَلَا رَفَثَ	٤٢	ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعُجْلَ
٦٣	ثُمَّ أَفِضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ	٤٣	فَفَرِّقُوا كَذِبُكُمْ
٦٥	أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ	٤٤	وَلَا خَلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ
٦٦	فَأَنزَلْنَا مِنْكُمْ آيَاتٍ فَتَنْتُمْ		
٦٩	وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مِمَّا بَلَغُوا النِّكَاحَ		
٧٥	وَلَا خَلَّةَ وَلَا شَفَاعَةَ		

٤٤	فَبَيَّنْتَ الَّذِي كَفَرُوا	١٠٣	فَكُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ
٤٩	الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ	١٠٦	إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَاةِ
٤٩	أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ	١٠٧	وَأَتْلَوْهُمُ الْقُرْآنَ وَالْحِكْمَةَ
٨٠	وَأَصْطَفَاكَ عَلَى الْعَالَمِينَ	١٠٨	وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ ثَمَرِهِمْ
٨٢	نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ	١٠٩	هَلْ يَسْتَطِيعُ رَبُّكَ
٨٢	وَمَكْرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ	١١١	وَالْمَوْتِ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ
٨٥	إِنِّي مُتَوَقِّئُكَ	١١٣	وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ
٨٦	ثُمَّ جَاءَكَ رَسُولٌ	١١٥	فَتَكُونُ مِنَ الظَّالِمِينَ
٨٨	وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ	١١٤	وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ
٨٩	وَلِيَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا	١١٨	قُلْ أَتَدْعُونِ دُونَ اللَّهِ
٩٠	وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا	١٢٠	فَلَتَجِدَنَّ عَلَيْهِمُ آيَاتٍ
٩٢	أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُرِئَ	١٢٢	وَكَلَّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعَالَمِينَ
٩٢	بَعْضُ مَا كَسَبُوا	١٢٥	فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ
٩٣	وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ	١٢٦	وَإِنْ تَطِعُوا أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ
٩٣	لَا يَغْنَثُكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا	١٢٨	وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ
٩٦	إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ	١٢٩	قَدْ افْتَرَيْنَا عَلَى اللَّهِ كَذِبًا
٩٤	وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا	١٣١	سَخَرُوا أَغْيُنَ النَّاسِ
١٠٠	وَالْمُحْصَنَاتِ مِنَ النِّسَاءِ	١٣٢	وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ
١٠١	مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ	١٣٢	لَنْ كِيدَ مِنْهُ مَنٌ
١٠٢	أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ	١٣٣	وَيُكْرَهُونَ وَيَكْفُرُوا بِاللَّهِ
١٠٣	إِنَّ السُّفْهَانَ يُجِدِعُونَ اللَّهَ	١٣٣	قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي

١٣٥ وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ١٤٦
 قَتَبَطَّهُمْ ١٣٨ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِنْ دُونِ ١٨٤
 سَخَّرَ اللَّهُ مِنْهُمْ ١٣٩ يَأْخُذْ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ١٩٠
 نَسُوا اللَّهَ فَنَسِيَهُمْ ١٤٠ مُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ١٩١
 الْأَسَافُونَ ١٤١ قُلِ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ ١٩٢
 ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ ١٤٢ قَالَ رَبِّ ارْنِيْ وَهَنَ الْعَظْمُوتِ ١٩٥
 قُلِ اللَّهُ أَشْرَعُ مَكْرًا ١٤٦ فَخَرَجَ عَلَى قَوْمِهِ مِنَ الْمِحْرَابِ ١٩٤
 وَاجْعَلُوا بَيُوتَكُمْ قِبْلَةً ١٤٨ وَاتَّيْنَاهُ الْحَكَمَ صَبِيًّا ١٩٨
 وَمَا مِنْ دَابَّةٍ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ١٥٠ وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى ٢٠٠
 فَإِنَّا نَسْخَرُهُمْ مِنْكُمْ ١٥١ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ آدَمَ مَا أَوْحَى ٢٠٢
 هُوَ لَا يَرَىٰ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ ١٥٢ وَفَتَنَّاكَ فُتُونًا ٢٠٣
 إِنَّ آبَاءَ الْفِرْعَوْنِ ضَلَالٍ مُّبِينٍ ١٥٦ قَالُوا سَيعْنُقُنَا فَيَذَرُكُمْ قِلَاقِلَ ٢٠٤
 وَلَقَدْ هَمَمْتُ بِهِ وَهَمَّ بِهَا ١٥٤ لَهُ أَبْرَاهِيمَ ٢٠٢
 وَأَنَا خَيْرُ الْمُنْزِلِينَ ١٦٢ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ كَبِيرُهُمْ ٢٠٦
 كَذَلِكَ يَذْنِبُ لِيُؤْثِقَ ١٦٥ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَا هَؤُلَاءِ يَنْطِفُونَ ٢٠٤
 إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ١٦٦ أَفِي تَكْفُرُوا لِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ ٢٠٨
 حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْسَسَ الرُّسُلُ ١٦٤ وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ٢٠٩
 مِنْ حَمِيمٍ مُّسْنُونٍ ١٤٢ وَذَٰلِكَ التَّوْرُ إِذْ ذَهَبَ مُغَاضِبًا ٢١٢
 مِنْ رَّأِي السَّمُومِ ١٤٣ فَادْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا صَوَافٍ ٢١٥
 وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي ١٤٢ وَلَوْلَا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ ٢١٤
 تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا ١٤٥ لَا تَجِدُوا الْيَوْمَ ٢١٨

٢٣٨ فِي شُغْلٍ فَلْيَهْوِ ٢١٩ مُتَكَبِّرِينَ بِهَا سِيراً تَهْجُرُونَ ٢١٩
 بَلِ انْتَبِهْهُمْ بِذِكْرِهِمْ ٢٢١ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَلِمُونَ ٢٣٨
 قَرَأَ عَلَيْهِمْ ضُرَّابًا بِالْيَمِينِ ٢٢٢ وَلَا تُكْرَهُوا فَتِنَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ ٢٢٢
 وَقَدْ مَنَّا إِلَىٰ مَا عَمِلُوا ٢٢٣ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ ٢٢٦
 وَتَسْجُدُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا ٢٢٤ وَادْخُلُوا فِي رِجْعَتِكُمْ فِي عِبَادِكِ
 الصَّالِحِينَ ٢٢٨ وَلَوْلَا أَن رَّبُّنَا عَلَىٰ قُلُوبِهَا ٢٢٩
 فَبَصُرْتُ بِهِ عَنْ جُنُبٍ ٢٣٠ فَبَصُرْتُ بِهِ عَنْ جُنُبٍ ٢٣٠
 عَلَىٰ أَن تَأْجُرَنِي تَمَانِي حَجِجٍ ٢٣١ إِنَّكَ لَتَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ ٢٣١
 وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي ٢٣٣ وَأَنْ يَكُ كَذِبًا فَعَلَيْكَ كِذْبُ ٢٣٣
 مَا كُنْتُ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ ٢٣٣ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ إِلَّا وَحْيًا ٢٣٣
 قُلْ إِنْ كَانَ لِلرَّحْمَنِ وَكَدٌّ ٢٣٤ وَلَكِنَّ يَقَعُ مِنَ الْعَذَابِ لِأَدْنَىٰ ٢٣٤
 فَأَوْحَيْنَا إِلَيْكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ ٢٣٤ فَاتَّبَعْنَا أَهْلَ الْأَيْمَانِ ٢٣٩
 مَنْ يَأْتِ مِنْكُمْ بِفَاحِشَةٍ ٢٣٩ وَنَحْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَخْوَنُ ٢٣٩
 وَإِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَهِدًا ٢٣٣ لِيَجِبَالَ أَقْرَبِي مَعًا ٢٣٦
 فَلَمَّا خَرَّ ٢٣٤ عَظَمَ شَدِيدُ الْقَوَىٰ ٢٣٤

٣١١	٢٩٠	لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ	ثُمَّ دَنَى قَتْدَى
٣١٢	٢٩١	إِنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مَقَاعِدَ اللَّسْمِ	فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى
٣١٢	٢٩٩	يَا أَيُّهَا الْمُدْمِلُ	فِي آيِ الْآخِرِ رَبِّكَ تَتَنَارَى
٣١٣	٣٠٠	وَالْتَزَعْتِ أَعْرُقًا	الرَّحْمَنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ
٣١٣	٣٠١	وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ	فَأَنَّهُمُ اللَّهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ
٣١٥	٣٠٢	إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ	الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ
٣١٦	٣٠٨	لَا أَقْسِمُ بِهَذَا الْبَدْرِ	وَتَرَكُوكَ قَائِمًا
٣١٨	٣٠٩	وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَى	يَوْمَ يَكْشِفُ عَنْ سَاقٍ
٣٢٢	٣١٠	وَالْعَصْرِ	إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ